فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد پنجم شمارۂ ۱ و ۲

اظہار واقعی

ارباب بصیرت کی جوہر شناسی علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں مضمون نگار کی شخصیت یا مقام اشاعت سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ مضامین کے محاسن اور معائب کو پرکھتی ہے۔ ایسے نقادان علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مجلہ عثمانیہ نے چار سال کی قلیل مدت میں اپنی علمی خدمات سے سرمایۂ اردو میں کس قدر اضافہ کیا۔

معیاری انشا پردازی اور بلند پایہ شاعری کو قدم قدم پر نام نہاد اہل الرائے (جن کو اکثریت حاصل ہے) کی ادبی چیرہ دستیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جب صاحب فکر اور بالغ النظر ارباب علم ایسے تنگ نظر نقادوں کی زد سے نہیں بچ سکتے تو ظاہر ہے کہ طلباء کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ باوجود ان مشکلات کے اس تھوڑی سی مدت میں طلبائے جامعہ نے جدت طبع کے نمونے پیش کرکے جو ''ذوق نمو'' کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ جوہر شناس طبائع کرسکتے ہیں۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد میں سال نو کے آغاز پر اپنی ''تمنائے نو'' برادران کلیہ کے گوش گزار کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

طلبم نہایت آں کہ نہایت ندارد

اس میں شک نہیں کہ مجلۂ عثمانیہ ہندوستان کے ان معدودے چند رسائل میں شمار کیا جاسکتا ہے جو صحیح معنوں میں معیاری کہے جاسکتے ہیں لیکن اس سال ارکان ادارت کی سعی پیہم کا مقصد یہ ہوگا کہ مجلہ کو اس سے بلند تر معیار پر پہونچائیں۔ ہم اسی وقت اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں جب برادران کلیہ ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ لیکن اگر گذشتہ سال کی طرح مجلہ طلبائے جامعہ کی لاپروائی کا شکار ہوجائے تو عجب نہیں کہ موجودہ معیار بھی قائم نہ رہ سکے۔ ہمیں توقع ہے کہ برادران کلیہ ہمارے پیش رو جناب رشید سبحانی صاحب کی ہمنوائی کا موقع نہ دینگے۔ حصول مضامین میں جہاں تک

ترغیب اور کوششون کا تعلق ھے ، ھم اپنی مستقل مزاجی کا امکانی ثبوت دینگے ، لیکن مضامین نگار اگر ھماری مستقل مزاجی کی آزمائش پر تل جائین تو یہ ممکن ھے کہ وقتی کامیابی کا سہرہ آنھین کے سر رھے لیکن ھماری توقعات مین کوئی کمی نہ ھوگی ۔ ھمارے مجلہ کے معیار کو و بلند تر ، بنانے کے لئے ضرورت اس امر کی ھے کہ برادران کلیہ نہ صرف کتب خانہ سے کما حقہ مستفید ھون بلکہ اپنے شفیق اساتذہ کی رھبری مین اپنے علمی کارنامون کی تکمیل کرین ۔ ان کی علم دوستی سے ھمین توقع ھے کہ وہ ھر موقع پر اپ کی امداد کرینگے ۔ اگر خلاف امید ایسے حالات پیدا ھوجائین جن سے آپ یہ محسوس کرنے لگین کہ آپ رہنمائی سے محروم ھو رھے ھین تو آپ اس لطیف اور محبت آمیز رشتہ کے تحت جو استاد اور شاگرد کے درمیان ھوتا ھے انہین مجبور کر سکتے ھین کہ وہ آپ کی اعانت کرین

اس مین شک نہیں کہ اس ,,ترجمان علمی،، کے ذریعہ تحقیقات کے سرمایہ مین اضافہ تو ھو رھا ھے لیکن ھمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ھے کہ بہت کم ایسے موضوعات کی طرف ھمارے قلمی معاونین نے توجہ کی ھے ، جس مین جذبات نگاری اور نفسی کیفیات کی تصویر کشی کو زیادہ دخل ھے ۔ ھماری زبان مین ناول اور ڈرامہ کا جو نقدان ھے وہ نہایت افسوس ناک ھے ۔ دوسری قومین اس صنف ادب سے حیات انسانی کی تفسیر اور تہذیب وتمدن کی اصلاح کے لئے جو کام لے رھیں ھیں ون پر یہان روشنی ڈالنے کی گنجائش نہین ۔ اس کوچہ مین قدم رکھنے سے قبل برادران کلیہ کو موجودہ مسموم فضاء سے متاثر نہ ھونا چاھیے اور ان ناولون اور ڈرامون کو نمونہ نہ بنانا چاھیے جو برسات کے کیڑون کی طرح ھندوستان کی ادبی دنیا مین پھیلے ھوئے ھین ۔

ختم سخن پر ھم جناب عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ اور دیگر اراکین انتظامی کے سپاس گزار ھین کہ بغیر ان کی دلچسپی کے اس ادارہ کی تنظیم و ترتیب قائم رکھنا نہایت مشکل ھے ۔

مرتضی

افسانے

از

جناب غلام محی الدین صاحب زور ایم ۔ اے (عثمانیہ)
ڈی، فل ، پی ، ایچ ڈی، (لنڈن) مددگار پروفیسر اردو (جامعہ عثمانیہ)

(۱)

ہماری زبان میں ادب کی اس اہم اور مفید صنف کی طرف ابھی ابھی توجہ شروع کی گئی ہے ۔ اور اگر چہ دو چار اچھے فسانہ نگار پیدا ہوگئے ہیں لیکن عام طور پر اردو رسالوں میں جس قسم کے فسانے شایع ہوتے رہتے ہیں ان کا مطالعہ ایک ایسے شخص کو ضرور مایوس کر دیگا جو روسی ، فرانسیسی یا انگریزی فسانوں کا مطالعہ کر چکا ہو ۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نئے انشا پرداز اور کالجوں کے طالب علم اپنی پوری ادبی قوتوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھیں ۔

مختصر قصہ یا فسانہ میں عام طور پر صرف ایک ہی واقعہ پیش کیا جاتا ہے ۔ انگلستان کے ایک کامیاب فسانہ نگار آر ۔ ایچ ۔ ڈیویس (Davis) نے فسانہ پیدا کرنے کا ایک عجیب لیکن کارآمد نسخہ پیش کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ ”مختصر قصہ میں روز مرہ کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہونا چاہئے ۔ مثلاً اخباروں ہی کی خبروں میں سے کسی ایک پر قصہ لکھا جاسکتا ہے“ چنانچہ اس فسانہ نگار کی عادت تھی کہ روز ناموں سے خبریں لیکر ان کے اطراف تفصیل، مکالموں ، اور واقعات کو اس طرح کھڑا کرتا تھا کہ وہ خبر ایک اچھا خاصہ فسانہ بن جاتی تھی ۔

ایک اور انگریز مقبول فسانہ نگار آپن ہیم (E. P. Openheim) کا خیال ہے کہ وہ قصہ بنانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کو بننے کے لئے چھوڑ دیتا ہے ۔ جہاں کسی معمور چاء خانہ یا مجمع عام میں وہ دو تین آدمیوں کو علیحدہ دیکھ پاتا ہے تو ان پر سوچنے لگتا ہے، اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں قصہ بننا شروع ہو جاتا ہے جس کو وہ قلمبند کر لیتا ہے ۔

(۲)

آپ کہیں ہوں فسانوں کے خاکے آپ کے اطراف آپ کے سایہ کی طرح موجود رہتے ہیں۔ وہ انشاپرداز جس کو کائنات کی پامال سے پامال اشیاء میں بھی فسانے نظر آتے ہیں اگر چاہے تو پھولوں کے ایک گجرے یا پان کے ایک بیڑے (گلوری) ہی پر ایک زندہ قصہ بنا سکتا ہے۔ اس کی نظر ین ان چیزوں کو چیرتی ہوئی آگے کو نکل جاتی ہیں، اور وہ ان مردوں اور عورتوں پر سوچنے لگتا ہے جو انہیں استعمال کرتے ہیں، اور پھر ان کی امنگیں اور قاشیں یا ان کی مسرتیں اور پژمردگیاں اس کے تخیلی آئینہ پر منعکس ہونے لگتی ہیں۔

دنیا کے بعض مشہور ترین مختصر قصے صرف معمولی اور پامال واقعات یا کسی بے دھڑک فقرے یا کسی کتاب یا اخبار کے کسی جملہ پر مبنی ہیں۔ اپنے اطراف و اکناف کی چیزوں پر نظر ڈالتے وقت ہمیں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہم کس طرح ان پر قلم اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہمارے یہاں فسانوں کے خاکوں اور اجزا کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو جائے گا جس کو ہم کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طریقہ سے استعمال کر سکیں گے۔

اگر ہم شہر کے کسی روزنامہ میں یہ خبر پڑھیں کہ "ایک شخص چرائے ہوئے ہتیار فروخت کرنے کے جرم میں چالان عدالت کیا جانے والا تھا لیکن کل پولیس کی حوالت سے فرار ہو گیا"، تو کیا ہمارے ذہن میں قصہ کا ایک ایسا خاکہ نہیں بن سکتا کہ:—

ضلع کا ایک نوجوان تعلیم کے لئے شہر آتا ہے۔ توقع کے خلاف کالج سے وظیفہ نہیں ملتا۔ ضعیف بیوہ ماں کی محنت مزدوری کی کمائی تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ طالب علم ماں کو منا پر چا کر خاندانی بیکار پڑے ہوئے ہتیار فروخت کرنے کے لئے شہر لے آتا، اور انہیں سب سے بڑے و معتبر اسلح فروش کو دکھاتا ہے۔ دوکاندار مرعوب کرنے اور ہتیاروں کو کم قیمت میں خریدنے کی خاطر اس پر چوری کا الزام لگا کر ہتیار رکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک اطمینان نہ ہو لے کہ یہ واقعی تمہاری ملک ہیں نہ انہیں خرید سکتا ہوں اور نہ تمہیں واپس دے سکتا ہوں۔

طالب علم کالج کا پته دیکر واپس آتا هے اور فکرمین هےکه اپنی ملکیت ثابت کرے۔ دوسرے دن صدر کالج بلا بھیجتے هیں۔ ڈرتا هوا اجلاس پر پهنچتا هے اور جب وهاں اسلح فروش کو بھی دیکھتا هے تو سمجھ جاتا هے که چوری کا الزام ثابت هو گیا۔

اسلح فروش طالب علم کے خاندانی حالات دریافت کرتا هے۔اس کو تصدیق هو جاتی هے که یه هتیار واقعی اس کے مرحوم دادا کے هیں جو سالار جنگ اول کے زمانه میں سرکاری کام سے روانه کیا گیا تھا اور پھر لا پته هو گیا یه بھی معلوم هوتا هے که طالب علم اسلح فروش کا بھتیجا هے۔

کچھ عرصه کے بعد یه غریب طالب علم اسلح فروش کا داماد بن کرامی عالی شان دوکان کا مالك هے جس میں اس پر چوری کا الزام لگایا گیا تھا۔

اس قصه کو یوں بھی ختم کیا جا سکتا هے که۔

اسلح فروش جب مختلف ذریعوں سے طالب علم پر ظاهر کرتا هے که اسکی اکلوتی لڑکی سے شادی کرے جو هوشیار اور خوشرو هونے کے علاوه تعلیم یافته بھی تھی تو نوجوان صاف انکار کر دیتا هے کچھ تو اس کو اسلح فروش سے اوس کے ابتدائی برتاؤ کی وجه سے نفرت هو گئی تھی اور پھر هندوستان کے اکثر جدید خیال نوجوانوں کی طرح اس کا عقیده تھا که صرف شادی هی ایك ایسا معامله هے جس میں انسان کو کامل آزادی خیال اور غور و فکر سے کام لینا چاهئے۔

روزمره کے حالات و واقعات سے فسانوں کے خاکے حاصل کرنے کی ایك اور مثال یه هو سکتی هے که هم اپنے ایك دوست کی شادی میں محفل رقص و سرود کے مزے اڑا رهے هیں۔ دیکھتے هیں که ، منی جان همارے وضعدار هم جماعت حامد کے ساتھ بے تکلف هو گئی هے۔ اور ساتھ هی همارے ذهن میں ایك اچھا خاصه فسانه تیار هو جاتا هے که :—

سدی عنبر بازار کی ایک مہ لقا بارہ سال سے مالدار طبقہ کے ہر نوجوانون کے تیر عشق کا ھدف بن چکی ھے اور ھر ایک کے ساتھ کچھ دنوں عہد وفا باندہ کر اس کے مال و دولت اور عنفوان شباب کی بہار لوٹ لینے کے بعد ایسے وقت میں اس کو ٹھکرا دیا کرتی ھے جب کہ اس کی خاطر داریوں کے باعث نوجوان کی جاگیر کورٹ میں داخل ھو گئی ھو یا اس کے املاک ساھوکاروں کے یہاں رھن ھو گئے ھوں اور اس کے پاس سوائے مہ لقا کی الفت کے اور کچھ باقی نہ رھا ھو۔

حیدرآباد کے شریف قدیم اور متمول خاندان کا ایک چشم وچراغ امجد بھی آخر کار اسکے پھندے میں پھنس جاتا ھے۔ ملک کے شریف ترین اور اعلی سے اعلی خاندان اس سے اپنی لڑکی بیاہ دینے تیار ھین لیکن وہ مہ لقا کے سوا کسی کی طرف رخ نہین کرتا۔ اس اثنا مین اسکے باپ کا بھی انتقال ھو جاتا ھے اور اب امجد بغیر کسی روک ٹوک اپنی تمام دولت، عزت، اور شباب کو مہ لقا پر سے نثار کرنے کا تہیہ کرتا ھے۔ وہ اس وقت امجد کو کامل طور پر لوٹ لے سکتی ھے۔ لیکن اپنے سینہ مین ایک غیر معمولی جذبہ محسوس کرتی ھے۔ گھنٹوں اس سونچ مین رھتی ھے کہ آخر کیوں نہ دوسرے بوالہوس اور عیاش نوجوانوں کی طرح اس شکار کو بھی تباہ کر ڈالوں، لیکن نہین! اس کو ایک حیرتناک انکشاف ھوتا ھے، اس دفعہ وہ خود بھی اس شکار کی محبت مین گرفتار ھو گئی ھے، اور نہین چاھتی کہ اپنی وجہ سے امجد کو کسی طرح کا نقصان پہنچے، امجد جیسے شخص کے خود جیسی ایک کسبی کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی آسے بھلے نہین معلوم ھوتے، خیال کرتا ھے کہ اس کے ساتھ نکاح کر لے، لیکن وہ دیکھتی ھے کہ امجد ایک ایسے خاندان کی تنہا یادگار ھے جو شرافت اور اعلی کردار کے لحاظ سے یگانۂ وطن تھے اور مین ایک ایسی عورت کی اولاد ھوں جو شاید یہ بھی نہین بتا سکتی کہ میرا باپ کون تھا، امجد ایک انتہائی تعلیم یافتہ ھونے کے علاوہ اپنے اخلاق کی وجہ سے ھم عمروں مین نظیر کی طور پر پیش کیا جاتا ھے اور ملک کو آس کی ذات کے ساتھ ھزاروں امیدین وابستہ ھین، اور مین ایک ایسی پیدائشی فاحشہ ھوں کہ اگر اپنے آشناؤں کی فہرست لکھنے بیٹھوں تو اس ملک کے بیسیوں

ہرقوں اور سیکڑوں پیشوں میں سے ہر فرقے ہر پیشے میں اگر سو پچاس نہیں تو دس بیس تو ضرور نکلیں گے۔

آخر کار وہ امجد جیسے عزیز اور گراں بہا شخص کو اپنی وجہ سے تباہ کرنے کی جگہ خود ایثار کرتی ہے، اور اس کی بے انتہا دولت اور اٹھتی ہوئی جوانی کے مزے لوٹنے کی خواہشوں کو اپنی پہلی اور غالباً آخری محبت کی خاطر قربان کر دیتی ہے۔

امجد نشہ محبت میں سرشار شادی کی تیاری کر چکنے کے بعد نکاح کا دن مقرر کرنے کی درخواست کرتا ہے، اور مہ لقا صد ہزار ہمت کے ساتھ سخت دل ہو کر جواب دیتی ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔ میں ایک اور شخص پر مرتی ہوں، امجد سمجھتا ہیکہ مہ لقا کو اس کی محبت پر اعتماد نہیں، دوسری دفعہ ایک کاغذ لکھ لاتا ہے جس کی رو سے مہ لقا اس کے تمام مال و دولت اور جائداد کی مالک قرار پاتی ہے۔

مگر دھن کی پکی مہ لقا اپنے صحیح جذبات کو روکنے کی کوشش کر کے امجد کو اسطرح دھتکارتی ہے کہ میں تم سے کسی طرح شادی نہیں کر سکتی کیونکہ میں تمہیں مرد نہیں سمجھتی۔

یہ خاکے صرف اس لئے لکھے گئے ہیں کہ ان کو دیکھکر ہمارے نوجوان فسانہ نگار اندازہ کر سکیں گے کہ واقعی وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء اور روزمرہ کے واقعات ہی میں سے کسی پر دلچسپ فسانہ لکھ سکتے ہیں۔ یہ ایسی پونجی ہے جس سے ہر کس و ناکس مستفید ہو سکتا ہے، اور مجھے بڑا اطمینان حاصل ہوا جب میں نے دیکھا کہ کالج کی جماعتوں کے بعض طلبہ نے اس اشارے سے فائدہ اٹھا کر ایسے قابل تعریف فسانے بھی لکھے جن کے خاکے روزناموں کی خبروں یا کالج کی زندگی سے حاصل کئے گئے تھے۔ یقین ہے کہ اگر اس طرح مشق جاری رہے اور متعدد فسانے لکھے جائیں تو اکثر نوجوان دماغ اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے ماحول کی ہر چیز میں سے کوئی نہ کوئی فسانہ پیدا کر سکیں گے۔

(۳)

مختصر قصوں اور فسانوں کے خاکے حاصل کرنے اور انہیں پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہمارے نئے فسانہ نگار ترقی یافتہ زبانوں (خصوصاً فرانسیسی، جرمن، روسی، اور انگریزی) کے بہترین فسانوں کا گہرا اور نتیجہ خیز مطالعہ کریں، خاص کر حسب ذیل انگریزی اور فرانسیسی انشا پردازوں کے کارنامے اس ضمن میں قابل ذکر ھیں۔

انگریزی۔(۱) اڈگر ان پو، (۲) آر۔ ال۔ اسٹیونسن، (۳) رڈیارڈ کپلنگ، (۴) او۔ ھنری، (۵) اچ۔ جی۔ ویلس، (٦) لیونرڈ میرک، (۷) ڈبلیو ڈبلیو جیکبس، (۸) اف۔ برٹن آسٹن۔

فرانسیسی۔(۱) والٹیر، (۲) بالذاك، (۳) ژولا، (۴) دودے، (۵) اناطول فرانس، (٦) موپاساں۔

(۴)

اکثر نوجوان اپنی فسانہ نگاری کی ابتدا عشقیہ قصوں سے کرتے ھین۔ اور عام طور پر ان کی یہ کوشش ھوتی ھے کہ خاتمہ خیر وخوبی پر مبنی ھو۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے نہایت سادہ اور پامال طریقہ اختیار کرتے ھین۔ یعنے خراب کردار یا رجال داستان کو میدان سے بھگا دیتے ھین۔ (اکثر کسی موٹر کے حادثہ کے ذریعہ سے یا قانونی سزا سنا کر یا کوئی فوق فطری سبب پیدا کرکے) یا اپنے غریب ھیرو یا ھیروین کی قسمتوں میں ایك حیرت انگیز اور اچانك تبدیلی پیدا کر دیتے ھین۔ (گھر کے کسی مدفون خزانے کے ذریعہ سے یا بالعموم کسی قدیم وراثت کی بے انتہا مال ودولت دلا کر)۔

واقعہ یہ ھے کہ ایسا قصہ لکھنا دشوار ھے جو عام اور پامال خاکوں سے علیحدہ اور بلند وبرتر ھو۔ اسکے حصول کا صرف ایك ھی طریقہ ھے۔ ھمارے انشاپردازوں کو ھمیشہ اس امر کا خیال رکھنا چاھئیے کہ ایسے خاکوں کو ترجیح دین جن مین انسانی زندگی کا کوئی

ایسا معمولی واقعہ پیش کیا گیا ہو جو عام نظروں کے لئے ایک سربستہ راز کی حیثیت رکھتا ہو اور جس کی طرف اُس کے ساتھیوں کی توجہ شاید ہی منعطف ہو سکتی۔

ترقی یافتہ زبانوں میں آج کل روز مرہ کی زندگی کی نفسی کیفیتوں ہی پر خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے۔ اور وہاں وہی فسانہ نگار زیادہ مقبول ہو رہے ہیں جو اپنے فسانوں کے ذریعہ سے نہ صرف تھوڑی دیر کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں بلکہ خیال کے لئے کچھ غذا بھی بہم پہنچاتے ہیں۔

(۵)

مختصر قصہ کی زیادہ تر کامیابی ایک خیال اور محض ایک خیال کو واضح طریقہ سے منضبط کرنے پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر دنیا کے بہترین مختصر قصوں کا کوئی تجزیہ کرے تو معلوم ہوگا کہ ان میں انسان یا انسانوں کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یا کوئی انقلابی دور پیش کیا گیا ہے جو اپنی اپنی حد تک مکمل ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ واقعہ پہلے اتنا اہم نہیں دکھائی دیتا تھا اور نہ وہ دور فسانہ نگار کا موضوع بننے سے پہلے دراصل انقلابی سمجھا جا سکتا تھا۔

ہر قصہ انسان کے کسی خیال، جذبہ، تیور، برتاؤ یا عمل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے فسانہ نگار کو اپنے قصہ کے لئے ایک ایسا کردار منتخب کرنا چاہئے جس کی خصوصیتوں کو وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہو ورنہ اس کی تحقیق بے اثر رہے گی اور پڑھنے والے اسکو مصنوعی سمجھیں گے۔ مثلاً کالج کا ایک طالب علم اس رشک و حسد کو کبھی چبھتے ہوئے طریقے پر نہیں بیان کر سکتا جو اُسی محدود دستر خوان پر ظاہر ہو سکتا ہے جسکے اطراف ہمارے ملک کے چند اہم قومی رہبر جمع ہوں اور جہاں کچھ سنجیدگی اور کچھ ظرافت کے ساتھ ہندوستان کے متعدد فرقوں کی نسبت رائے زنی فرمائی جا رہی ہو۔ ہاں اگر کسی شخص کو اس قسم کی اہم مجلسوں کی نسبت راست معلومات ہوں تو اس کی کامیابی پر شاید ہی شبہ کیا جا سکے۔

ایك طالب علم اسی قسم کے جذبات کسی شادی کی دعوت ، طلبه کے کسی اقامت خانه کے ڈنر، یا کالج کی کسی تقریب کے عصرانه کے متعلق نہایت شگفتگی اور زنده طریقه پر ترتیب دے سکیگا۔

(۶)

فسانه نگاری شروع کرنے والوں کو سب سے پہلے یه گر سمجھ لینا چاهئے که کامیاب فسانه نگار لکھنا شروع کرنے سے پہلے اکثر پورا قصه اپنے ذهن میں دھر الیتے هیں یا سونچ لیتے هیں۔ اور مختصر سا خلاصه قلمبند کئے بغیر کبھی کام شروع نہیں کرتے۔ نوآموزوں کے لئے تو خلاصه کا قلمبند کر لینا نہایت ضروری هے۔ اس میں کوئی شك نہیں که اس کے لئے ابتدا میں صبر اور محنت کی عادت ڈالنے کی کوشش کرنی پڑےگی۔ مگر یه یاد رکھنا چاهئے که یه طریقۂ کار اختیار کئے بغیر نئے فسانه نگار اپنے قصوں مین بہت کم تناسب باقی رکھ سکتے هین۔ اس کے بغیر نه تو اشخاص قصه اپنی موزوں جگه حاصل کر سکین گے ، نه یه معلوم هو سکے گا که کہاں کہاں خیال مین تبدیلی یا اضافه کی ضرورت هے ، اور نه تو قصه هی صحیح و مناسب حالت اور موقعه پر انجام پذیر هو سکے گا۔ ساتھ هی یه همیشه یاد رکھنا چاهئے که موضوع کچھ هی کیوں نهو اس کا دلچسپ هونا لازمی هے۔ پژمردگی هر چیز کی موت هے۔

اسی سلسله میں یه بتا دینا بھی ضروری هے که فسانه نگار قصه لکھتے وقت اپنے قلمبند کئے هوئے خلاصه کی وفاداری کے ساتھ پیروی کرنے پر مجبور نہیں هے۔ اکثر دفعه ایسا هوتا هے که دوران کار مین مصنف کا قلم فطری رحجانات کے مطابق ایسے ایسے خیالات اور واقعات لکھ جاتا هے جن کا اسے ابتدا میں کبھی گمان بھی نہین هو سکتا تھا۔ کوئی تعجب نہیں اگر قلم کی یه آزادرفتاری بعض وقت ابتدائی سونچے هوئے خاکے سے بہتر قصه پیدا کر دے۔

(۷)

قصه کا خلاصه قلمبند کر لینے کے بعد اپنے مواد کو موثر ترین طریقه پر استعمال کرنے کی ترکیب پیدا کرنا کامیاب فسانه نگاری کا دوسرا گر هے۔ ادبی کارناموں کی سب سے اهم

خصوصیت ان کی خوش ترتیبی ہوا کرتی ہے۔ نئے نئے انشاپردازوں کی تحریریں اپنے مصنفوں کا فوراً پتہ دیتی ہے۔ ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا اپنے سرمایہ کو خوبی وخوش اسلوبی سے استعمال نہیں کر سکا۔ اس گر کے مد نظر فسانہ نگار کو حسب ذیل امور کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہئے:—

۱۔ آغاز

فسانہ کے آغاز کے لئے ایسے اسلوب یا واقعہ کا انتخاب کرنا چاہئے جو پڑھنے والے کو فوراً متوجہ کر لے۔ نئے فسانہ نگار متوجہ کر لینے والے آغازی جملوں سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اکثر اس ترغیب کے شکار ہو جاتے ہیں کہ ابتدا میں کوئی طویل اور دلچسپ سماں پیش کیا جائے۔ یا فلسفیانہ اخلاقی جملے نذر کئے جائیں۔ اس کے برخلاف دنیا کے ایک دو مشہور فسانہ نگاروں کے ان چند آغازی جملوں پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کامیابی کس طریقۂ کار کی قسمت میں لکھی ہے:—

موپاساں کا قصہ مالا اس طرح شروع ہوتا ہے:—

”وہ آن حسین اور دلکش لڑکیوں میں سے تھی جو گویا قسمت کی غلطی کے باعث ناموزوں طبقہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے یہاں نہ تو جہیز تھا نہ توقعات، اور نہ ہی اس کے یہاں ایسے ذریعہ تھے کہ وہ کسی دولت مند یا مشہور آدمی سے تعارف حاصل کر سکتی، قدر کراتی، منظور نظر ہوتی، یا بیوی بن سکتی۔ چنانچہ انہیں اس نے محکمہ تعلیمات کے ایک معمولی منشی کے ساتھ اپنی شادی کرنے کی اجازت دیدی۔“

او ہنری کا قصہ ہیرلڈ ڈسٹ رو کے آغازی جملے یہ ہیں:—

بینکس ناراض ہو گیا تھا۔ ایک ایسا آدمی جو تربیت، مرتبہ، اور دولت میں اس سے کم ہو گالی دے بیٹھتا۔ مگر بینکس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا تھا کہ وہ ایک بھلا مانس ہے۔

اور یہ ایسی بات تھی جو پہلے آدمی سے سرزد نہیں ہوتی۔ غرض اس کے چہرے پر صرف رنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ مداخلتوں کے وسط یعنے اولڈ پورٹ وکیل (جو بینکر کی جائداد کا ایجنٹ بھی تھا) کے براڈوے آفس میں دوڑا "میں نہیں سمجھتا"، بینکر نے کہا، "کہ کیوں میں ھمیشہ پیچ در پیچ کاغذات پر دستخط کرتا رہوں ...."

انتون چیخوف کا فسانہ "ھمسائے" اس طرح شروع ھوتا ھے:—
"پیٹر ایورشین بے حد رنجیدہ تھا۔ اس کی بہن ایک نوجوان دوشیزہ ایک شادی شدہ شخص ولاسیچ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مکان ھو یا کھیت ھر جگہ ایک طرح کا ملال اور خاص پستی اس پر طاری تھی۔ ان کو دور کرنے کے لئے اس نے اپنی منصف مزاجی اور پر خلوص اعلی خیالات سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ ھمیشہ آزاد محبت کی مدافعت کرتا تھا۔

مگر سب لاحاصل تھا۔ وہ ھر گھڑی اسی نتیجہ اور اس کے ماخذ تک پہنچتا رہا کہ اس کی بہن نے غلطی کی۔ نیز یہ کہ ولاسیچ اسکی بہن کو بھگا لے گیا۔ اور یہ خیال تکلیف دہ تھا۔"

۲۔ وسط قصہ صورت حالات یا کردار سے پڑھنے والے کو واقف کرنے اور اسکی دلچسپی حاصل کر لینے کے بعد فسانہ نگار کو اپنے خاکہ کے ارتقاء کی طرف بڑھنا ضروری ھے۔ یہاں اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ھے کہ ناظرین شبہ میں رھیں۔ یہ وہ خصوصیت ھے جو نئے اھل قلم کے قصوں میں مفقود ھوتی ھے۔ نتیجہ کے متعلق پڑھنے والے کو بے تابی کے ساتھ منتظر بنا دینا اور اس کے اس اضطراب کو آخر تک برقرار رکھنا فسانہ کی عظیم ترین کامیابی ھے۔

اگر کوئی شخص کسی کامیاب فسانہ نگار کا قصہ پڑھا ہو تو وہ دیکھے گا کہ خاکہ ایک ایسے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا جا رہا ہے جو کردار اور موضوع کے مطابق ہے اور جو آخر مین جاکر قصہ کے عمل کو فطری طریقہ پر ختم کر دیتا ہے۔ جو فسانہ نگار تجربہ کار نہین ہوتے وہ بیکار اور پامال باتون کا ذکر اور توضیح کرنے کی وجہ سے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی خاکہ قایم رکھتے ہین اور اس طرح قصہ کی خوبی ملیامیٹ ہو جاتی ہے۔

مشہور فرانسیسی فسانہ ,, مالا ،، میں (جس کے آغازی جملوں کا ترجمہ ابھی گذر چکا ہے) ڈرامائی اختصار اور ارتقائے خاکہ کی ہیں ایک قابل تعریف و تقلید مثال حاصل ہوتی ہے۔ اس قصہ میں ایک خاتون کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی ایک مالدار سہیلی کے یہاں سے کسی تقریب میں پہننے کے لئے الماس کا ایک مالا مستعار لے آتی ہے جو اتفاقاً اس کے یہاں سے کھو جاتا ہے۔ خاتون بدقت تمام ایک بہت بڑی رقم قرض لیتی ہے اور بالکل اسی وضع کا نیا مالا خرید کر اپنی سہیلی کو واپس دیتی ہے۔ اسکے بعد وہ اور اسکا میاں دونوں قرض کا بوجھ اتارنے کیلئے رات اور دن سخت محنت کرتے ہین۔ ایک عرصہ کے بعد جب تمام قرض ادا ہو جاتا ہے، خاتون اتفاقاً اپنی اسی سہیلی سے ملتی ہے اور سارا قصہ بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد فسانہ صرف اس جملہ پر ختم ہوجاتا ہے :-

آہ، میری پیاری میتھالڈ، مگر میرے الماس تو جھوٹے تھے، زیادہ سے زیادہ وہ پانچسو فرانک کے ہونگے۔

۳۔ خاتمہ

اس میں کوئی تعجب خیزبات ضرور ہونی چاہئیے۔ اس کی ایک اچھی مثال مالا مذکورہ بالا کا خاتمہ پیش کرتا ہے۔ اگر کوئی سمجھدار پڑھنے والا خاتمہ پڑھنے سے پہلے اس کو سمجھ لے تو آپ کا مختصر قصہ بالکل ناکام رہا۔ فسانہ نگار کے یہاں آخر تک کوئی

نہ کوئی غیر متوقع چیز پوشیدہ رہنی چاہئے۔ اور جہاں راز ظاہر کر دیا قصہ کو ختم کر دینا ضروری ہے۔

بعض دفعہ قصہ کو نامکمل حالت میں ختم کر کے آخر میں نقطے۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈال دینے سے اس کی دلچسپی اور فن کارانہ خوبی کمال کو پہنچ جاتی ہے۔لیکن اس کے استعمال کے لئے اعلیٰ درجہ کا ذوق اور حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کہیں کسی نے ایسے موقعہ پر فسانہ ختم کر کے نقطے ڈال دئے جہاں پڑھنے والے آخری حقیقت کی نسبت ابھی کوئی اندازہ لگانے کے قابل نہ ہوئے ہوں تو پورا قصہ ناقص رہجاتا ہے۔

۴۔ مکالمہ

اکثر نئے انشا پرداز ،، اس نے کہا ،، وغیرہ جیسے جملے کثرت سے استعمال کرتے ہیں وہ پریشان رہتے ہیں اور انہیں اپنے مکالموں میں اس قسم کے جملوں سے بچنے کی تدبیریں بن نہیں پڑتیں۔ اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ مکالمہ اس طرح مرتب کیا جائے کہ گفتگو کرنے والا ہر وقت اس کی طرف اشارہ کئے یا اس کی شخصیت واضح کئے بغیر ظاہر ہوسکے۔ جہاں تک ہوسکے اس قسم کے الفاظ یا نقرے استعمال کئے جائیں جو پڑھنے والے کو خاص خاص اسلوب اور طریقۂ اظہار معلوم کراتے ہوں۔

،، اسنے شکایت کی ،، یا ،، وہ فوراً مان گیا ،، جیسے جملے یقیناً « اسنے کہا » سے زیادہ موثر اور دلچسپ ہیں۔ اسکے علاوہ حسب ذیل مثالیں بھی اس بارے میں سبق آموز ثابت ہونگی۔

۱۔ شوکت نے اپنی کتاب میز پر دے ماری « آج سبق کیوں نہیں یاد آتا » وہ جھلایا۔

۲۔ « کیا آپ کی خاطر؟ » اس نے طنزاً پوچھا۔

۳۔ ایک حقارت آمیز مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر نمودار ہوی « بعض لوگ اپنی غلطیوں کو آخر تک محسوس نہیں کرینگے » اسکی زبان سے نکلا۔

۴۔ احمد چلا اٹھا « اور آپ خود کیا جانتے ہیں » ۔

اگر کسی کو سادہ اور فطری مکالمہ نگاری مشکل معلوم ہوتی ہو تو پہلے اردو اور دوسری زبانوں کے مشہور فسانہ نگاروں کے طریقۂ کار پر غور کرنا چاہئیے۔ اور پھر عوام کی بات چیت کو توجہ سے سننے کی عادت ڈالنی چاہئیے۔ ایک اوسط درجہ کا آدمی کبھی اپنی گفتگو میں کوئی خاص اسلوب پیدا کرنے کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ سادہ اور سیدھے طریقہ پر اپنا مطلب ادا کردیتا ھے، اپنے جملوں کو بغیر غور و خوص کے پیدا کرتا چلا جاتا ھے اور اس کی باتیں زبان کے روز مروں، محاوروں، اور انفرادی اثر سے پر ہوتی ہیں۔ لیکن اعلی درجہ کے انشا پرداز ان تمام باتوں کو بعینہ نہیں لکھ لیتے۔ انتخاب کرتے رہتے ہیں اور انہی جملوں کو لکھتے ہیں جو ان کے قصہ کے لئے موزوں ہوتے ہیں، جن کے ذریعہ سے وہ اپنے رجال کا کردار واضح کرسکتے ہیں۔

تیتری

از

جناب سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی اے ۔ (عثمانیہ)

رنگ چمن بہار کی روح طرب سے ملگیا سبزے میں جان پڑ گئی غنچہ جو تھا سو کھل گیا

ڈالیاں جھومنے لگیں وجد میں سرو باغ ہے نور کے ارتعاش سے پھول جو ہے چراغ ہے

برگ شجر میں نغمہ ریز سارا چمن ہے عطر بیز کرنوں سے سطح آب کی موجیں ہوئی ہیں تیز تیز

راگ بھی ہے نیا نیا رنگ بھی ہے جدا جدا نغمہ و رنگ کے ساتھ ساتھ بو ہے مئے دو آتشہ

ایسی بہار دیکھکر پھول کا دل مچل گیا غنچہ تڑپ کے گل بنا گل جو بنا سنبھل گیا

رنگ و نوا و بوکو اب شوق نمو کے پر لگے انکا وصال روح سے ہوتے ہی تیتری بنے

کہتے ہین جس کو تیتری جان چمن ہے پر فشاں

روح ہے شوق جستجو رنگ بہار یہ جہاں

فارسی منظوم و منثور شاھنامے

از

سید محی الدین صاحب یم ۔ اے (عثمانیہ)

(اس سے قبل شاھنامہ کے جنم بھوم والے مبسوط مضمون میں عربی تصانیف "سیر الملوک"، اور اسلامی مؤلفین کی دیگر اھم کتابوں سے جو اشاعت اسلام کے بعد ایران کی ملی داستانوں کے نشو و نما پر روشنی ڈالتی ھیں بحث کیگئی ھے اور مختصراً بتلایا گیا ھے کہ کس طرح عربی کی منظوم داستانوں اور قصوں سے فارسی میں منظوم داستانیں اور قصے پیدا ھوئے۔

اب یہاں سے فارسی منثور اور منظوم قومی داستان کا سلسلہ شروع ھوتا ھے جسے حقیقت میں فردوسی کے شاھکار کی بنیاد کہ سکتے ھیں۔ مترجم)

منظوم داستان سرائی کی طرف تو ایرانیوں کی توجہ قدیم زمانہ سے پائی جاتی ھے۔ جاحظ متوفی سنہ ۲۵۵ھ نے ساسانی سلاطین کے درباروں میں نوروز وغیرہ کے موقع پر نغموں اور لحنوں کے گائے جانے کا ذکر کیا ھے اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ایرانیوں میں اس طرب جوئی کا بیج ساسانیوں کے زمانہ ھی میں بو یا گیا تھا۔ اگر ھم اس سے بھی زیادہ پچھلے زمانہ پر نظر ڈالیں تو گاتھا کے قطعات کو بھی منظوم داستان کہ سکتے ھیں، لیکن ھمارا اصلی مقصد اسلامی دور سے بحث کرنا ھے۔

عربی رسم الخط کی اشاعت

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں زردشتی ایرانی پہلوی زبان (یعنی پہلوی رسم الخط میں ھُزوارش کے ساتھ ملی ھوئی زبان) لکھتے تھے۔ اور آج جو پہلوی کتابیں پائی جاتی ھیں اُسی زمانہ کی ھیں لیکن اکثر ایسی کتابیں اور نوشتہ جات

مذهبی هین - عربی رسم الخط جو شروع مین مسلمانون مین رائج هوا اور جو صرف عربی زبان کے لکھنے یا اسلام کے مذهبی مطالب کو فارسی مین بیان کرنے کے لئے مخصوص تھا رفته رفته غیر مذهبی مضامین مین بھی مستعمل هونےلگا - اور آن زردشتیون‌مین بھی کچھ کچھ رائج هو گیا جو مسلمانون سے میل ملاپ رکھتے تھے یا عربی زبان اور اسلامی علوم سے واقف تھے - اس طرح پهلوی خط کا استعمال جو نهایت مشکل اور بے ڈھنگا تھا موبدون اور هیر بدون کے لئے محدود هو کر مذهبی امور کے ساتھ مخصوص هو گیا -

دوسری طرف سے عربی جملے بتدریج فارسی زبان میں آنے لگے - اگرچه یه گمان هوتا هے که ان جملون کی مقدار ساسانیون کے زمانه میں فارسی زبان میں داخل هو گئی هوگی جنکا پایه تخت سامی اور ارامی اقوام کے وسط میں اور حیره کے عربون کے پڑوس میں واقع تھا جهان ایرانی و سریانی ملے هوئے تھے - لیکن عربی زبان کا نفاذ فارسی میں آس وقت زیاده هوا جب که ایرانی علما خود عربی زبان، ادب و قواعد اور اسلامی علوم کے سیکھنے کی طرف متوجه هوئے - اور حقیقت میں اسلامی علوم مثل حدیث، تفسیر، لغت، نحو، حکمت وغیره کے بڑے بڑے علما بھی ایرانی تھے - جس وقت ان علما نے عربی سے فارسی میں ترجمه شروع کیا هے، سیاق اور اسلوب کلام اس قدر عربی آمیز تھا که ان پر موجوده زمانه کے جاهل ترکی اور فرانسیسی تحت اللفظ ترجمه کرنے والون کا دھوکه هوتا هے باوجودیکه عربی عبارت مین مفردات کم هوتے لیکن ترکیب کلام میں تمام عربی جمله بندی هوتی تھی - اور عربی زبان اپنا نقش فارسی تحریر میں خوب جماتی - اور اپنے رنگ میں ڈبو دے رهی تھی -

عباسیون کا ظهور اور انکی سلطنت کا استحکام جنکا مرکز مداین کے اطراف تھا حقیقت میں ایرانیون کی ترقی کا باعث هوا - خصوصاً مامون اور خراسان کے طاهری امرا کے زمانه میں زبان اور قومی احساسات میں ترقی شروع هوئی - مرو، نیشاپور، بلخ اور طوس میں ایرانی روایات اور قدیم زمانه کے حالات کا اب بھی پته چلتا هے - خراسان و جبال (عراق عجم)

آذربائجان و طبرستان کی سیاسی اور مذهبی ترقی اور قومی انقلابات اور فرقه شعوبیه کا ظهور اور انکے کارنامے جنکی تفصیل بیان کی جائے تو ایک کتاب بن سکتی هے اس قومی بیداری کے آثار کے ظهور کی ایک واضح دلیل هے ۔

جب که هم (آقای سید حسن تقی زاده) نے کہا هے که نثر کی کتابوں اور منثور قطعات کی اطلاع تین صدی هجری سے قبل کی نهین هے اور نه صرف یہی که یه هم تك نهین پهونچے هیں بلکه ان کے هونے میں بهی هم کو شك هے ۔ کیونکه ایسی چیز کے موجود هونے کی صورت میں قدیم کتابوں میں اور خصوصاً کتاب الفهرست میں ضرور اس کا ذکر هوتا ۔ اس کے علاوه یه بات بهی که نثر سے بہت پہلے نظم وجود میں آئی هے قریب الفهم هے اور شعر (شعر عروضی) بظاهر تیسری صدی کے نصف آخر سے رائج هونے لگا ۔

اس تاریخ سے قبل کے فارسی اشعار کے نمونے یا وه اشعار جن کی اطلاع همکو هے بہت کم دستیاب هوئے هین ۔ بعض اشعار کی صرف اطلاع هے اگرچه یه خود مفقود هین اور بعض کے نمونے ملے هین ۔

پهلی قسم کے فارسی اشعار سے محمد بن البعیث بن حلیس متوفی سنه ۲۳۵ ه کے اشعار هیں جن کا طبری نے اپنی تاریخ مین (چاپ لیدن ۔ سلسله ۳ صفحه ۱۳۸۸) ان اشعار کی اطلاع دی هے ۔ چنانچه لکھتا هے ۔ ,, حکایت کرد .... مرا که در مراغه جمعی از پیران آنجا اشعار فارسی از ابن البعیث برای او خواندند ......،، ۔

دوسرے ابو الاشعث قمی کے اشعار هین ۔ معجم الادبا نے (چاپ لیدن جلد ٦ صفحه ۴۲۱) اسکی اطلاع دی هے که ابو مسلم محمد بن بحر اصفهانی (۲۵۴-۳۲۲) ان فارسی اشعار کی خصوصیت مین چند عربی ابیات کہے هین ۔

ابو الا شعث کی تاریخ حیات معلوم نہین ۔ اسی طرح مسعودی ”کتاب التنبیه والا شراف“ (چاپ لیدن صفحه ۷۴) مین رود خانه زاینده رود کے متعلق کہتا ہے که ”نهر زر نرود در اصفهان رود خانه قشنگی است من آنرا دیدم و ایرانیها در خصوص آن خیلی اشعار گفته اند“۔ اگرچه یه ضعیف احتمال هوسکتا ہے که ایرانیون کے اشعار ممکن ہے که عربی مین هون لیکن یه عادت کے خلاف ہے که عربی اشعار کا ذکر کرتے وقت آن کی نسبت ایرانیون کے ساته کرین کیونکه اس وقت ایرانی معمولی طور پر عربی مین شعر کہتے تہے اس قدر صراحت کے ساته نسبت کی ضرورت نہین تہی ۔ لیکن ہمین یه خوب یاد رکہنا چاہئے که فارسی کے اکثر و بیشتر اشعار اصطلاحی اور عروضی اشعار نہین تہے کیونکه جاحظ نے جو خود تیسری صدی کے نصف اول مین بقید حیات تہا کتاب البیان والتبین (چاپ مصر جلد اول صفحه ۱۴۵) مین عرب و عجم کی مفاخرت اور فرقه شعوبیه کے مسلك کے متعلق جو کچه لکہا ہے اس سے ظاہر ہے که ایرانیون کی منظومه چیزون کو شعر نہین کہتے تہے ۔ اور یه یونانی اشعار اور (Blank verse) کے مساوی سمجہے جاتے تہے ۔ مشار الیه کی عبارت کا فارسی ترجمه یه ہے ”...... وچیست فرق بین اشعار عرب و آن کلامی که آنرا ایرانیان و رومیان شعر مینامند“ ۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے که جاحظ کے زمانه مین اور اس سے پیشتر بہی ایرانی شعر کہتے تہے ۔ لیکن ان کا کلام عربی فن عروض کے لحاظ سے شعر کی تعریف مین داخل نہین ہوسکتا ۔

دوسری قسم ان شعار کی ہے جو اشعار ہجائی یا بقول برهان قاطع ”نثر مسجع“ کہلاتے ہیں اس قسم کے اشعار دستیاب ہوتے ہیں ۔ (آقای سید حسن تقی زاده کے ان مضامین کے شایع ہونے کے بعد سے کئی قدیم ترین اشعار کے تازه نمونے محققین کے دقیق مطالعه میں آئے ہیں جو ایك حد تك آقای موصوف کے مضمون کو پورا کرتے ہیں ۔

عالی جناب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب صدر شعبہ فارسی کلیہ جامعہ عثمانیہ با القابہ نے ایم-اے کی جماعت کے سلسلہ درس مین ادبیات ایران کے موضوع کے تحت ,,قدیم ترین شعر ایران،، پر اچھوتے اور تازہ معلومات کو سپرد قلم کروایا ھے ان مین اسلامی عہد کے شعر فارسی کے متعلق غلط روایتوں کی تردید فرما کر اصلی نمونوں کو آقایان میرزا محمد خان قزوینی و عباس اقبال آشتیانی کی تحقیقات کے مطابق پیش کیا ھے- ان کو یہان اس مضمون کی مناسبت کی وجہ درج کیا جاتا ھے-

,,قدیم ترین شعر ایران،،

پہلوی و اسلامی

تاریخ ادبیات ایران کے اھم مسایل مین سے ایک مسئلہ سب سے پہلے شاعر یا قدیم ترین شعر فارسی کا پتہ چلاتا ھے- اس کی تحقیق مین قدیم اور حالیہ تذکرہ نویس اور ناقدین نے ٹھوکرین کھائی ھین اور ان مین سے ھر ایک نے فارسی شاعری کا ایک نیا آدم یا موجد یا بانی تراشا ھے- چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی، لباب الالباب عوفی، تذکرۂ دولت شاہ، مجمع الفصحاء رضا قلیخان اور ان کے بعد کے تذکرون مین جو نئے اصول پر مبنی ھین، مثلاً (۱) ایتھ، اور (۲) پول ھارن کے مضامین ,,(۳) گرنداس ڈر ایرانشین فیلالوگے،، مین اور (۴) اڈورڈ براون کی تاریخ ادبیات ایران، اور (۵) بیبرسٹن کازمرسکی کے مقدمہ دیوان منوچہری اور شبلی نعمانی کی شعر العجم اور (۶) پروفیسر اے-وی- ولیم جاکسن کی حالیہ تصنیف (سنہ ۱۹۲۰ عیسوی) وابتدائی فارسی شاعری، اور (۷) مسٹر لیوی کی پرشین لٹریچر، اور ڈاکٹر ھادی حسن کی « (۸) اسٹڈیز ان پرشین لٹریچر» اور مولوی عابد حسن فریدی کی «مجمل تاریخ ادب فارسی» مین اسی قسم کی روایاتی معلومات درج ھین جو اکثر افسانون سے مشابہت رکھتی ھین- یہان ایسے تذکرہ نویسون کا ذکر نہین کیا گیا ھے جو ایک

---

(۱) Ethe (۲) Paul Horn (۳) Grundriss der Iranischen Philologie (۴) Lit. His. Persia by Browne (۵) Biberstein Kazimirski (۶) Prof. A. V. W. Jackson's Early Persian Poetry (۷) Levy, Persian Lit. (۸) Studies in Persian Lit.

دوسرے سے من و عن نقل کرتے اور ایک ھی راگ الاپتے چلے جاتے ھین۔ اسکے متعلق مذکورۂ بالا علماء نے جو کچھ لکھا ھے اسکا خلاصہ ایک نہایت سلیس پیرایہ میں شعرالعجم میں موجود ھے۔ پروفیسر اے۔ وی۔ ولیم جاکسن نے اپنی دلچسپ تصنیف « ابتدائی فارسی شاعری » میں اس قسم کے روایتی معلومات بہم پہنچائے ھین۔ اس کتاب کے دوسرے باب کا عنوان فارسی شاعری کا نیا جنم یا ایران مین موسیقی کی بیداری ھے۔ یہ خاصکر طاھری اور صفاری دور کی شاعری کے حالات پر مشتمل ھے۔ اسمین دوسری صدی ھجری (۸۰۰ ء) کے آخر سے تیسری صدی ھجری (۹۰۰ ء) کے آخر تک کے شعراء کا چیدہ چیدہ ذکر ھے۔ ولیم جاکسن نے پرانی روایتوں ھی کو جو فارسی شاعری کی ابتداء کے متعلق رائج تہین ایک خوبصورت لباس پہنایا ھے۔

ایران کی قدیم شاعری

اگر ایرانی اپنی قومی اور مذھبی شاعری کی ابتداء زرتشت کے زمانہ سے بتائین تو ناواجب نہ ھوگا۔ اوستا کا وہ حصہ جس کو گاتہا کہا جاتا ھے اوستا کا قدیم ترین جزو ھے اور زرتشت کی اصلی تصنیف سمجہا جاتا ھے۔ گاتہا یا سرودھاے مقدس ھندوؤں کے بہجنوں کی طرح ایک خاص مذھبی رنگ مین لکہے ھوئے ھین۔ ان میں سجع بہی پایا جاتا ھے اور یہ کئی حیثیتوں سے وید سے مشابہت رکہتے ھیں۔ اسی طرح یشت میں بہی شعریت پائی جاتی ھے اور ان کی بحر آٹہہ ھجاء (Syllable) کی معلوم ھوتی ھے۔ گو اوستا کے لکہنے والے کے مدنظر شاعری نہ تہی مگر گاہ گاہ موزون مصرع بہی نکل جایا کرتے تہے جو در حقیقت اسلام سے ایک ھزار سال قبل کی شاعری یا موسیقی کا اصلی نمونہ بن سکتے ھیں۔ اسی طرح ھخامنشیوں کے عہد میں بہی دارا (۱) خشایارشا و (۲) ارتخشتر کا پایۂ تخت اصطخر موسیقی سے گونجا کرتا تہا غالباً ”یادگار زریران،، اسی وقت کی ادبی یادگار ھے جس کا نمونہ فردوسی کے شاھنامہ میں پایا جاتا ھے۔

(۱) Xerxes. (۲) Artaxerxes.

اس لحاظ سے قدیم ایران میں دو طرح کی شاعری پائی جاتی تھی ایک تو مذھبی دوسری رزمی۔اشکانی دور میں ایران کا تمدن پس پشت ڈالدیا گیا اور بد قسمتی سے اس عہد کی کوئی ادبی یادگار ھم تک نہ پہنچ سکی۔ یاتو اشکانیوں نے کچھہ چھوڑا ھی نہیں یا اگر چھوڑا بھی تھا تو ایرانیوں نے ساسانی عہد میں وطنیت کے جوش میں اسکو تباہ و برباد کردیا۔ مگر اشکانی دورھی وہ دور ھے جس میں ساسانی پہلوی کی ابتدا ھوئی اور قومیت کا احساس پیدا ھوا۔

ساسانی دور هر حیثیت سے یہ ایران کا عظیم الشان دور ھے ، اس دور میں ، داستان سرائی کا بڑا چرچا رھا۔ نو روز اور دوسرے جشنوں کے موقع پر شاھی محفلیں نغمہ وسرود سے خوب گرم رھا کرتی تھیں۔ اکاسرہ اورخاصکر خسرو پرویز کے دربار میں موسیقی کا بول بالا تھا۔ کئی ایک مطرب ، نوا سنج ، اور موسیقی دان ساسانی دربار میں موجود رھتے تھے۔ سرکس اور باربد جیسے مغنی اسی زمانہ کے شہرۂ آفاق موسیقی نواز تھے۔ نواھاے باربد جنکی تعداد (۳۶۰) بتائی جاتی ھے بادشاھوں کے سامنے سال بھر ھر روز تازہ تازہ گائے جاتے۔ اسی طرح ”سی لحن باربد“ جو مہینہ کے ھر دن کے ساتھہ مخصوص تھے اور ”طروق الملوکیہ“ جن کی تعداد سات ھے اور ھفتہ کے سات روز کے لئے بنائے گئے تھے وہ بھی باربد کی ایجاد بتائے جاتے ھیں۔ بعض عربی اور فارسی کی پرانی کتابوں مین باربد کی نواؤں کے نام درج ھین جنکو عام طورپر نواھاء خسروانی کہا جاتا ھے اور جو نثر مسجع سے مشابہ ھین۔

پہلوی شاعری کے نمونے بد قسمتی سے ایرانیوں نے اپنے غیر مذھبی ادب کی پروانہ کی اور اسے محفوظ نہ رکھا اس وجہ سے یہ بتلانا مشکل ھے کہ ان نواؤں کی کیا نوعیت تھی۔ کس خاص وزن اور بحر مین بنائے گئے تھے اور پہلوی زبان کا عروض کیا تھا۔ اور اس زمانہ مین ایران کی شاعری کس قسم کی تھی۔ قراین سے یہ بات ثابت ھے کہ اسلام سے قبل ایران مین پہلوی شاعری ضرور موجود تھی۔ گو اس وقت ھمارے پاس اس کا کوئی مکمل نمونہ

موجود نہیں مگر چند اثار اس زمانہ کے ایسے پائے جاتے ھین جن سے ھم ایك حد تك ایران کی پہلوی شاعری کے وجود کو ثابت کر سکتے ھین مثلاً :—

(۱) ابن المقفع نے مقدمہ کلیلہ و دمنہ مین دو جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ھے کہ جس وقت برزویہ طبیب نے ھندوستان سے کلیلہ و دمنہ کی کتاب حاصل کی اس موقع پر نوشیروان عادل نے ایك جشن مقرر کیا جس مین تمام شعراء و خطباء مملکت حاضر تھے، اس نے ان کو حکم دیا کہ اس خوشی کی تقریب مین کچھ نہ کچھ کہیں -

(۲) عام طور پر بہرام گور کو فارسی کا پہلا شاعر تصور کیا جاتا ھے لیکن ازروئے تحقیق نہ تو وہ پہلا شاعر ھی تھا اور نہ وہ مشہور شعر جو اسکی طرف منسوب کیا جاتا یعنی

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ
نام من بہرام گور و کنیتم بوجبلہ

اسکا کہا ھوا ھے۔ مگر اس سے ساسانی عہد مین شاعری کا پایا جانا ثابت ھوتا ھے۔

(۳) قصر شیرین والی بیت:—

ھژبرا بگیہان انوشہ بدی جہان را بدیدار توشہ بدی (۱)

کا قصہ گو صحیح نہین ھے مگر اس زمانے مین شاعری کا وجود تو مسلم ھے۔

(۴) ادباء عرب نے اپنے کلام مین ساسانی دور کے شعراء اور انکی شاعری کی کثرت کے متعلق کئی حوالہ دئے ھین جس سے ساسانی عہد مین شاعری کا پایا جانا ثابت ھوتا ھے۔

(۵) ساسانی عہد کی موسیقی اور شاعری کے اقسام کے نام جو ھم تك پہنچے

---

(۱) فردوسی نے بھی اسکو شاھنامہ مین کانہ نقل کیا ھے۔

هین یعنی الحان مثل خسروانی، ادرامن، لاسکوئی، پہلوی یا فهلوی، اور جن مین سے بعض کو اسلام کے ابتدائی زمانے مین رواج حاصل تھا خود اس بات کی دلیل ھے کہ ساسانی عہد میں شاعری اور موسیقی دونوں ساتھ ساتھ چل رھی تھیں -

(۶) اس کے علاوہ (۱) پروفیسر اندریاس نے حاجی آباد کے شاپور اول کی تیراندازی والے میخی کتبہ کے خاتمہ کی ابیات جو ھمارے لئے محفوظ کر دی ھیں سند قطعی ھیں -

کی چیذاغی اَنْدَرِی   چیذی کِ دَستِی نیوی است

هان پاذی پَذْاینْ دَرَکی   ایونہا اذی وتیری

اَوهانْ چیذاغی ایوانتی   پَس کی تیری اَو هانْ چیذاغ

اَوکَندی اَوِی دَستِی نیو

جس کا مطلب یہ ھے۔جس شخص نے اس کی بناء مغرب کی طرف ڈالی ھے اور جس کا ھاتھ نیک ھے اس نے اس درہ میں قدم رکھا اور اس عمارت کی طرف تیر پھینکا۔ پس جس شخص نے کہ تیر اس عمارت کی جانب پھینکا ھے اس کا ھاتھ نیک ھے -

یہ بادشاہ کا کلام ھے اور یہ ابیات پہلوی زبان میں ھیں جنکی بحر هشت هجائی ھے۔

(۷) آتشکدۂ کرکو یہ کاسرود جو زرتشتیوں کے زبان پر جاری تھا اور جسکو تاریخ سیستان کے مصنف نے اپنی کتاب میں درج کیا ھے۔

فُرُخْتُ بادا روش   خُنیدہ گرشاسْپ ھوش

ھمی پرُسْتُ از جُوش   نوش کن می نوش

دُوُسْتُ بدا گُوش   بآفرین نہادہ گوش

ھمیشہ نیکی گوش   دی گذشت ودوش

شاھا خدایگانہ   بآفرین شاھی

---

(۱) Prof. F. C. Andreas

یہ ساسانی عہد کی شاعری کا ایک بیش بہا نمونہ ہے یہ تمام مصرعے ہفت ہجائی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پہلی صدی میں زرتشتیوں نے قدیم ساسانی شاعری کی وضع و ترکیب پر گھڑ لیا ہے۔ یا یہ کہ پرانے ساسانی سرود کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۸) مانی کے قدیم نوشتہ جات پارچائی جو ترکستان کے شہر طُرفان سے حال مین بر آمد ہوئے ہین بعض تو شمال مغربی اور بعض جنوب مغربی پہلوی مین لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض فقرے منظوم نظر آتے ہین اور اکثر کی بحر ہشت ہجائی ہے۔ مثلاً

آبزیر و انغ اشنو خرغ ہیم
چی آز بابیل زمیغ وِسبر بخت ہیم

یعنی مین مرد ابزیر و انغ ہوں کہ تیری مرضی کے مطابق عمل کرتا ہوں کیوں کہ مین بابل سے ہوں۔ اس نمونہ سے تو ساسانی عہد کی شاعری کا وجود قطعی طور پر ثابت ہے۔

پہلوی شاعری کے وجود کے متعلق بحث

عصر ساسانی مین شاعری کے وجود کی تردید جو کی گئی ہے تو غالباً اس بناء پر ہے کہ وہ متداول عربی شاعری کی صورت مین نہیں تھی یعنی مسلمانوں اور عربوں کے نزدیک اس قسم کی نثر مسجع یا ہجائی بحریں وزن عروضی پر نہیں اترتی تھیں اس وجہ سے انھوں نے قطعاً ساسانی شاعری کے وجود سے ھی انکار کر دیا حالانکہ جو نمونے ہم نے پیش کئے ہین وہ اس بات کی قطعی دلیل ہین کہ ایک قسم کی شاعری ایران مین ساسانی عہد مین ضرور موجود تھی جس میں قافیہ اور وزن (بمفہوم موجودہ) نہین پائے جاتے

تھے مگر ان کی بحر ضرور ہوا کرتی تھی جو ہشت ، ہشت اور یازدہ ہجا کی صورت مین ظاہر ہوا کرتی تھی -

اسلامی فارسی شاعری کی ابتدا

ایران مین اسلام کے شایع ہونے اور عربی زبان کے رائج ہونے کی وجہ سے اسلامی فارسی یا جدید فارسی کی ترکیب و تشکیل مین دو یا تین سو سال کی دیر ہو گئی یعنی پہلوی کے عوض فارسی زبان ایران مین دوسری اور تیسری صدی ہجری مین رواج پائی - اس اثنا مین عربی ہی کو فروغ رہا - بڑے بڑے محدث ، مفسر ، ادیب ، مورخ ، شاعر اور عالم ایران کی سر زمین سے اٹھتے تھے اور عربی علم و ادب اور حکمت و فلسفہ کو روز بروز مالا مال کرتے جاتے تھے جب تک کہ ایرانی نژاد خاندانوں کا ایران پر تسلط نہین ہوا اس وقت تک فارسی کی ایک پیش نہین گئی - عربی و پہلوی کی آمیزش سے روز بروز نئے لغات کا اضافہ ہوتا گیا یہان تک کہ شعراء نے اس مین شعر کہے ادیبون اور عالمون نے اپنے مطالب کی باتین اس زبان مین لکھین - اسلامی فارسی شاعری کی ابتدا حقیقی طور پر کس شاعر سے ہوئی اور اس کی نوعیت کیا تھی یہ بتانا بہت دشوار ہے - ہم سب سے پہلے ان تمام روایتون کی تردید کرینگے جو فارسی شاعری کی ابتداء کے متعلق مشہور ہو گئی ہین پھر حاصل شدہ نمونون مین سب سے پہلا فارسی شعر کیا ہو سکتا ہے اور وہ کس شاعر کا ہے بیان کرینگے -

پہلے فارسی شاعر کے افسانے

روایت اول بہرام گور

سب سے مشہور روایت بہرام گور کے پہلے فارسی شاعر ہونکی ہے -

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ ۔ نام من بہرام گور و کنیتم بوجبلہ

جن قدیم عربی اور فارسی کتابون مین بہرام گور کا ذکر آیا ہے وہان اس شعر کی مختلف قرأتین موجود ہین پہلے مصرعہ کے الفاظ مین اکثر ردو بدل پایا جاتا ہے -

اس شعر کی ابتدائی صورت یہ ھے :—

منم شیر شلنبہ   و منم ببر تلہ

جو در حقیقت ھفت ھجائی دو ٹکڑے ھیں۔ قطع نظر اس اختلاف قرآت کے تاریخی اور عروضی تحقیق کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ھے کہ یہ شعر قطعاً بہرام گور کا نہیں ھوسکتا۔ بہرام گور نے سنہ ۴۲۰ء سے سنہ ۴۳۸ء تک سلطنت کی اسوقت غالباً عربی شاعری بالکل اپنی ابتدائی حالت میں ھوگی پھر فارسی شاعری کا وجود کیا معنی رکھتا ھے اور وہ فارسی شاعری جو عربی عروض کے قواعد پر بالکلیہ مبنی ھو۔ یعنی جس میں وزن اور قافیہ ھو اور جو عربی بحروں کی پابندی میں لکھی گئی ھو۔ جیسا کہ شعر ما بہ البحث واقع ھوا ھے —

مانا کہ بہرام گور نے لخمئین حیرہ کے ھاں عربوں میں تربیت پائی۔ مگر اسوقت جب کہ عربی شاعری منظم و مدون صورت میں نہ تھی تو بہرام گور کا عربی میں شعر کہنا اور طرفہ تماشا یہ کہ مروجہ اسلامی فارسی میں شعر کہنا کسطرح ممکن ھے۔ جاحظ نے کتاب الحیوان میں عربی کے سب سے پرانے شعر کی تاریخ اسلام سے ڈیڑھ سو سال پیشتر بتلائی ھے۔ ممکن ھے کہ اسلام سے دوسو یا تین سو سال پیشتر عربی شاعری کی ابتدا ھوگئی ھو مگر کسی طرح اسلام سے دوسو سال قبل بہرام گور کا اسلامی فارسی میں شعر کہنا قرین قیاس نہیں —

روایت دوم
عباس مروزی

دوسری عامیانہ روایت میں عباس مروزی کو فارسی شاعری کا آدم قرار دیا گیا ھے۔ اور وہ قصیدہ جس کا مطلع ذیل میں درج کیا جاتا ھے سند میں پیش کیا جاتا ھے —

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین   گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

مرخلافت را تو شایستہ چومردم دیدہ را   دین یزداں را تو بایستہ چورخ را ھردوعین

اسی قصیدہ میں کہتا ہے :—

کس براین منوال پیش از من چنیں شعری نگفت　　مر زبان پارسی را هست تا این نوع بین

لیک ازان گفتم من این مدحت ترا تا این لغت　　گیرد از حمد و ثنائے حضرت توزیب وزین

عوفی اوردیگر تذکرہ نویس جن میں اکثر مستشرقین بھی شامل ھیں بیان کرتے ھیں که عباس مروزی نے اس قصیدہ کو خلیفه مامون الرشید کی خدمت مین اسوقت پیش کیا تھا جبکه خلیفه مرو مین وارد ھوا تھا۔ تاریخ سے قطعی طور پر ھمین معلوم ھے که مامون جمادی الاول سنه ۱۹۳ھ مین مرو مین داخل ھوا اور سنه ۱۹۸ھ تك وھین مقیم رھا (یعنی جبکه طاھر ذوالیمنین نے امین کو قتل کیا اور لوگون نے مامون سے بیعت کی) خلیفه ھارون الرشید کی زندگی مین عام طور پر لوگ امین و مامون کو امام کہا کرتے تھے اور خلیفه کے لقب سے کبھی یاد نہین کرتے تھے۔ اس قصیدہ کی تحریر کی تاریخین جو عام طور پر بیان کی جاتی ھین وہ سنه ۱۷۰ھ و سنه ۱۹۳ھ ھین۔ آخری تاریخ عوفی کے تذکرہ لباب الالباب میں صراحتاً مذکور ھے۔ مگر دیکھنا یه ھے که اس قصیدہ مین مامون کو بطور خلیفه کے مخاطب کیا جارھا ھے۔ اور در حقیقت سنه ۱۹۳ھ مین خلیفه ھارون الرشید کا انتقال ھوا اور امین کی خلافت شروع ھوئی۔ مامون نے سنه ۱۹۸ھ مین خلافت شروع کی۔ اس لحاظ سے اگر یه شعر کہا بھی گیا ھے تو سنه ۱۹۸ھ اور سنه ۲۰۲ھ کے درمیان کہا گیا ھوگا جبکه مامون کو عوام نے به حیثیت خلیفه کے تسلیم کیا۔ ان اشعار کے جعلی ھونے مین کوئی شبه باقی نہین رھتا کیونکه اثناء قصیدہ مین شاعر یه کہتا ھے که ابتك کسی نے اس رنگ کا قصیدہ فارسی مین نہین لکھا۔ ان اشعار کو خاصکر اولیت و اقدمیت ثابت کرنے کے لئے تیار کیا گیا ھے۔

تیسرا اھم نکته اشعار کی ساخت، دروبست، قافیه بندی اور وزن عروضی ھے۔ جب یه اشعار سنه ۱۹۳ھ میں لکھے گئے ھیں تو ان کی مماثات اور دوسرے کلام سے

ہونی چاہئے جو اسی زمانہ کی پیداوار ہو۔ یعنی اسلوب مین قدامت اور دوسری صدی کی خوبو پائی جائے۔ اس لحاظ سے یہ نمونہ تیسری چوتھی صدی کے کلام کا بھی نہین ہے بلکہ پانچوین اور چھٹی صدی کے کلام سے مشابہت رکھتا ہے جبکہ فارسی شاعری مکمل ہو چکی تھی اور نامور شعرا نے قصیدہ گوئی اپنا پیشہ قرار دے لیا تھا اور خاقانی وغیرہ کا رنگ جم چکا تھا۔ ان اشعار مین رودکی، یا حنظلہ باد غیس یا ابو المؤید بلخی تک کا رنگ نظر نہین آتا تو پھر یہ کیسے دوسری صدی کا کلام ہو سکتا ہے۔ ان کے جعلی ہونے کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ واضع عروض عربی خلیل بن احمد نحوی نے سنہ ۱۷۰ھ مین انتقال کیا تو کیا اٹھارہ سال مین ایرانیون نے عربی عروض کو اپنا بنا لیا۔ اور اس مین ترمیم و تبدیل، حذف و اضافہ شروع کردیا؟ ان کی بحر رمل مثمن مقصور (ومحذوف) ہے عربون کے ہان رمل مسدس ہے۔ ایرانیون نے اس کو مثمن کیا اور اس مین مختلف زحافات استعمال کئے ہین۔ اس عروض کی ترمیم کا سلسلہ تقریباً ایک صدی تک جاری رہا تب کہین ایرانیون نے اپنی طبیعت کے موافق بحرین بنائین اور ان میں شعر کہنے لگے۔ اس مدت سے قبل ان اشعار کا پایا جانا محال ہے۔

ایک اور طرح سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ یہ اشعار ہرگز دوسری صدی کے نہین ہین اس واقعہ کو سب سے پہلے عوفی نے لباب الالباب (سنہ ۶۱۵) مین درج کیا ہے دیگر قدیم تذکرون مین کہیں اسکا پتہ نہین چلتا۔ مگر چار سو سال تک تمام تذکرہ نویسون یا عروضیون کا خاموش رہنا اور پہلے شاعر کے پہلے قصیدہ کا ذکر نہ کرنا کسی طرح بھی سمجھ مین نہین آتا۔ دوسری اور تیسری صدی مین فارسی زبان مین عربی کے لغات اسقدر ہرگز داخل نہین ہوئے تھے۔ فردوسی کی زبان کا مطالعہ کرین تو معلوم ہوجائیگا کہ اس وقت تک عربی نے فارسی پر اسقدر تسلط حاصل نہین کیا تھا۔ اس قصیدہ مین تو اکثر الفاظ عربی پائے جاتے ہین اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے قصداً اپنے کلام کو بلند پایہ کرنیکی کوشش کی ہے جو کسی طرح بھی پانچوین یا چھٹی

صدی کے کلام سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ دوسری تیسری صدی کے نمونے جو ہم آئندہ پیش کرینگے اور جنمین سادگی اور فارسیت غالب۔ ان سے یہ فرق واضح ہو جائیگا۔

تیسری روایت ابو حفص حکیم بن احوص سغدی سمرقندی

بعضوں نے ابو حفص کو قدیم ترین شاعر قرار دیا ہے اور اس بیت کو اس کی جانب منسوب کیا ہے۔

آھوی کوھی در دشت چگونه دودا   یار ندارد بے یار چگونه رودا

شمس قیس اپنی مشہور کتاب المعجم فی معائیر اشعار عجم میں فارابی کے توسط سے یہ بیان کرتا ہے کہ ابو حفص حکیم تقریباً سنہ ۳۰۰ھ تک زندہ رہا ہے۔ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس شعر کو کسی طرح قدیم ترین شعر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خود رودکی متوفی سنہ ۳۲۹ھ اس وقت زندہ تھا اور اس سے قبل کئی ایک شاعر گذرچکے تھے حنظلہ بادغیس کے متعلق نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں یہ بیان کیا ہے کہ احمد بن عبداللہ الخجستانی کی امارت کا سبب حنظلہ کی ایک رباعی ہے۔ احمد خجستانی سنہ ۲۶۸ھ میں مارا گیا تو پھر ابو حفص حکیم کو کس طرح قدیم ترین شاعر قرار دیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ طاھری و صفاری دور کے کئی ایک شاعر اس سے پیشتر گذر چکے ھیں۔

بعض اور روایتیں پسر یعقوب بن لیث صفار

یعقوب بن لیث صفار کا بیٹا ایک روز جوزوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ باپ بھی کچھ دیر تک بیٹے کے کھیل کا تماشا دیکھتا رہا۔ بیٹے نے سات جوز اغل میں ڈال دئے آٹھواں اچٹ گیا مگر حسن اتفاق سے لوٹ کر پھر اغل میں آپڑا۔ اس پر یعقوب کے بیٹے نے خوشی کے عالم میں ایک شعر کہا جس کا ایک مصرعہ ہم تک پہنچا ہے۔

غلطان غلطان ہمی رود تالب کو۔

امیر کو یہ کلام بہت پسند آیا اس نے اپنے ندما۔ اور وزراء سے کہا کہ یہ شعر تو خوب معلوم ہوتا ہے اس پر ابو دلف عجلی (متوفی سنہ ۲۲۵ ھ یا سنہ ۲۲۶ ھ) اور ابن الکعب ملکر اسکی تحقیق و تقطیع مین مشغول ہوئے۔ یہان تک کہ انہون نے اسکو ہزج کا ایک مصرع پایا اور اس پر دوسرا مصرع ہم وزن لگایا اور پھر اور ایک شعر کا اس پر اضافہ کیا گیا اور اس کا نام دو بیتی اور بعد مین رباعی رکھا گیا۔ طرز بیان سے اس قصہ کے من گھڑت ہونے کا فوراً پتہ چلتا ہے اور اس کی تردید کی چندان ضرورت باقی نہین رہتی۔ ہم آگے چل کر صفاری دور کی شاعری کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرینگے یہان صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ یعقوب بن لیث صفاری نے صالح بن نضر کو قید کیا اور رتبیل بادشاہ کابل کو شکست دی اور عمار خارجی کو قتل کرنے کے بعد سنہ ۲۵۳ھ مین ہرات کا رخ کیا۔ طاہرین کے آخری حکمران امیر محمد کو مغلوب کرکے امارت قائم کی۔ اسی وقت سے گویا اسکی حکمرانی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اگر یعقوب کی زندگی کے اوایل پر نظر ڈالین تو فوراً معلوم ہوجائیگا کہ یہ مصرع جعلی ہے۔ ابن الاثیر نے سنہ ۲۳۷ھ کے واقعات مین یعقوب بن لیث کے معاملہ کی ابتدا بیان کی ہے۔ قطع نظر اسکے ابو دلف عجلی کے انتقال کے وقت یعنی سنہ ۲۲۵ھ یا سنہ ۲۲۶ھ مین طاہریون کے عروج کا زمانہ تھا اور طاہر بن عبداللہ بن طاہر ذوالیمینین خراسان کا حاکم تھا۔ جہان کہین ابو دلف کا ذکر آیا ہے وہان صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طاہری دور کے نامور شخصون مین سے تھا۔ اسکو کبھی بھی صفاریون سے واسطہ نہین پڑا۔ پڑتا تو کس طرح؟ ابو دلف کے انتقال کے وقت شاید یعقوب بن لیث بانی خاندان صفاریان کا نام بھی کوئی نہین جانتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ڈکیتی کرتا پھرتا ہو یا زیادہ سے زیادہ درہم بن نضر بن صالح کی فوج مین شریک ہوگیا ہو۔ ان حالات کے مدنظر یعقوب بن لیث کا وزیرون کو جمع کرنا اور ان کے حکم سے ابو دلف عجلی اور ابن الکعب کا اس مصرع کی تقطیع مین مشغول ہونا قطعاً بےبنیاد اور واہی تباہی باتین ہین۔

فارسی شاعری کے قدیم ترین نمونے

عام تذکروں میں اس کے متعلق جو بے سرو پا روایتیں مذکور ھیں ان کی تردید تو اوپر ھو چکی ھے اب ہم یہاں چند قدیم ترین نمونوں کا ذکر کرینگے جن کو محققین وقت نے بڑی جانفشانی سے جاحظ متوفی سنہ ۲۵۵ ھ، ابن قتیبہ متوفی سنہ ۲۷۰ ھ اور طبری صاحب تاریخ کبیر متوفی سنہ ۳۰۰ ھ اور ابو الفرج اصفہانی صاحب اغانی متوفی سنہ ۳۵۶ کے تصنیفات کے دقیق مطالعہ کے بعد پیدا کئے ھیں اور علمی دنیا پر احسان کیا ھے۔ ان محققین میں سے دو یہاں قابل ذکر ھیں ایک آقا مرزا محمد قزوینی دوسرے آقا عباس اقبال آشتیانی۔ ان دونوں عالموں نے اپنے وسیع مطالعہ سے فارسی شعر کے قدیم سے قدیم نمونے پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان سے ارباب علم کو روشناس کرایا۔

پہلے دو نمونے اموی عہد کے ھیں ایک سنہ ۶۰ ھ کے قریب کا ھے جو یزید بن معاویہ کی خلافت میں واقع ھوا ھے۔ دوسرا سنہ ۱۰۸ ھ کا واقعہ ھے جو ھشام بن عبد الملک کی خلافت میں ظہور پذیر ھوا غالباً ان ھی دو ٹکڑوں کو ہم خلیل بن احمد کے عروض کے رائج ھونیسے پیشتر یا پہلوی و فارسی شاعری کا اصلی نمونہ تصور کر سکتے ھیں۔ ان کی صورت کوئی مدون شاعری کے طور پر واقع نہیں ھوتی صرف ایسے ٹکڑے ھیں جو بیساختہ صادر ھوئے ھیں۔ اور نہ یہ اسلامی عروض پر کسی طرح اتر سکتے ھیں ان کی مثال موجودہ زمانہ کی تصنیف (Ballad) کی سی ھے۔

تیسرا نمونہ قرن زرین کی پیداوار ھے اور برمکیوں کے خاندان سے متعلق ھے اور اس کا وقوع سنہ ۱۸۷ ھ میں ھوا ھے۔ اتفاقاً یہ تین ایسے بیش بہا نمونے برآمد ھوئے ھیں جن کی صداقت کا پورا ثبوت تاریخ دیتی ھے۔

چوتھا نمونہ سنہ ۲۵۳ ھ کا ھے اور یعقوب بن لیث صفاری کی ذات سے وابستہ ھے۔ درحقیقت یہ متداول فارسی شاعری کا نوبادہ کہلانے کا مستحق ھے۔

یزید بن مفرغ

عبّاد بن زیاد، عبد اللہ بن زیاد کا بھائی یزید بن معاویہ کے عہد میں (سنہ ۶۰ھ سنہ ۶۴ھ) سبستان کا حاکم مقرر ہوا۔ سبستان کی روانگی کے وقت یزید بن مفرغ ایک شاعر اس کے ہمراہ تھا عبید اللہ اپنے بھائی کی طرز سے واقف تھا اور شاعر کی طبیعت کو بھی خوب سمجھتا تھا اس لئے اس نے پیش بینی کے طور پر شاعر سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر اپنے بھائی عباد کی کوئی حرکت اس کے ناپسند ہو تو اس کی هجو بر ملا نہ کرے بلکہ خود کو اس سے بر وقت مطلع کرے تاکہ اس کا فوری انسداد ہو سکے۔ عباد اپنے کاروبار اور سیاسی امور کی وجہ سے یزید بن مفرغ کی خاطر خواہ دلجوئی نہ کر سکا اس لئے شاعر اس سے بیزار آ گیا اور خلاف معاہدہ جا بیجا حملے شروع کر دئے اور عباد کے خاندان پر لعن طعن کی۔ عباد کے انتقام کی رگ جوش میں آئی اور اس نے موقع پا کر شاعر کے خلاف قرض طلبی کا مقدمہ دائر کر دیا اور نادار ی کے جرم میں اس کو قید کر دیا اور اس کا مال و اسباب اٹھا دیا اور لونڈی غلام بکوا ڈالے اور اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ جب یزید بن مفرغ نے قید سے رہائی پائی تو یہ بصرہ کو بھاگ گیا اور وہاں سے شام کا رخ کیا جن شہروں سے اس کا گذر ہوا وہاں اس نے آل زیاد کی سخت هجو کی اور اس خاندان کے حالات پوست کندہ بیان کئے۔ عبید اللہ بن زیاد نے بڑی کوشش کے بعد ابن مفرغ کو دوبارہ گرفتار کیا اور بصرہ میں مقید کر کے خلیفہ وقت یزید بن معاویہ سے اس کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ سیاسی مصالح کے مد نظر یزید نے قتل کی اجازت تو نہیں دی مگر اشارہ کر دیا کہ جس طرح چاہے شاعر کو رسوا کرے۔ ابن مفرغ کے قبیلہ کے اکثر افراد یزید کی نوج میں مامور تھے اور اسکو ان کا ڈر لگا ہوا تھا ایسا نہ ہو کہ یہ عبید اللہ کو مار ڈالیں اور ملک میں بدامنی پھیلا دیں۔

عبید اللہ بن زیاد نے شاعر کی آبرو ریزی کا ایک نرالا طریقہ سونچا نبیذ میں بھنگ ملا کر شاعر کو پلوایا جب اسکے سر پر نشہ کا بھوت سوار ہوا تو اس کو ایک بلی ایک سور اور ایک کتے کے ساتھ ایک رسی مین باندہ کر بصرہ کی تمام گلی کوچون مین پھروایا۔ بازار مین لونڈون نے اس کا

تماشا بنالیا اور فارسی میں چلانے لگے ,,این چیست - این چیست،، شاعر نے بھی فارسی میں
اس طرح جواب دیا :—

آب است نبیذ است

عصارات زبیبست

سمیه روسپید است

(سمیه زیاد کی ماں کا نام ہے جو ایام جاهلیه میں ایك بدکار عورت تھی اس کی جانب اشاره
کرنا گویا آل زیاد کے خاندان کا کچا چٹھا کھولنا ہے) جب ابن مفرغ کی حالت خراب ہو گئی
تو ابن زیاد کو اس کے مرجانے کا اندیشه ہوا اور اس نے پھر شاعر کو اپنے بھائی کے ہاں
سیستان روانه کر دیا - یہاں تك که یمن کے قبائل کے سردار اس کے انتقام پر آماده ہو گئے اور
یزید سے سفارش کر کے اس کو عباد کے پنجے سے چھڑایا -

یه تین فقرے جو سنه ۶۰ ھ کے قریب کی یادگار ہیں عربی اوزان سے بالکل
معرا ہیں اوراسلام کے بعد کی هشت ہجائی کا بہترین نمونه ہے بلکه یه کہنا چاہئے که موجوده زمانه
میں بھی یه ٹکڑے فارسی شاعری کے قدیم ترین نمونے ہیں - ابن مفرغ کا یه بے ساخته کلام
اس بات کی کامل دلیل ہے که اس زمانه میں اس قسم کی ساده ٹوٹی پھوٹی فارسی بول چال میں
رائج ہو چکی تھی -

اسد بن عبد الله القسری الختلانی کی ہجو

تاریخ طبری میں سنه ۱۰۸ ھ کے واقعات کے ضمن میں
لکھا ہے که اس سال ابومنذر اسد بن عبد الله القسری نے
ختلان میں خاقان ترك سے جنگ کی - خاقان نے اس کو
فاش شکست دی عبد الله بد حواسی کے عالم میں ختلان سے بھاگ کر بلخ پہنچا - خراسانیوں
نے اس کی خوب گت بنائی اور اس پر شعر کہے - بچے گلی کوچوں میں اس کی ہجو گاتے
پھرتے تھے -

از ختلان آمدیه   به رو تباه آمدیه

ابار باز آمدیه   خشك نزار آمدیه

اگرچہ ان ابیات کو اصطلاحی معنوں میں شعر تصور نہ کیا جائے مگر یہ ٹکڑے اس زمانہ کی عامیانہ زبان کا حقیقی نمونہ ہیں اور عربی عروض سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہین۔ ارتھر کرسٹنسن نے ان کو ہشت ہجائی قرار دیا ہے۔ گویا یہ جلد معدوم ہونے والی پہلوی کی آخری میراث ہیں۔

بہر حال یہ دونوں نمونے عربی عروض کے فارسی میں رائج ہونے سے بہت پہلے کے لکھے ہوئے ہیں اور موجودہ زمانہ مین بھی اسلام کے بعد کی ابتدائی فارسی شاعری کے قدیم ترین نمونے قرار دئے جاسکتے ہین۔

قرن زرین کا نمونہ

اس عبوری دور کا حال بہت کم ملتا ہے اور خصوصاً شاعری کے نمونے تو بالکل نایاب ہین۔ آقای سید حسن تقی زادہ حال وزیر مختار ایران در لندن نے کچھ نمونے تیار کئے تھے آن مین سے ایک کی نسبت آقای مرزا عباس اقبال آشتیانی نے رسالۂ علم و ہنر بابتہ ماہ اگسٹ سنہ ۱۹۲۰ع مین ایک مبسوط مضمون لکھا ہے۔ یہان پر ہم ان کی تحقیقات کو مختصر طور پر بیان کرتے ہین:—

"ابو الینبغی العباس ابن طرخان قدیم فارسی شاعروں مین سے ایک شاعر گذرا ہے جس کے متعلق تاریخ الوزرا والکتّاب جہشیاری میں یہ لکھا ہے کہ ابو القاسم ابن المعتمر الزہری کا بیان ہے کہ ایک دن مین یحییٰ ابن خالد برمکی اور اس کے دونوں بیٹوں فضل و جعفر کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہا تھا کہ اتنے میں ابو الینبغی بن طرفان دکھائی دیا جو راستہ پر کھڑا ہوا تھا اس نے مجھے اپنے پاس بلایا جب مین اس کے نزدیک پہنچا تو اسنے یہ شعر سنایا:—

صحبت البرامکہ عشرا ولا   و بیتی کراء و خبزی شراء

یعنی دس سال مین نے برامکہ کی صحبت مین بسر کئے اب تک کرایہ کا گھر اور بازار کی روٹی مجھسے نہین چھوٹی۔

یحییٰ نے یه بات سنی اور جعفر و فضل سے مخاطب ہو کر اسے ابو الینبغی کی بیوقوف پر محمول کیا۔ جب دوبارہ میری اور ابو الینبغی کی ملاقات ہوئی تو مین نے آس سے کہا کہ کل تو نے کیا حماقت کی اور خواہ مخواہ اپنی جان خطرہ مین ڈال لی۔ ابو الینبغی نے کہا کہ جب میں گھر پہونچا تو جعفر و فضل کی طرف سے ایك ایك سونے کی تھیلی اور ایك مکان مجھے سرفراز ہوا اور یہ بھی سرفرازی ہوئی که یحییٰ کے باورچیخانه سے میری غذا مجھے گھر بیٹھے پہنچ جایا کرے۔

اس حکایت سے صاف یہ پتہ چلتا ھے که ابو الینبغی کا زمانه برامکه کے زوال سے پیشتر یعنی سنه ۱۸۷ ھ سے کچه پہلے کا ھے۔ اور جب دس سال تك اسنے برامکه کی صحبت اٹھائی تو لازماً خلیفه ھارون الرشید کی خلافت کے پہلے دورہ سنه ۱۷۰ ھ تا سنه ۱۹۳ ھ مین زندہ رہا ہوگا۔ ابو الینبغی کنیت بھی عجیب طرح کی واقع ہوئی ھے۔ سب سے پہلے اسپر دخو (Degojh) کی نظر پڑی اور اسنے یہ خیال کر کے که یه کتاب کی غلطی ھے اسکو صحیح کرنیکی کوشش کی چنانچه ،، کتاب المسالك و الممالك ،، تالیف عبد الله ابن خرداذبه کے مطبوعه نسخه مین اس لفظ کی قرآت ابو التقی بجائے ابو الینبغی قرار دی ھے حالانکه دو تین مقامات پر عبارت مین صاف ابو الینبغی لکھا ھے۔ یه معلوم نہین شاعر نے کس مناسبت سے یه کنیت اختیار کی۔ عربوں کی کنیت کی ترکیب ایسے مہمل طریقه پر نہین ہوا کرتی تھی یعنی فعل مضارع پر الف لام داخل کر کے ابو کا اضافه کرین۔ ہر حالت مین یه مضحکه خیز ھے۔ بہر حال جب تك اسکی صحیح وجه معلوم نه ہو ہمین اس غلط کنیت ھی کو تسلیم کرنا پڑیگا۔ طرفان کا لفظ اس بات کا اشارہ کرتا ھے که شاعر سمرقندی الاصل ھے کیونکه طرفان یا طرفون عام طور پر سمرقند کے بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا جو اسلام کے قبل وھان کے حکمران تھے اور جب سنه ۹۱ ھ مین اسلام وھان پہنچا تو یه لوگ قتیبه ابن مسلم فاتح اسلام کے باجگزار بن گئے۔

اس شاعر کے کلام کے صرف ایك جزو کا پته قدیم جغرافی اور تاریخی کتابوں میں ملتا ھے جو سمرقند سے متعلق ھے اور جسکا مطلب بھی واضح نہیں۔

سمر قند کند مند　　بزینت کی افگند

از شاش نه بهی　　همی شه نه جهی

بہر حال یہ تیسرا ٹکڑا ہے جو اس عبوری دور سے متعلق ہے جس میں کسی قسم کی عربی آمیزش نہیں اور نہ یہ کسی عربی وزن و قافیہ و بحر کے تحت آسکتا ہے۔"

محمد بن وصیف سیستانی

تاریخ ادبیات ایران کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ تذکروں، بیاضوں اور سفینوں میں مختلف شعرا کو فارسی شاعری کا ابوالآبا قرار دیا گیا ہے اور حقیقی قدیم ترین شاعر کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ یہ قدیم ترین شاعر محمد بن وصیف سیستانی ہے جو یعقوب بن لیث کا منشی اور درباری نامہ نگار ہونیکے علاوہ بلند پایہ شاعر گذرا ہے۔ اس کا ذکر صرف تاریخ سیستان میں آیا ہے۔ تاریخ سیستان بھی ایک ایسی گمنام کتاب ہے کہ جسکے مصنف کا نام اور حال اسوقت تک کسی کو معلوم نہیں۔ بہر حال تاریخ سیستان میں محمد بن وصیف کے متعلق یہ حالات درج ہیں۔

سنہ ۲۵۳ ھ میں جس وقت یعقوب بن لیث صفاری نے صالح بن نضر کو گرفتار کرلیا، کابل کے سردار رتبیل کو شکست دی، عمّار خارجی کو قتل اور ہرات کو طاہریوں کے قبضہ سے نکالکر اپنی حکومت میں داخل کرلیا اسوقت نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ فتوحات کے نشہ میں اپنے وطن سیستان کو لوٹا۔ اہل سیستان نے یعقوب کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا اور امام ابو احمد عثمان بن عفان سنجری نے جمعہ کی نماز میں یعقوب کے نام کا خطبہ پڑھا۔ اور شعرا نے لمبی چوڑی تعریفیں لکھیں مدحیہ قصائد کہے۔ چونکہ اس زمانہ میں عربی ہی کا رواج تھا شعرا نے عربی میں قصیدے کہے۔ یعقوب بن لیث عربی سے بالکل ناواقف تھا اس نے کہا کہ اس سے کیا فائدہ کہ لوگ میری تعریف ایسی زبان میں کریں جسکو میں سمجھ نہیں سکتا۔ اس پر محمد بن وصیف نے فارسی زبان میں سب سے پہلی دفعہ

اشعار کہے - اکثر اشعار کے معنی ایك تو پرانی زبان اور غلط کتابت کی وجه سے صاف نہیں - مگر انکا عام مطلب سمجھ میں آجا تا ھے -

اے امیریکه امیران جهان خاص و عام	بنده و چاکر و مولائی و سگ بند و غلام
ازلی خطی در لوح که ملکی بدهید	به ابی یوسف یعقوب بن اللیث همام
بسام آمد و رتبیل لتے خورد به لنگ	لتره شد لشکر رتبیل و هبا گشت کنام
لمن الملك بخواندی تو امیرا به یقین	با قلیل الفئة کت داد در آن لشکر کام
عمر عمار ترا خواست و زو گشت بری	تیغ تو کرد میانجی به میان دد و دام
عمر او نزد تو آمد که تو چون نوح بزی	در آکار تن او سر او باب طعام

ان اشعار میں محمد بن وصیف نے جو واقعات و فتوحات بیان کئے ھیں اور یعقوب کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ھے ان کی صحت حرف بحرف تاریخ سے ھوتی ھے - اس نمونه سے یه بات بھی واضح ھے که فارسی زبان میں اس وقت تك سلاست اور روانی بھی پیدا نہیں ھوئی تھی -

تاریخ سیستان کا مصنف اس سلسله میں ایك اور شاعر کا ذکر کرتا ھے جس کا نام محمد ابن مخله ھے جو سیستان کا باشنده اور عالم و شاعر تھا اس نے بھی یعقوب کی مدح کی ھے -

جز تو نزاد حوا و آدم نکشت	شیر نهادی بدل و بر منشت
معجز پیغمبر مکی تو ئی	بکنش و بمنش و بگوشت
فخر کند عمار روزے بزرگ	کو هم انم من که یعقوب کشت

تاریخ سیستان سے معلوم ھوتا ھے که محمد بن وصیف یعقوب کے انتقال (سنه ۲٦۵ ھ) کے بعد بھی ایك طویل زمانه تك زنده رها ھے - رافع بن هرثمه (سنه ۲۸۳ ھ) کے مارے جانے پر بھی محمد بن وصیف نے دو شعر کہے ھیں جنکا مطلب اب تك واضح نه ھوسکا -

ای دل مکرین از طیران که — بیرون نمای از صدف مرجان
بو رافع اگر آن که شد ش خفه — از فعل ابی حفص شد جیشان

اور پھر جب امیر اسمٰعیل سامانی نے عمرو بن لیث کو بلخ میں گرفتار کیا ہے اس وقت (سنہ ۲۸۷ ھ) بھی محمد بن وصیف نے اس کی خدمت میں اشعار روانہ کئے تھے جو قابل ملاحظہ ہیں۔

کوشش بندہ سبب رنجش است — کار قضا بود ترا عیب نیست
بود و نبود از صفت ایزد است — بندۂ درماندۂ بیچارہ کیست
اول مخلوق چو باشد زوال — کار جہان اول و آخر یکیست
قول خداوند بخوان فاستقم — معتقدی شو و بران بر بایست

اس کے بعد تاریخ سیستان کے مصنف نے خاندان صفاریہ کی کمزوری (سنہ ۲۹۶ ھ) کا حال بیان کرتے ہوئے محمد بن وصیف کے پر درد اشعار لکھے ہیں۔

مملکتی بود شدہ بے قیاس — عمرو بران ملك شدہ بود راس
از حد هند تا بحد چین و ترك — از حد زنگ تا بحد روم وکاس
راس ذنب گشت و بشد مملکت — زرّ زدہ شد زنحوستِ نُحاس
دولت یعقوب دریغا برفت — ماند عقوبت به عقب بر حواس
عمرو عمر رفت و زو ماند باز — مذهب روباه بنس و نواس
اے چه غما آمد و شادی گذشت — بود دلم دایم ازین پر هراس
هرچه بکردیم بخواهیم دید — سود ندارد از قضا احتراس
ناس شدند نسناس آن که همه — و زهمه نسناس بگشتند ناس
دور فلك گردان چون آسیا — لاجرم این آس همه کرد آسّ
ملك ابا هزل نه کرد انتساب — نور ز ظلمت نکند اقتباس
جهد و جد یعقوب باید همی — تا که ز جدّه بدر آید ایاس،،

جو چیز ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی ہے وہ اسلامی دور میں فارسی کے داستانی اور رزمی اشعار ہیں۔ اس قسم کے اشعار ایران میں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ مسعودی کتاب مروج الذہب میں قلعہ الالان (آلان) کے متعلق یہ لکھا ہے "این قلعہ یکی از قلاع معروف باستحکام در عالم است و حکایت بنای آنرا از طرف اسپندیار ایرانیان در اشعار خود ذکر کردہ اند"، چونکہ کتاب مروج الذہب سنہ ۳۳۶ھ کی تالیف ہے اس لئے یہ اشعار بھی جنہیں مسعودی نے بیان کیا ہے قدیم ترین داستانی اشعار ہوں گے جن میں اسفندیار (شاید ہفت خوان) کی سرگذشت بھی گائی گئی ہوگی۔ لیکن اسلام کے بعد فارسی میں قدیم ترین داستانی نظم جو ہمیں ملتی ہے وہ مسعودی مروزی کا شاہنامہ ہے۔ ذیل میں اس پر روشنی ڈالی جائیگی۔

مسعودی مروزی

جس حد تک ہمیں مسعودی مروزی کے متعلق علم ہے وہ یہ ہے کہ وہ قدیم ترین شاعر ہے جس نے ملی داستان اور ایرانی تاریخ کو کیومرث سے آخری یزدجرد ثالث تک نظم کیا ہے۔ اس شاعر کے متعلق ہمیں معلومات دو جگہ ملتے ہیں ایک ثعالبی کی کتاب غرر ملوک الفرس ہے جس میں دو جگہ مسعودی کا نام آیا ہے طہمورث کے حالات بیان کرتے ہوئے ثعالبی لکھتا ہے۔

" وزعم المسعودی فی مزدوجتہ بالفارسیۃ ان طہمورث بنی قہندز مرو"، یعنی مسعودی در مثنوی فارسی خودش آوردہ کہ طہمورث قلعہ (کہندز) مرو را بنا نہاد۔"

دوسرے زال پدر رستم کے خاتمہ میں لکھتا ہے۔

" مسعودی مروزی در مثنوی فارسی خود ذکر کردہ کہ او (یعنی بہمن) ویرا (زال را) کشت و با حدی از کسان و خویشان او ابقا نہ کرد۔"

چونکه ثعالبی کی کتاب سنه ۴۰۸ ھ اور سنه ۴۱۲ ھ کی تالیف ھے اس لئے مسعودی کا ذکر اسکے زمانه کی قدامت کو ثابت نہیں کرتا۔ لیکن ایک دوسرا ماخذ جس میں اس شاعر کا ذکر آیا ھے ثعالبی کی کتاب سے قدیم تر ھے۔ اور وہ کتاب البدء والتاریخ ھے جو مطھر بن طاھر المقدسی کی تالیف ھے جو سنه ۳۵۵ ھ میں لکھی گئی۔ اس کتاب مین تاریخ ایران کے باب کے شروع اور آخر میں دو بیت ابتدائی اور انتہائی مسعودی کی نظم سے اس طرح دیئے گئے ھیں۔ کیومرث کے احوال میں کہتا ھے۔

" ایرانیان را در کتب خود شان عقیده بر آن است و خدا دانا تر است بحق و باطل آن که اولین کسی که از بنی آدم سلطنت کرد اسمش کیومرث بود و وی عریان بود و در زمین میگشت و سلطنتش سی سال بود و مسعودی در قصیده مزین خود بفارسی گفته (ھزج)

نخستین کیومرث آمد بشاهی — گرفتش بگیتی درون پیش گاهی

چو سی سال بگیتی باد شا بود — کی فرمانش بهر جائی روا بود

و من این ابیات را ذکر نه کردم مگر برای آنکه دیدم ایرانیان این ابیات و قصیده را بزرگ می شمارند و آنرا تصویر میکنند و مانند تاریخی برائے خود میپندارند "، اسی کتاب میں ساسانی بادشاھوں کے خاتمه میں لکھا ھے۔

" کار پادشاهان ایران بآخر رسید و خدا دین خود را ظاهر کرد و بوعدهٔ خود وفا نمود ودر این باب گوید ابن الجهم (سریع)

والفرس والروم لها ایام — یمنع من تقحیمها الاسلام

و مسعودی در آخر قصیده فارسی خود گوید :—

سپری شد نشان خسروانا — چوکام خویش راندند درجهانا

ھم اس شاعر کا زمانه ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے۔ لیکن اس میں شک نہیں که کتاب البدء والتاریخ یعنی سنه ۳۵۵ ھ کی تالیف نہایت قدیم کتاب ھے کیونکه مقدسی جو خود اھل فلسطین

سے تہا اور ایران آیا تہا ان اشعار کو ایرانیون میں اس طور پر شایع اور رائج پایا ہے کہ ہر جگہ اس قصیدہ کی تعظیم کی جاتی تہی۔ اور موجودہ شاہنامون کی طرح اسکو مصور کیا جاتا تہا۔ الف زایدہ بہی جو اخیر مصرعون کے آخر میں ہے قدیم زبان کی علامت ہے۔ جیسا کہ نولدکہ نے دقیقی کے اشعار میں بتلایا ہے۔ یہ راقم (آقای سید حسن تقی زادہ) بہی اس شاعر سے واقف نہیں۔ مسعودی ایک نسبت ہے جو عبد اللہ بن مسعود ہذلی (اصحاب حضرت رسول کریم صلعم) متوفی سنہ ۳۲ھ اور عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود (جو تابعین سے تہے) کے ساتہ منسوب کی جاتی ہے۔

پہلی جماعت بہت بڑی اور کثیر الافراد ہے اور جس طرح اس وقت طبا طبائی تمام شہرون میں پہیلے ہوئے ہیں ان کی بہی ایک بڑی تعداد تیسری چوتہی پانچوین صدیون میں مختلف شہرون میں پہیلی ہوئی تہی۔ بغداد۔ بلخ۔ مرو رود اور مرو میں مشہور مشہور اشخاص ہین جو اس نسبت کے ساتہ منسوب کئے جاتے ہیں اور خصوصاً بلاد خراسان مین اس سلسلہ کے بہت سارے افراد پہیلے ہوئے ہیں اور خاص کر مرو مین اس جماعت کا ایک شعبہ ہے اور مختلف کتابون میں ان کے بعض نام بہی دئے ہیں۔ مرو جو سنہ ۲۱۵ھ تک خراسان اور ماوراء النہر کی فرمانفرمائی کا مرکز اور طاہری امراکا مقر تہا حقیقت میں ایرانی نہضت کا بہی مرکز تہا۔ حتی کہ تیسری صدی کے آخر اور چوتہی صدی کے اوایل مین ہم یہ دیکہتے ہیں کہ اس جگہ کا مرزبان احمد بن سہل اپنے نسب کو سامانیون کے نسب سے ملا دیتا ہے اور خود مختاری کا دعوی کرتا ہے۔ اور وہ شخص جو رستم کے قصہ مین فردوسی کی روایات کا ماخذ تہا یعنی آزاد سرو اسی احمد بن سہل کے ہاں تہا۔ اسلئے یہ عجب نہین کہ ایرانی قومی داستان کا ترانہ اس شہر سے ,,جومرو شاہجہان،، سے ملقب تہا بلند ہوا ہو۔

مسعودی کے اشعار میں ایک نکتہ اور ہے یعنی تاریخ اور قصہ سرائی کے لئے مثنوی کی صنف کا استعمال اور نظم تاریخی کے لئے بحر ہزج کا انتخاب یہ دونوں باتین قابل توجہ ہیں۔

منثور شاهنامے

داستان اور تاریخ ایران کی منثور کتابیں جن کا همیں پته چلتا هے وه منثور شاهنامے هیں جو دقیقی اور فردوسی سے پہلے لکھے گئے هیں اس مین تو کوئی شك هی نهیں که فردوسی سے پیشتر منثور شاهنامے پائے جاتے تھے ان کا پته مختلف ماخذون سے ملتا هے ۔ لیکن ان کی اصلیت اور وجود کے متعلق اس وقت تك همارے هاں کوئی ذریعه معلومات نهیں صاف طور پر یه معلوم نهیں هے که جن شاهنامون کا ذکر مختلف شاهنامون مین آیا هے وه ایك دوسرے کے نقل تھے یا علحده علحده مستقل تصانیف تھے ۔

شاهنامه ابو المؤید بلخی

ابو المؤید بلخی مشهور شاعر کے شاهنامه کا جو ابو منصور بن عبد الرزاق طوسی کے حکم سے لکھا گیا تھا اور بعد مین (بموجب روایت دیباچه شاهنامه فردوسی) فردوسی نے اسکو نظم کیا هے مختلف طریقون سے پته چلتا هے ۔

اسکے علاوه ابو علی محمد بن احمد بلخی کا بھی شاهنامه هے جسکی اطلاع ثعالبی نے کتاب غرر ملوك الفرس میں دی هے ۔

ابو المؤید بلخی کا شاهنامه اس قسم کی کتابون میں قدیم ترین هے قدیم ترین ماخذ جس مین اس کتاب کا ذکر آیا هے وه تاریخ طبری کا فارسی ترجمه هے جسے بلعمی نے سنه ۳۵۲ ھ مین ترجمه کیا هے ۔ اس مین جمشید کے خاتمه اور اسکی اولاد و اعقاب کے نامون کے بیان میں اس طرح لکھا هے ۔ ”و پارسیان گویند بیرون از کتاب که بگریخت بزاولستان شد بحدیثی دراز و گویند دختر پادشاه زاولستان بزن شد و پدر نداشت و پدرش امر بدست او کرده بود پس چون دست بد ختر دراز کرد پسری آمدش تور نام .... و حدیثها و اخبار ایشان بسیار گویند، ابو المؤید بلخی، بشاهنامه بزرگ“

عنصر المعالی کی تالیف کتاب قابو سنامه میں جو سنه ۴۷۵ ھ کی تالیف ہے اس کتاب کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ مقدمه کتاب میں اسکے لڑکے گیلان شاہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”و چناں زندگانی کن که سزای تخمه پاك تو باشد که ترا ای پسر تخمه و اصل بزرگ است وازهر دو اصل کریم الطرفین و پیوسته ملوك جهانی جدت ملك شمس المعالی قابوس بن وشمگیر که نبیرهٔ آغش و هادان است، و آغش و هادان ملك گیلان بوده بروزگار کیخسرو وابو المؤید بلخی ذکر او در شاهنامه آورده و ملك گیلان باجداد تو ازاو یادگار مانده۔“

کتاب مجمل التواریخ کے مقدمه میں جو سنه ۵۲۰ ھ کی تالیف ہے ابوالمؤید کی کتاب کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

”۔۔۔۔۔۔۔۔ ما خواستیم که تاریخ پادشاهان عجم ونسب ورفتار وسیرت ایشان در این کتاب علی الولی جمع کنیم بر سبیل اختصار از آنچه خوانده ایم در شاهنامه فردوسی که اصل است و کتابهای دیگر که شعبهای آنست و دیگر حکما نظم کرده اند چون گرشاسف نامه چون فرامرزنامه واخبار بهمن وقصه کوش پیل دندان وازنثر ابوالمؤید ۔۔۔۔۔۔ چون اخبار نریمان و سام و کیقباد وافراسیاب واخبار لهراسف وآغش و هادان و کی شکن وآنچ در تاریخ جریر (طبری) یافتیم وسیرالملوك ازگفتار دوروایت ابن المقفع و۔۔۔۔۔۔“

ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان میں جو سنه ۶۱۳ ھ کے قریب میں لکھی گئی ہے ولایت رویان کے بیان کے ضمن میں ”شاهنامه مویدی“ کا ذکر بھی اس طرح کیا ہے۔

” بنای این شهر در زمان فریدون بوده وقتیکه پسران او تور وسلم برادر خود شان ایرج را کشتند ازوی دختری ماند درنا حیه کفور در ما وجه کوه۔ فریدون در آن وقت

خیلی پیر بود وابر وتهای او چنان افتاده بود که میبایستی آنها را ببند ند۔ یگانه دعای اواین بود که آن قدر زنده بماند تا انتقام قتل پسرعزیز خود را ببیند و اودختر ایرج رابیکی ازبرادرزادهای خود بزنی داد وقتیکه دختر طفلی زائید بچه رابفریدون پیرنشان دادند وی گفت : ماندچهرش بچهر ایرج ۔ ولهذا وی منوچهر نامیده شد چنانکه بنظم ونثر در شاهنامهای فردوسی مسویدی شرح داده شده ۔

وی انتقام جد خود ایرج را گرفت پیش ازآنکه فریدون ازدنیا برود ۔،،

ابو المو ید بلخی کے شاھنامه سے متعلق ایك تازہ اطلاع اس راقم(آقائی سید حسن تقی زادہ)کو دستیاب هوئی ھے یعنی اس شاھنامه کی نقل جسے تاریخ فارسی سیستان کے مولف نے کی ھے اگرچه شاھنامه کے نام سے نہیں ۔

آقای مرزا عباس خان اقبال آشتیانی معلم دارالفنون طهران نے جو آجکل ایران کے نہایت قابل ستایش فضلا میں سے ھیں ایك مقاله ،، شعر و موسقی قدیم ایران ،، کے عنوان سے لکھا ھے معظم له نے موسیقی ایران اورسرود ،، کرکوی ،، کی بحث کے ضمن میں اپنے مضمون کے استشہاد میں تاریخ سیستان کی حسب ذیل عبارت درج کی ھے ۔

،،وابوالمو ید اندرکتاب گرشاسپ گوید که کیخسرو بآزربادگان رفت ورستم دستان باوی بود وآن تاریکی و پتیاره دیوان بفر ایزد تعالی بدید که آذرگشسپ پیدا گشت ،،۔

جناب منظم له نے حاشیه یا ورق میں بھی جو ابوالمو ید سے متعلق ھے لکھا ھے که کتاب مزبور یعنی تاریخ سیستان میں کئی جگه ،، نام این ابوالمو ید و کتاب گرشاسب او،، آیا ھے ۔ اور ایك جگه تو صراحت کے ساته اس کتاب میں اسکو ابوالمو ید بلخی لکھا ھے۔اگرچه لفظ شاھنامه کا ذکر نہیں ھے تاھم اس میں کچه شبه نہیں ھے که اخبار گرشاسب بھی ابوالمو ید کی اس کتاب کا جزو ھے جسے بلعمی اور عنصر المعالی اور ابن اسفندیار نے (بظاھر نه که بعنوان

اسم کتاب) شاهنامہ کہتے ہیں - مجمل التواریخ میں اسے ,, نثرابوالموید ,, لکھا ہے -
اور تاریخ سیستان میں اسکو یا آس کی ایک جلد یا خاص فصل کو ,, کتاب گرشاسب ,, لکھا ہے -
اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ابوالموید نے اپنے شاهنامہ کے علاوہ جسکا وجود ثابت ہو چکا ہے
کوئی دوسری کتاب اس عنوان سے لکھی ہو -

ان تمام قرینون اور علامتون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالموید بلخی نے جو سامانیون
کے عہد کا مشہور شاعر اور قصہ یوسف علیہ السلام کو سب سے پہلے نظم کرنے والا ہے ایک
کتاب ایران کے پہلوانون اور سلاطین کے داستان اور تاریخ میں فارسی نثر میں لکھی تھی
جو سنہ ۳۵۲ سے قبل یا اس تاریخ سے ایک عرصہ قبل لکھی گئی تھی کیونکہ اس زمانہ میں
کتاب کی نشر و اشاعت کے لئے ایک مدت لازمی تھی تاکہ دوسری کتابون کے مولفین اس کا
تذکرہ کریں اور اس سے نقل کریں - اور اس کتاب میں یقیناً ضحاك جمشید اور اسکی اولاد
اعقاب کے حالات اور آغش دهادان کی داستان اور سام و نریمان و کیقباد ، افراسیاب
مہراسف ، کسی شکن کے واقعات اور فریدون - ایرج - سلم و تور منوچہر کے احوال
اور گرشاسب کی داستان مندرج تھی -

(باقی آئندہ)

محاوره
ما بین
یزدان و شاعر

از جناب محمد عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم اے (عثمانیه)

ریسرچ اسکالر فارسی جامعه عثمانیه

ز خاک آفریدی گلستانِ عالم — بهشتِ برین را ز خواب آفریدم

به هر آفتابے، جهانے کشادی — ز هر ذرهٔ، آفتاب آفریدم

نهادی به سر، فکر گردون خرامے — به دل، دیدهٔ ینم خواب آفریدم

سحاب آفریدی به روئے مه و مهر — به رخهائے روشن نقاب آفریدم

سکونے نهادی به هر موج دریا — به هر لخت دل اضطراب آفریدم

دو عالم به تیغ اجل خم نمودی — جهانے به کنج خراب آفریدم

چو دیدم که طوفاں زدی روئے دریا — ز گریه دو چشم پر آب آفریدم

هندی ادب اور اسکا ارتقاء

از

جناب محمد رحمت اللہ صاحب یم ۔ اے متعلم ال ال ۔ بی

ہند آریائی زبانیں یورپ وایشیا کے کسی سرحدی مقام پر وہ قومین آباد تہین جوایک مخصوص بولی بولتی تہین اوراسی بولی سے مختلف زبانین نکلی ہیں ۔ ان اقوام میں ایک بڑی زبردست جماعت جسکو آریائی قوم کہتے ہیں جیحون کے راستہ سے مشرقی جانب بڑھی اور جب یہ لوگ آگے بڑھے تو دو فرقون میں بٹ گئے ، جن کی بولئین بھی الگ الگ ہو گئین ۔ ان میں سے ایک بولی تو پہلوی و فارسی زبان کی ماخذ بنی اور دوسری اوس فرقہ کے ساتہ کابل کی طرف بڑھی اور وہاں سے شمالی ہندوستان میں پہیل گئی ۔ آریائی قوم کا جو فرقہ ہندوستان میں آیا وہ ہند آریائی قوم کہلاتا ہے اور ان کی زبانون کو ہند آریائی زبانین کہتے ہیں ۔ ہند آریائی زبان دو حصون میں تقسیم ہو گئی ایک سنسکرت اور دوسری پراکرت ۔

سنسکرت قدیم زمانہ سے ادبی زبان رہی اور پراکرت بول چال کی زبان ۔ چنانچہ سنسکرت کے معنی شستہ کے ہیں اور پراکرت کے معنی غیر شستہ کے ہیں ، جنکو مصنوعی و غیر مصنوعی بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس پراکرت یا غیر مصنوعی زبان کے سخت و ثقیل الفاظ رفتہ رفتہ بدلتے گئے لیکن پہر بھی پراکرتین غیر ترکیبی رہیں ۔ مختلف مقامات کی بولیئں آپس میں ایک دوسری سے بدلتی گئین یہان تک کے ان پراکرتون کی ایک (Analytic) ترکیبی شاخ یعنی سنسکرت اتنی شستہ و مہذب زبان بنگئی کہ اوس نے فوراً ادبی صورت اختیار کر لی ۔ پراکرتین اپنے اخیر دور میں قبل اس کے کہ اس سے جدید ہند آریائی زبانین نکلین ، اپابہرمسا کہلانے لگین اور یہی اپابہرمسا شمال ہند کی جدید زبانین ہندی ، پنجابی اور مرہٹی کی ماخذ بنی ۔

ماخوذ از گریرسن

یہ زبانیں تقریباً ۱۰۰۰ ع سے وجود میں آئی ھیں اور اب ترکیبی (Analytic) زبانیں بنگئی ھین۔

ھندی ھندی کے معنی اچھی طرح ذھن نشین کرنا چاھئے کیونکہ ھندی عجیب و غریب مفہوم میں استعمال کیجاتی ھے مثلاً غلطی سے اس سے مراد پوری شمالی ھند کی بول چال کی زبان لی جاتی ھے، لیکن بقول گریرسن شمالی ھند میں چار بڑی زبانیں بولی جاتی ھیں یعنی (۱) راجستانی، (۲) مغربی ھندی (۳) مشرقی ھندی (۴) اور بہاری۔ ان میں سے ھر ایك زبان کی اصل جدا جدا ھے، بہاری کا تعلق زبانوں کے اوس مجموعہ سے ھے جسکی ایك شاخ بنگالی بھی ھے اور مغربی ھندی کا اسکی اصلیت کے لحاظ سے پنجابی کے ساتھ گہرا تعلق ھے۔ لفظ ھندی کا اطلاق بعض اوقات جدید ادبی اعلی ھندی (Modern literary High Hindi) پر بھی ھوتا ھے جو اردو سے بالکل علیحدہ ھے لیکن اصل میں اعلی ھندی (High Hindi) اور اردو دونوں مغربی ھندی سے ماخوذ ھیں۔ ایك اور لفظ ھندوستانی بھی ھے جس کا اطلاق اون تمام زبانوں پر ھوتا ھی جو شمالی ھند (پنجاب، سندھ اور بنگال) میں بولی جاتی ھیں لیکن ادبی ھندی اور اردو اسی ھندوستانی کی دو مختلف شاخیں ھیں۔ فی الوقت اردو ھمارے موضوع سے خارج ھے کیونکہ اس کا دائرہ عمل جداگانہ ھی، انشاءاللہ اسی سلسلہ میں آئندہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائیگی۔

یہاں صرف راجستانی، مغربی ھندی، مشرقی ھندی اور بہاری سے غرض ھے۔ گویہ چاروں زبانیں ظاھرا جدا جدا معلوم ھوتی ھیں لیکن در اصل مغربی ھندی، پنجابی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ھے اور اسپر پنجابی و راجستانی کا گہرا اثر پڑا ھے اور دوسری طرف بہاری و بنگالی آپس میں ایك ھیں، برخلاف اس کے گو اردو و مغربی ھندی کی ایك شاخ ھے لیکن وہ اپنے ادبی راستہ پر آپ خود الگ الگ چل رھی ھے اور گو اوس نے ابتدا میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ھی کرلی تھی لیکن چابك دست معاروں نے اس چھوٹی

مسجد کی عمارت کو عالیشان کر کے اسکو اس قدر بلند کرد یا کہ نظر کام نہین کرتی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے (خدا اس کے قائم کرنیوالے کو تادیر قائم و بامراد رکھے آمین) اس اردو کی عالیشان عمارت پر وہ وہ ملمع کاریان کی ہیں کہ نگاہ پھر جاتی ہے، سچ پوچھو تو اس وقت دل یہ چاہتا ہے کے تھوڑی دیر کے لئے اپنے موضوع سے ہٹ کر دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کروں لیکن نوعیت بحث اس کے منافی ہے۔ برخلاف اردو کے مذکورۂ بالا چار زبانین ادبی لحاظ سے آپس مین ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہین اور اون رقبون مین جہاں یہ زبانین بولی جاتی ہین اور جہاں اردو سے کچھ سروکار نہین اعلی ہندی (High Hindi) ادبی زبان بنگئی ہے۔ اور ان زبانون کے استعمال کرنے والے ایک دوسرے کی زبان سمجھ سکتے ہین۔ اردو زبان بھی انہی زبانون مین شامل رہتی اگر اوس پر عربی و فارسی کا اثر نہ ہوتا۔

مغربی ہندی مغربی ہندی مختلف بولیون مین منقسم ہو جاتی ہے مثلاً بانگڑو جو گنگا کے مغربی اور پنجاب کے جنوب مشرقی حصہ مین بولی جاتی ہے۔ دوسری قسم برج بھاشا ہے جو متھرا اور اس کے ملحقہ اضلاع مین بولی جاتی ہے۔ جسطرح ریختہ اردو کی وہ شاخ ہے جو نظم کے لئے مخصوص ہے اسی طرح برج بھاشا مغربی ہندی کی وہ شاخ ہے جو نظم ہندی کے لئے وقف ہے، اور دو زبانین قنوجی و بندیلی بھی مختلف ممالک مین رائج ہین۔

دھلی مسلمانون کا قصر حکومت ہونے سے اس جگہ مختلف زبانون کی آمیزش اور حکومت کے سیاسی، معاشرتی، وادبی اثر سے وھاں ایک نئی زبان نے جنم لیا جس مین فارسی اور اس کے توسط سے عربی کے بے شمار الفاظ اور کچھ پنجابی و راجستانی کے الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں، اور آج کل برطانوی تسلط کی وجہ اردو زبان میں آئےدن انگریزی الفاظ داخل ہوتے جارہے ہیں اور جو ایک دن زبان کے مستقل اجزابن جائین گے اس قسم کے سیکڑون الفاظ مثال میں بیان کئے جاسکتے ہیں مثلاً تھیٹر، اسٹیج، سینما، ایکٹنگ موٹر، سیکل، سمن، وغیرہ وغیرہ۔

اردو جیسا کہ اس کی پیدائش کے لئے زیبا تھا فارسی رسم الخط مین لکھی جاتی
ھے۔ اردو کے معنی خیمہ یا لشکر گاہ کے ھیں چنانچہ اردو پہلے صرف لشکر کی زبان تھی
اور وھیں بازاروں میں سوداسلف لین دین وغیرہ میں مستعمل تھی،مسلمان فتوحات کی وجہ
سے اس زبان میں اس سرعت کے ساتہ ترقی ہوئی کہ وہ بہت جلد ادبی زبان بنگئی۔ جدید اعلی
ہندی کو بھی اس طرح کی اردو سمجھو جو رسم الخط کی مغائرت کے علاوہ بجائے فارسی
و عربی کے سنسکرت و ہندی الفاظ کی تابع ھے۔ بعض اوقات ,, کھری بولی ،، کا لفظ دھلی
و میرٹھ کی اصلی زبان جس میں فارسی و عربی کی ہنوز آمیزش نہوئی تھی اور اس جدید
ہندی کے لئے مستعمل ہوتا ھے جو للّو جی لال کی رواج دادہ ھے ۔

مشرقی ہندی کی مشہور شاخ اودھی ھے جو ادبی صورت میں پیش ھے۔
بہاری بہار مین بولی جاتی ھے۔ یہ ماگدھی کی ایک شاخ ھے اور ماگدھی کی دوسری شاخین
بنگالی اور آسامی ھین ۔

ہندی کے حروف تہجی سنسکرت کے ھین ، رسم الخط دیوناگری ھے جو
سنسکرت کے لئے بھی مستعمل ھے ۔

ہندی کی لغت یا الفاظ

الفاظ کی تعداد کا ایک بڑا حصہ وہ ھے جو فطرتی اور غیر احساسی
طور پر قدیم ہند آریائی زبانوں سے اسمین داخل ہوگیا ھے اورجو زمانہ
کے ساتہ ساتہ ترقی کرتا گیا ھے لیکن آجکل کی زبان مین عموماً ایسے الفاظ ملینگے جو براہ راست
سنسکرت سے لئے گئے ھین، ان الفاظ کو (۱) تت سمہ الفاظ (The Same as that) کہتے ھین۔
دوسری قسم کے الفاظ کو (۲) تدبھوہ (of the nature of that) کہتے ھین جو تت سمہ کی طرح
بالکل وھی تونہین بلکہ انمیں قدرے تبدیلی ہوئی ھے۔ فارسی سے بھی چند الفاظ لئے گئے ھیں
جو (۳) غیر ملکی الفاظ کہلاتے ھیں۔ اس قسم کے غیر ملکی الفاظ کایہا تتک رواج ھے کہ تلسی داس
کی تصانیف بھی اس قسم کے الفاظ کی متحمل ھین ۔

بعض مصنفین ”خالص ہندی“ بھی لکھتے ہین جس میں وہ الفاظ بکثرت ملینگے جو (۴) دیسیا یا دیسی کہلاتے ہین۔ اور جس میں فارسی یا غیر ملکی الفاظ کی مطلق آمیزش نہین ہوتی، چند پورچگی الفاظ اور آجکل حکومت کے اثر سے بہت سے انگریزی الفاظ بھی ہندی زبان میں داخل ہوتے جارہے ہین۔

ہندی عروض

عروض و بلاغت کی جتنی ترقی ہندی مین ہوئی ہے شاید ہی کسی زبان مین ہوئی ہو، اسکے اصول شاعری وہی ہین جو سنسکرت شاعری کے ہین۔ ہندی شاعری کا دارومدار انگریزی کی طرح لہجوں پر نہین بلکہ یونانی و رومی زبانونکی طرح ٹکڑون (Syllabeles) پر ہے۔ قافیہ و ردیف کی اسمین سختی کے ساتہ پابندی کی جاتی ہے۔ ہندی شاعری کی سی شیرینی و گھلاوٹ کسی اور زبان مین نہین پائی جاتی۔

یون تو ہندی بحرین بکثرت ہین لیکن عام طورپر حسب ذیل مروج ہین:—

(۱) دوھا یا دوھرا:— دوھا ایک بیت ہے جسکے ہر مصرعہ کے دو دو جز ہوتے ہین اور ہر جز کے بارہ ماترے ہوتے ہین اسطرح پورے چار اجزا یا دو مصرعون مین ۴۸ ماترے ہوتے ہین، یہ بحر تمام بحرون سے زیادہ مقبول و مروج و مستعمل ہے۔

(۲) سورٹھا:— آلٹا ہوا دوھا ہوتا ہے یعنی دوھے کا دوسرا نصف حصہ یا جز سورٹھا مین پہلا ہوجاتا ہے اور پہلا جز دوسرا ہو جاتا ہے۔

(۳) چوپائی:— یہ بحر چار مصرعون پر مشتمل ہوتی ہے جن مین سے ہر ایک مصرعہ مین سولہ ماترے ہوتے ہین۔ چوپائی بھی دوھے کی طرح زیادہ مقبول و مروج ہے۔

اور دوسرے مستعمل و مروج بحرین کنڈلیا، چھپائی، کاویا، ساویا اور کاوتا ہین۔

ہند آریائی زبانوں کا نقشہ

ہند آریائی زبان

پراکرت — سنسکرت

کشمیری کوہستانی لہندا سندھی گجراتی پنجابی مغربی ہندی راجستانی پہاڑی مشرقی ہندی بہاری بنگالی آڑیا آسامی مرہٹی

ہندی

سوراسینی

جدید زبانیں

(۲)

هندی ادب پر ایک عام نظر

راجه هرش سنه ٦٤٦ ء کے بعد جس نے شمالی هند میں ایک بڑی حکومت قائم کر لی تهی، بد امنی و بد نظمی ایک زمانه تك پهیلی رهی ، اس بد امنی کے دوران میں یعنی راجه هرش کے بعد سے مسلمانون کی فتوحات تك راجپوتون نے هندوستان میں خوب شور مچا رکها تها چنانچه انهون نے اپنی چهوٹی چهوٹی حکومتین بهی قائم کر لی تهین - گو کابل ، پنجاب اور سندھ پهلے هی سے مسلمانون کے زیر نگین تهے لیکن مسلمانون کے اصلی فتوحات سنه ۱۱۷۵ء سے شروع هوتی هین جبکه محمد غوری نے اپنے حمله شروع کئے - ان حملون اور فتوحات سے خائف اور خانه جنگیون سے تنگ هو کر هندو راجاؤن نے سنه ۱۱۹۱ ء میں اجمیر و دهلی کے چوهان راجه پرتهوی راج کے تحت ایک جتها قائم کیا - اول اول تو اونهین فتح هوئی لیکن سنه ۱۱۹۲ ء میں انهون نے شکست کهائی اور پرتهوی راج قید کر کے مار ڈالا گیا - دهلی پر فوراً مسلمانون کا قبضه هو گیا اور انکی حکومت جاری رهی یهان تك کے سنه ۱۳٤۰ ء میں محمد بن تغلق کے عهد حکومت میں مسلمانون کی ترقی ، اون کی قوت اور حکومت کی وسعت معراج کمال پر پهونچگئی تهی . گو یه سب کچه تها لیکن بعض راجپوت فرقے اور انکی حکومتین پوری پوری طرح محکوم نهین هوئی تهین تا این کے مسلمانون کو آخر کار مجبوراً ان راجپوت حکومتون سے بجائے جنگ کے صلح کر لینی پڑی -

یه وه زمانه تها جبکه هندوستان کی جدید مروجه زبانون کی تشکیل هو رهی تهی اور هندوستانی کی قدیم ترین ادبی صورت راجپوتانه کی درباری شاعری کی شکل میں ظهور پذیر هو رهی تهی ، راجاؤن کی فیاضانه سرپرستی نے شاعرون کی همتیں بڑهادی تهین - اس زمانـه کی هندی ادبی پیداوار گو زیاده تر مرثیه اور افسانه کی طرف مائل تهی تاهم ان میں واقعیت کا ایک پهلو یه تها که اسمین هندو راجاؤن اور مسلمان فاتحین کے درمیان لڑائیون کا ذکر کیا گیا جس کے ضمن میں اونهون نے اپنے ممدوحین کی دلیری ، همت ، بهادری ، ایثار ، بے نفسی ،

حب وطن، اور قوم کی محبت کی راگ راگنئین گائی ھیں۔ ان شاعرون میں سب سے زبردست و مشہور شاعر، چند بردئی، گذرا ھے جو پرتھوی راج کا درباری شاعر تھا اور جس کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔ چند بردئی کا معاصر جگ نائک تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چودھوین صدی عیسوی کے وسط کا ایک مشہور شاعر سارنگ دھر بھی ھے۔

رام کی پرستش کے عروج نے، جو ابتدائی پندرھوین صدی عیسوی سے شروع ہوتی ھے، مذھبی ادب کو بڑی قوت دی۔

مسلمانوں کے اثر سے هندی مین ایك بعد کا دور شروع هوتا ھے جس کا مشہور ترین شاعر کبیر گذرا ھے۔ اس تمام عبوری دور میں اون مذهبی تاثرات کے مختلف رجحانات ھیں جو اس زمانہ کے لوگون کے دلون میں پائے جاتے تھے جس کا نتیجه یه هوا کے سبھون نے اپنی بول چال کی زبان کو ادبی قالب میں ڈھال لیا یه دور سنه ۱۴۰۰ ء سے شروع هوتا ھے جس کے مشہور شاعر نام دیو، کبیر، ودیاپتی، میرابائی اور ملك محمد جائسی هین۔

راجپوتانہ کے درباری شاعرون نے جو زبان استعمال کی ھے وہ گویا تقریباً پراکرت (غیر شستہ هندی) ھے اور یہ دور هندی ادب کا عہد طفولیت کہلا یا جا سکتا ھے (سنه ۱۱۹۱ ء سے سنه ۱۴۰۰ ء تک)۔ لیکن دور دوم کے شعرا (ملك محمد، کبیر وغیرہ) نے جو زبان استعمال کی ھے وہ بہ نسبت دور ما سبق یعنی دور اول کے زیادہ شستہ اور زیادہ ادبی زبان ھے اور یہی زبان آجکل کی ادبی زبان ھے۔ یہ دور یعنی دور دوم هندی ادب کا عہد شباب کہلا یا جا سکتا ھے جو سنه ۱۴۰۰ ء سے شروع هو کر سولھوین صدی کے وسط تک قائم رہتا ھے۔

هندی ادب کا عہد زرین دراصل سنه ۱۵۵۰ ء سے شروع هوتا ھے۔ مغل بادشاھون نے نه صرف ملك کے سیاسی مسائل میں دلچسپی لی بلکه اونھون نے ملکی ادب کی بھی

زبردست سرپرستی کی، فنون لطیفہ کا ان کے دربار میں خوب عروج رہا چنانچہ اکبر (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ ء) جہانگیر (۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ ء) اور شاہجہان (۱۶۲۷ تا ۱۶۵۸ ء) کے عہد میں ہندی ادب کو کافی فروغ نصیب ہوا، اس دور میں ہندی ادب کے شعرا ماہتاب و آفتاب کی طرح چمکے جن میں سے مشہور تلسی داس، سور داس اور بہاری لال ہیں۔

ہندی ادب کا تیسرا دور (۱۵۵۰ تا ۱۸۰۰ ء) مغل حکومت کے زوال تک قائم رہتا ہے اور مغلوں کے زوال کے ساتھ اس دور کا بھی زوال ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد انیسویں صدی کی ابتدا سے یعنی سنہ ۱۸۰۰ ء سے حال تک ہندی کا جدید دور ہے یہ آخری اور چوتھا دور مغلوں کی تباہی اور انگریزی سلطنت کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے، انگریزی حکومت نے جہاں ہندوستان کی سیاست، معاشرت، تمدن اور میلان طبع کو بدلا وہاں ہندوستانی ادب پر بھی اسکا کافی اثر پڑا، جس اثر کے تحت اردو ادب نے اپنا رخ بدلا وہی اثر ہندی ادب پر بھی پڑا، چنانچہ اردو کی طرح ہندی ادب کے دونوں پہلوؤں ظاہری و باطنی یعنی خیال و طرز ادا (معنی و الفاظ) میں مغربی اثر صاف نمایاں ہے، یہ دور عبوری دور ہے، اس دور کی ابتدا میں للوجی لال نے جدید ہندی نثر کی بنا ڈالی جس کو انہوں نے اظہار خیالات اور واردات کا بہترین چمکدار آلہ بنا دیا۔ مطبعوں کی زیادتی نے ادب کو خوب پھیلایا۔ ہندی نظم کا عبوری دور ہرشچندرا سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ہندی ڈرامہ کو بھی کافی فروغ ہوا۔

ہندی ادب کی ابتدا اور اس کے ارتقائی مدارج کے دور حسب ذیل ہو سکتے ہیں :-

(۱) دور اول (قدیم راجپوتانہ کی درباری شاعری) سنہ ۱۱۵۰ ع سے سنہ ۱۴۰۰ ع تک۔

اس دور کے مشہور شاعر چند بردئی، جگ نائک اور سارنگ دھر ہیں۔

(۲) دور دوم (مذہبی شاعری کا دور) سنہ ۱۴۰۰ ع سے سنہ ۱۵۵۰ ع تک۔

اس دور کے مشہور شاعر نام دیو ، کبیر ودیا پتی ، میرا بائی اور ملک محمد جائسی هیں۔

(۳) دور سوم (مغل سلطنت کا دور) سنه ۱۵۵۰ع سے سنه ۱۸۰۰ع تک ۔

اس دور کے مشہور شاعر تلسی داس ، سورداس ، اور بہاری لال هیں۔

(۴) دور چہارم (جدید دور یعنی انگریزی حکومت کی ابتدا سے حال تک)

سنه ۱۸۰۰ع سے حال تک ۔

اس دور کے مشہور ادیب للو جی لال اور مشہور شاعر هریشچندرا هیں ۔

قدیم درباری شاعری

دور اول (سنه ۱۱۵۰ع سے سنه ۱۴۰۰ع تک)

ان درباری شاعروں نے اپنے ممدوحین کی دلیری ، بہادری ، جنگجوئی وغیرہ کے قصے اور واقعات بیان کئے هین ۔ اس دور کے شعرا کی قدیم ترین یا ابتدائی زبان مقامی پراکرت تہی لیکن بتدریج ترقی کرتے کرتے وہ اب ادبی زبان بن گئی هے۔ سنه ۱۰۰۱ع مین بسال دیو اجمیر کا راجه تہا اوس وقت جب که محمود غزنوی کا هندوستان پر پہلا حمله هوا تہا۔ اوس زمانه کی ایك چهوٹی سی نظم ، جس کا نام "بسال دیوارسو" هے اور جس مین بسال دیو کی مدح کی گئی هے ، پائی جاتی هے۔لیکن نه تو اس کے مصنف کے نام کا پته چلتا هے اور نه اس کو هندی ادب مین شمار کیا جا سکتا هے ۔ هندی ادب کا شمار در اصل "پرتهوی راج راسو" کی تصنیف سے هوسکتا هے جو سنه ۱۱۹۱ع میں لکھی گئی هے اور جو بقول جارج گریرسن خالص اپابهوم سا سور اسینی پراکرت سے مملو هے ۔

چندبردئی پرتهوی راج ، جس کو رائے پتهورا بهی کها جاتا هے ، سنه ۱۱۵۹ع مین پیدا هوا اور ۱۱۹۲ع مین قتل کیا گیا ، یه اجمیر و دهلی کا حکمران راجه تہا ، اس کو علم و هنر

سے بڑا شغف تھا اور باکمال شاعروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتا تھا چنانچہ علاوہ دوسرے شاعرون کے چند بردئی اس کے دربار کا مشہور شاعر تھا جس کو دربار مین راج کوئی (ملك الشعرا) کا رتبہ حاصل تھا، کہا جاتا ھے کہ دورسوم کا سورداس شاعر اسی کی اولادون مین سے تھا۔ اس نے پرتھوی راج کے دربار مین رسائی حاصل کی اور اوس کا وزیر اور ملك الشعرا بن گیا۔ اس کی سب سے اھم اور مشہور تصنیف ”پرتھی راج راسو“ ھے۔ یہ مشہور نظم ۶۹ کتابوں پر مشتمل ھےاور اس مین تقریباً ایك لاکہ اشعار ھیں جس مین شاعر نے اپنے سرپرست و ممدوح کی زندگی کے حالات و اس کے فتوحات اور اپنے زمانہ کی تاریخ بھی لکھی ھے۔ چند بردئی اور اس کا ممدوح دونون سنہ ۱۱۹۲ ع مین تارائن (Tarain) کی جنگ مین کام آئے۔ پرتھی راج راسو مین تاریخ کے ساتہ ساتہ افسانے اور فرضی قصے بھی بیان کئے گئے ھیں کیونکہ اس میں بعض لڑائیان پرتھی راج اور سلطان شہاب الدین کے درمیان بالکل غیر تاریخی ھین، کیونکہ اس مین مغلون کا عمل دخل ھندوستان کی تاریخ مین اسوقت سے بتلایا گیا ھے جب کہ اون کا ھندوستان میں قدم تك نہیں آیا تھا۔ مغلون کے ظہور سے تیس سال قبل پرتھی راج کے ساتہ آن کی جنگ ھونا بتلایا گیا ھے لھذا یہ واقعہ بالکل فرضی اور من گھڑت ھے۔ لیکن یہاں ھمین اس کی تاریخی صحت و غیر صحت سے کچہ واسطہ نہین، یہاں اس کی صرف ادبی حیثیت دیکھنی ھے، ادبی نقطۂ نظر سے پرتھی راج راسو قدیم ترین ھندی نظم کی کتاب ھے۔

جگنائك جگنائك، چند بردئی کا معاصر تھا اوربندیلکھنڈ مین مھوبا (Mahoba) کا درباری شاعر تھا۔ اس کی تصنیفات ھم تك نہین پہونچ سکین، صرف ”مھوبا کھنڈ“ ملتی ھے اور وہ بھی سینہ بہ سینہ چلی آئی ھے۔ یہ نظمین اب تك پیشہ ور گویون سے گائی جاتی ھیں لیکن ان میں حسب موقع ترمیم کرلی جاتی ھے، اس کے ایك حصہ کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا ھے۔

سارنگ دھر سارنگ دھر، جس نے چودھوین صدی کے وسط مین فروغ حاصل کیا ہے. کہا جاتا ہے کہ چندبردئی کی اولادون مین سے تھا۔ اس کی دو نظمین بہت مشہور ہین ایک ,, ھامیر راسا ،، اور دوسری ,, ھامیر کاویہ ،، جن مین رنتھمبور کے شاھی دربار کی تاریخ ہے۔ ان مین علاؤالدین کے مقابلہ مین ھامیر کی شجاعت و دلاوری کا ذکر ہے، جو علاؤالدین کے ھاتھ سے مارا گیا تھا۔

ان شاعرون کے جانشینون نے بھی آئندہ ھندی ادب مین نمایان کام کئے ھین جن کا ذکر آگے آئیگا۔ ان کی ذھنی پیداوار نہ صرف ادب مین بلکہ تاریخ مین بھی ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

اس دور کے دیگر شعرا بھوپاتی، تلاسنگھ، ملا داؤد اور امیر خسرو ھین جن کو چودھوین صدی عیسوی مین فروغ حاصل ھوا۔

(۲)

ابتدائی مذھبی شاعری

,, دور دوم ،، سنہ ۱۴۰۰ع سے سنہ ۱۵۵۰ع تک

ویشناواتحریک شمالی ھند مین ویشناوا تحریک سے ھندی ادب کا ایک نیا ارتقائی دور شروع ھوتا ہے، مسلمان فتوحات سے ھندو مذھب کو سخت صدمہ پہونچا تھا لیکن پھر بھی وہ معدوم نہین ھونے پایا، ویشناوا تحریک سے اس کی دبی ھوئی آگ بھڑک اٹھی، اس تحریک کا مدعا یہ تھا کہ ھندوؤن کے دلون مین اوتار کا عقیدہ جمائین، اس نئی تحریک کو چوطرف بڑی مقبولیت اور ھردل عزیزی حاصل ھوئی اور یہ مقبولیت اس کے ھندی ادب (بجائے سنسکرت کے) کی وجہ دگنی ھوگئی اور اسی ادبی اھمیت سے

یہان ہمین سروکار ھے ، یہ مان لیا گیا ھے کہ اس تحریک کے اصل بانی راما نندا تھے جن کے بہت سے چیلے پیدا ہوتے گئے ، اس تحریک کے اثر سے بھکتی (عقیدتمندی یا مذھبی) شاعری نے جنم لیا۔

اس دور کے مشہور شاعر حسب ذیل ھیں :۔

نام دیو یہ مرھٹواڑی علاقہ کے باشندے تھے اور شاید پنڈر پور مین رھتے تھے انکو سنہ ۱۴۰۰ اور سنہ ۱۴۳۰ کے درمیان فروغ ھوا ، وہ ذات کے درزی تھے ، انکی عمر کا کچھ حصہ اوباشی میں گذرا لیکن بعد میں تائب ھوکر اس زمرہ میں شامل ھوگئے ، انکی تصنیفات مین متعدد مرھٹی گیت پائے جاتے ھین ، وہ شمالی ھند مین بڑے ذبردست مذھبی لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے ، انھون نے ھندی مین بہت سی نظمیں لکھی ھین جو گرنتھ (granth) مین محفوظ ھین ، اسوقت شمالی ھند مین شاعری کا جو نیا مذھبی دور شروع ھوا تھا اسکے پہلے نمائندے نام دیوھی تھے۔ نیا مذھب یہ تھا کہ سنہ ۱۴۳۰ء مین راما نندا نے وعظ و تلقین شروع کی کہ رام کے نام سے خدا کو پوجنا چاھئیے اور رام جی ھی برائیون سے نجات دلا سکتے ھین جن کے متعلق پکا عقیدہ (بھکتی) رکھنا چاھئیے۔ راما نندا نے بنارس کو اپنا مرکز بنا کر وھان سے مذھب کی اشاعت کی اور چو طرف سے قبولیت کی صدا گونجنے لگی ، انھون نے توحید کی تعلیم دی اور کہا کہ صرف ایک خدا کو پوجنا چاھئیے جس مین بہ نسبت جسمانیت و مادیت کے روحانیت کا عنصر غالب ھو اور وہ رام جی ھین۔ راما نندا کے پیرؤن نے سنسکرت کے استعمال کو عملاً ترک کردیا اور یہ ھندی ادب کی ترقی کا زبردست سبب ھوا۔

کبیر (سنہ ۱۴۴۰ء سے سنہ ۱۵۱۸ء تک) خواہ بحیثیت شاعر یا بحیثیت مذھبی پیشوا وہ راما نندا کا سب سے بڑا پیرو تھا۔ وہ ایک مسلمان جولاھہ تھا ، اس کی پیدائش کے متعلق عجیب عجیب روایتیں چلی آتی ھین ، ایک روایت یہ بھی ھے کہ وہ دراصل ایک برھمن بیوہ کا

لڑکا تھا لیکن مارے شرم کے اس کی ماں نے اس کو بنارس کے قریب ایك کنٹه مین ڈالدیا تھا جہاں سے ایك مسلمان جولاہه نیرو اور اس کی بیوی نعمه نے اس کو اٹھالا کر اپنے گھر میں اس کی پرورش کی اور اپنے بچے کی طرح اس کو پالا پوسا ۔

کبیر کا مذهب ابتدا میں کچه عجب درمیانی مذهب تھا نه تو پورا هندو اور نه پورا مسلمان بلکه موحد ۔ اس کو جب نگرو (بغیر گرو کے) هونیکا الزام لگایا گیا تو اس نے بعد آزمائش راما نندا کی پیروی اختیار کی اور ان کے چیلون مین شامل هو گیا لیکن تلقین، هدایت اور عقیدت مین وه اپنے گرو سے بھی دو قدم آگے تھا ۔ اس کے خیالات مین مسلمانی اثر بھی پایا جاتا هے ، وه رام کے ساته هری ، گووندا اور الله کا بھی نام لیتا هے ۔ وه اپنے مذهب کا بانی هے جو ” کبیر پنته “ کہلاتا هے ۔ وه اوتار کے عقیده کا مخالف تھا اور بت پرستی و دیگر هندو رسوم کے خلاف وعظ و تلقین کرتا تھا ۔ کبیر کا اثر مذهب اور ادب دونون پر مسلم هے ۔ اس کا مذهبی اثر اس کے فرقه ” کبیر پنته “ تك محدود نهین بلکه شمالی هند کے هندؤن مین اس کا مذهبی اثر عام تھا ۔ اوس نے نه صرف هندو عقیدون بلکه بعض مسلمان عقیدون کو بھی چھیڑا هے اور ان کی مخالفت کی هے ۔ معلوم هوتا هے که سکندر لودهی نے اس کا پیچھا اٹھایا تھا کیونکه هندو اور مسلمان دونون نے اس کو قابل الزام ٹھرایا تھا آخرکار بادشاه کے حکم سے اوس کو بنارس سے جلاوطن کردیا گیا ۔

کبیر کی نظمین تعداد میں بہت هیں جن کو خود اوس نے مرتب نهیں کیا بلکه اوس کے چیلون نے اونهین یاد رکھا اور مرتب کیا ، اس مجموعه مین بعض نظمیں اوس کی اصلی نهین معلوم هوتیں ۔ ایك مجموعه آدی گرنته میں محفوظ هےاور ایك مجموعه بجك (Bijak) مین ملتا هے ۔ اس کی ایك مذهبی هدایت کی کتاب کبیر پنته بھی ملتی هے ۔ اس کی نظمین مختلف بحرون میں هیں ۔ کبیر کی تصانیف کا ایك اور مجموعه جس کو خاص گرنته کہتے هیں بنارس میں اس کا مستقر ملتا هے جس میں کہا جاتا هے که بیس مختلف کتابیں شامل هیں ۔

بیجک مین اوس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ہندی کی قدیم اودھی زبان ہے۔ کبیر کی نظمین کچھ زیادہ شستہ و پاکیزہ نہین اور نہ اسٹائل سادہ و عام فہم ہے، گرامر کا بھی ان میں پورا لحاظ نہین رکھا گیا ہے، لفاظی، ابہام، ضلع جگت اور مغلق ترکیبین، دوراز کار تشبیہات، بعید از قیاس استعارات نے زبان کو نا قابل فہم بنا دیا ہے با این ہمہ کبیر کا درجہ ہندی ادب مین نہایت اہم و اعلی ہے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس کی ادبی پیداوار قابل عزت ہے، اپنے زمانہ کے مروجہ اعتقادات کی جس جوش، قوت اور استقلال سے اوس نے مخالفت کی ہے اور ان کا مقابلہ کیا ہے وہ حقیقت مین قابل داد ہے۔ مذہب کا رخ بدل دینا کوئی آسان کام نہین، کسی سطحی و معمولی قابلیت رکھنے والے کا یہ کام اور یہ دل گردہ نہین ہوسکتا کہ جمہور کے اور خصوصاً جاہلوں کے عقیدوں پر حملہ کر کے اون کو اپنے اعتقادات کے سانچے مین ڈھال لے۔ اس مہتم بالشان منصوبہ کے لئے اوس نے اپنی شاعری سے بیحد کام لیا۔ ظاہر ہے کہ ہر کام مین چاہے وہ مذہبی ہو یا معاشرتی، جب سیاست، قوت، زور اور زر سے کام نہین چلتا وہاں شاعری بے انتہا مفید ثابت ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے عموماً شاعر بڑے بڑے ارادوں مین پار پڑے ہین۔

کبیر کو ہندی لٹریچر کا باوا آدم کہنا ایک قسم کی ہٹ دھرمی ہے کیونکہ اس سے قبل ہمین معلوم ہو گیا ہے کہ شعراء نے ہندی ادب کا وجود پیدا کر دیا تھا ہاں البتہ کبیر کو اس کا پہلا مدون یا یہ کہنا اس سے زیادہ صحیح ہوگا کہ اوس نے مذہبی ادب کو کافی فروغ دیا اور اس لحاظ سے وہ پہلا زبردست مذہبی ادبی شاعر کہلایا جاسکتا ہے یا اگر مین غلطی پر نہون تو یون سمجھ لیجیئے کہ ہندی ادب مین کبیر کو وہی درجہ حاصل ہے جو اردو ادب مین ولی اورنگ آبادی کو۔

کبیر کا بیٹا کمال بھی شاعر تھا جس نے اپنے باپ کی ہر بات مین تردید کی ہے۔

کبیر کی نظمون کے ترجمے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کے اس میں لطافت خیال

اور طرز ادا کی جدت بہت کم پائی جاتی ھے - زبان پر گو اسے قدرت تھی لیکن بیان پھسپھسا معلوم ھوتا ھے -

نانک

کبیر کی تبلیغ و اشاعت مذھب نے جو مختلف فرقے پیدا کئے اون میں سب سے زبردست فرقہ سکھون کا ھے جس کا بانی نانک تھا - نانک نے ستائیس برس کی عمر میں کبیر سے ملاقات کی - کبیر کا اثر نانک پر نہایت گہرا نظر آتا ھے کیونکہ سکھہ گرنتھہ میں کبیر کی نظمیں پائی جاتی ھین - علاوہ اس کے نانک کے اصول و عقائد کبیر کے اصول و عقائد سے نہایت مشابہت رکھتے ھین -

نانک کی گیتین اور مناجاتیں پنجابی اور ھندی کی مخلوط زبان میں ھیں ، اس موقع پر ملحوظ رھے کہ پنجابی کا اثر ھندی پر اتنا گہرا پڑا کہ ان دونونکی ایک مخلوط زبان نانک کے کلام مین پائی جاتی ھے - گو بحیثیت ایک شاعر کے نانک کا درجہ کبیر سے بہت کم ھے تاھم اسکی نظمون مین پاکیزگی ، شستگی اور سادگی پائی جاتی ھے اور وہ اثر و تاثر سے لبریز معلوم ھوتی ھیں - اسکی نظمون ، گیتون اور مناجاتون کا مجموعہ سکہ گرنتہ مین ملتا ھے -

کرشنا بھکتی :—(The Krishna Calt)

راماننداً کبیر اور نانک کے پیرو رام کو خدا مانتے تھے - اور اسکے ساتہ ساتہ بت پرستی کی بھی اجازت تھی لیکن کبیر اور نانک کے ھاں بت پرستی ممنوع تھی اور یہ (کبیر و نانک) رام کو غیبی خدا مانتے تھے نہ کہ اوتار - ایک اور جماعت تھی جو خدا کو کرشنا اوتار مین مانتی تھی اور اس عقیدہ کی اشاعت بھی مذھبی ادب سے ھوئی - جو ملکی زبان مین نمایان کیا جاتا ھے -

ودیاپتی

ودیاپتی ٹھاکور پندرھوین صدی کے وسط مین بہار مین رھتاتھا - وہ مشرق ھندوستان کا سب سے زیادہ مشہور و ایشنوا شاعر ھے - وہ گویون کے ایک اسکول کا بانی تھا -

جو پورے بنگال مین پھیلے ہوئے تھے ، اسکی متعدد سنسکرت تصنیفات ہین ۔ اسکی شہرت کا زیادہ تر دارومدار ہماری زبان کی نظموں پر ہے ، ان مین اوس نے رادھا کا عشق کرشنا سے تمثیلا بیان کیا ہے ۔ اس کی نظمون مین بڑا ادبی اقتدار پایا جاتا ہے اور مشرقی ہندوستان کی ادبیات میں اوس کا بڑا حصہ ہے ۔

میرا بائی ودیاپتی کے زمانہ مین یا کچھ ہی دنوں کے بعد (سنہ ۱۴۷۰ ء) مغربی ہندوستان مین ہندی کی مشہور شاعرہ میرا بائی نے فروغ پایا ، اوس کی نظموں نے کرشنا مذہب کی اشاعت مین بڑی مدد دی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راجپوتانہ کی شہزادی تھی جو بھوج راج ، میور کے مہاراجہ ، کے ساتھ بیاہی گئی تھی ۔ میرا بائی بچپن ہی سے کرشنا کی پکی معتقد تھی اور وہ سادھؤں کی بڑی خاطر و مدارات کرتی تھی ۔ میرا بائی کی نظموں میں کرشنا کے ساتھ پکے اور گھرے اعتقاد کا اظہار ہے گو بعض نظموں مین اوس نے رام کو بھی نا خدا کے م سے یاد کیا ہے ۔ اس کی نظمین برج بھاشا مین ہین اور نہایت لطیف اور پاکیزہ ہین ، گجراتی کی بھی بعض نظمین میرا بائی کی طرف منسوب کی جاتی ہین ۔

اوس زمانہ کے بھکتی اعتقادات تین طرح کے تھے :—

(۱) وہ جو رام کو اوتار مانکر اوس کی پرستش کرتے اور ساتھ ساتھ بت پرستی بھی کرتے تھے ۔

(۲) وہ جو خدا کی پرستش رام کے نام سے کرتے تھے لیکن اُن کے ہاں بت پرستی منع تھی ۔

(۳) وہ جو کرشنا کی پرستش کرتے تھے ۔

پہلی قسم کے اعتقادات کے حامی راما نندا اور اون کے پیرو تھے ۔
دوسری قسم کے اعتقادات کے حامی کبیر و نانک اور اون کے پیرو تھے ۔
تیسری قسم کے اعتقادات کے حامی ودیاپتی اور میرا بائی تھے ۔

یہ تینوں قسمیں ویشنا واتحریک مین شامل هوسکتی هین ۔ ان تینوں مذهبوں کے نمائندوں نے هندی زبان بھی کو اپنا آلۂ تبلیغ بنایا جس کی وجه سے هندی ادب کی اس دور مین خاصی ترقی هوئی ۔

ملک محمد جائسی اس مذهبی دور میں ایک درباری شاعر بھی ملتا هے جس کی درباری شاعری پر ایک حد تک مذهبی ادب کا بھی اثر معلوم هوتا هے،یه ملک محمد جائسی تھا جس نے تقریباً سنه ۱۵۴۰ء میں فروغ حاصل کیا اور اس نے ایک تصنیف پدماؤتی کے نام سے کی ۔ ملک محمد ایک مسلمان متقی پرهیزگار تھا جس پر کبیر کا گہرا اثر پڑا تھا ۔ ملک محمد امیٹھی کے راجه کا بڑا چهیتا تھا اور اس کے دربار میں اس کو بڑا رسوخ حاصل تھا ۔ پدماؤتی کے علاوه اس نے ایک مذهبی نظم اکھاروت کے نام سے لکھی هے ۔ پدماؤتی میں اس نے پدمنی اور علاؤالدین شہنشاه دهلی کا واقعه بیان کیا هے لیکن اخیر میں وه کہتا هے که یه قصه ایک تمثیل هے ۔ چتوڑ ، جسم ۔ رتن سین ، روح ۔ پدمنی ، عقل ۔ علاؤالدین ، فریب ۔ طوطا ، گرو وغیره وغیره هیں ۔ اسکی نظم میں فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے هیں ۔ وه پهلے فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی اور بعد مین هندی میں ۔ اس کو هندی ادبیات کے شه کار میں شمار کرنا چاهئے اس میں شاعرانه تخیل اور حسن بیان پایاجاتا هے ۔

(۳)
مغلیه سلاطین کا دور

"دور سوم" (سنه ۱۵۵۰ع سے سنه ۱۸۰۰ع تلک)

هندی نظم پر نیا اثر اگرچه مسلمانوں کی مذهبی زبان عربی هے لیکن اونکی دفتری و درباری زبان هندوستان میں فارسی تھی ۔ بهت سے هندؤں نے جن کو دربار سے کچھ نه کچھ تعلق تھا ، فارسی زبان سیکھی اور جب اردوادب کو

ترقی ہوئی اوس کا سنگ بنیاد بھی فارسی تھا۔ گو ہندی زبان کے ادب اور ان کی ترقی میں فارسی کا کوئی بالراست اثر نہیں پڑا تاہم ہندؤں کی فارسی دانی کا اس پر قابل لحاظ اثر پڑا ہے۔ فارسی شاعری کے پاکیزہ خیالات اور اعلی مضامین فارسی داں ہندؤں کے توسط سے ہندی زبان و ادب میں اپنا دخل پیدا کرتے گئے اور اسطرح ہندی شاعری کا معیار به نسبت پہلے کے زیادہ بلند ہو گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ مغلیہ دربار کی سرپرستی میں سولھوین صدی عیسوی کے وسط سے ہندی ادب میں کافی ترقی ہوئی۔ یہاں تک کے یہ دور ہی ایک ممتاز اور نمایاں دور ہندی ادب کا قائم ہو گیا۔

سب سے پہلا مسلمان بادشاہ اکبر تھا جس نے ہندی ادب کی نہایت زبردست سرپرستی کی۔ وہ بڑا علم دوست اور ادب شعار بادشاہ تھا۔ فنون و ادب کا زبردست سرپرست تھا۔ اس کے دربار سے شاعرون کو بیش بہا صلے و انعامات ملتے تھے۔ مثل دوسرے ادبوں کے ہندی ادب کو بھی اس کے زمانہ میں بہت فروغ ہوا۔

اکبری دربار کے شعرا

خود اکبر چند چیدہ چیدہ ہندی نظمون کا مصنف ہے جن مین اوس نے خود کو اکبر رائے لکھا ہے، شاید یہ نظمیں درباری مطرب تان سین سے گوائی جاتی تھیں، اکبری دربار کے وزرا بھی شعراء گذرے ہیں۔ راجہ ٹوڈرمل نے ہندؤں کو فارسی سیکھنے کی ترغیب دی اور اسطرح اوسنے اردو زبان پر بڑا احسان کیا کہ ہندؤں کی ہندی اور جدید فارسی دانی کے اختلاط و میل سے ایک نئی زبان اردو پیدا ہوئی اور بعجلت تمام ترقی کرتے کرتے اس نوبت کو پہونچی ہے۔ خود راجہ ٹوڈرمل بھی ہندی شعر کہتا تھا۔ راجہ بیربل بھی اکبری دربار کا مطرب شاعر تھا۔ اکبر نے اوسے ملک الشعراء (کوئی رائے) کا خطاب دیا تھا۔ اوسکی مذاقیہ نظمیں مشہور رہیں۔

اکبری دربار کے دیگر شعرا حسب ذیل ہیں:—

راجہ منوھرداس۔ جے پور کے مہاراجہ مان سنگھ۔ ابوالفضل فیضی موخرالذکر نہ صرف فارسی شاعر تھا بلکہ ہندی دوھے بھی اس کے مشہور ھیں۔ اکبر کے وزراء مین سب سے ماھر ہندی شاعر عبدالرحیم خانخانان تھا اور وہ عربی، فارسی سنکرت اور ہندی کا، ماھر تھا۔ علاوہ خود شاعر ہونے کے وہ بہت سے شاعرون کا سرپرست بھی تھا۔ اس کی ہندی نظمیں زیادہ تر اخلاقی ھین۔

تان سین | گوالیار کا باشندہ۔ اسکو اکبری دربار مین سنہ ۱۵۶۰ء سے سنہ ۱۶۱۰ء تک فروغ حاصل رھا۔ وہ نو مسلم تھا۔ اپنے زمانہ کا مشہور گویّا اور اکبری دربار کا مطرب شاعر تھا اکبر اس کے ساتھ بیدریغ سلوک کیا کرتا تھا۔ اوسکے تصانیف سے سنگیت سار اور راگ مالا ھیں۔ علاوہ ان درباری شعرا کی اکبری عہد میں دو سب سے زبردست شعرا تلسی داس اور سورداس ہوے ھیں، جن کا ذکر آگے آئیگا۔ اس زمانہ مین بندیلکھنڈ مین ایک زبردست شاعر کیساؤ داس گذرا ھے جس نے فن شاعری پر بیش بہا تصانیف کی ھین۔ کیساؤ داس کی شاعری عام فہم نہین ھے لیکن وہ بڑے پایہ کا شاعر تھا۔ اوسکی تصانیف پر بہت سی شرحین لکھی گئی ھین۔ اسکی خاص طرز کے چند پیرو بھی پیدا ہو گئی تھے۔

جہانگیر و شاہ جہان کے درباری شعرا | ہندی ادب میں اکبر کی مساعی جمیلہ کی یادگارین اس عہد تک باقی رھیں، جہانگیر و شاھجہان نے بھی اکبر کی طرح شعرا کی حمایت وسرپرستی کی۔ شاھجہان کے بیٹے دارا شکوہ نے علم و ادب کی بڑی سرپرستی کی حتی کہ اورنگ زیب جیسے شہنشاہ کے عہد میں بھی کوئی رائے کا عہدہ قائم تھا۔ سندر، شاھجہان کے دربار کا کوئی رائے تھا اس نے برج بہاشا میں سنگھا سن بتسی کی تصنیف کی جس کا بعد میں للوجی لال نے اردو میں ترجمہ کیا۔

شاھجہان و اورنگ زیب کے زمانہ میں تری پاتھی برادرون (Triphathi Brothers) کی شاعری کو بہت فروغ ہوا۔

شاھجہان کے عہد کے دوسرے شعراء حسب ذیل ھیں —

سرسوتی | بنارس کا برھمن تھا۔ سنہ ۱۶۵۰ء میں اس کو فروغ حاصل ھوا۔ وہ سنسکرت کا بڑا عالم تھا۔ شاھجہان کے حکم سے اس نے ھندی نظم لکھنی شروع کی۔ اس کی ھندی نظموں کے ممدوحین میں شاھجہان اور دارا شکوہ ھیں۔

تلسی | سنہ ۱۶۵۵ء میں اس کو فروغ ھوا۔ اس نے مختلف شاعروں کے نظموں کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار کیا جس کا نام "کوئی مالا" ھے، اور جس میں سنہ ۱۴۴۳ء سے سنہ ۱۶۴۳ء تک کے شعرا کا منتخب کلام ھے۔

بھاری لال چوب | اس زمانہ کا سب سے مشہور ھندی شاعر بھاری لال گذرا ھے جو "کرشنا بھکتی"، کا شاعر تھا۔ وہ گوالیار میں پیدا ھوا اور اپنا بچپن بسند یلکھنڈ میں بسر کیا۔ اپنی شادی کے بعد وہ متھرا میں مقیم ھو گیا جو برج بھاشا کا وطن ھے اور برج بھاشا ھی میں اس نے اپنی نظمیں لکھیں۔ جے پور کا راجہ جے سنگھہ اس کا مربی اور سرپرست تھا جو اس کو فی دوھا ایک اشرفی دیتا تھا، اس کے تقریباً سو دوھے اور سو رٹھیے ایک مجموعہ "ست سئے"، میں پائے جاتے ھیں اس نے کئی چیستان، معمے اور پہیلیاں بھی لکھیں ھیں۔ اورنگ زیب کا مد مقابل جودہ پور کا مہاراجہ جسونت سنگھہ بھی ھندی کا زبردست شاعر تھا۔ ادبیات میں اس کی مشہور تصنیف "بھاشا بھشنت"، ھے جس میں اس نے ھندی عروض و بلاغت کی دو سو ایکسٹھہ دوھوں میں تشریح کی ھے گو اس مضمون کا سب سے پہلا مصنف کیشو داس تھا تاھم جسونت سنگھہ کے دوھے قابل لحاظ ھیں۔

دوسرا شاعر ایک سندھیا برھمن دیو کوی تھا جو اٹاوہ کا رھنے والا تھا۔
اورنگ زیب کے زمانہ سے مغل سلطنت کا زوال شروع ھوتا ھے اور اس کے ساتھ ساتھ ھندی

ادب پر بھی اس کا ناقابل احساس اثر پڑتا ھے۔ اورنگ زیب ھندی زبان کا مخالف تھا تا ھم اس کے عہد سے اٹھارویں صدی کے آخر تك ھندی ادب کے کثرت سے شعراء پیدا ھوئے مثلاً رام جی۔ گرودتت سنگھہ۔ چندن رائے۔ چاژن گوپال۔ بھکاری داس۔ رگھوناتھہ۔ جگت سنگھہ۔ ٹھاکور۔ اورھری چرنداس وغیرہ وغیرہ۔

تلسی داس اور رامابھکتی

(۱۵۵۰-۱۸۰۰)

تلسی داس

ھندی لٹریچر میں تلسی داس کا نام نہایت جلی حروف سے لکھا جاتا ھے۔ اس کی ادبی شخصیت نہایت بلند ھے اس کی ھندی رامائن نہ صرف ھندوستان میں بلکہ تمام عالم میں مشہور ھے۔

کہا جاتا ھے کہ وہ سنہ ۱۵۲۲ ء کے حدود میں پیدا ھوا۔ اس کے باپ کا نام اتمارام اور ماں کا نام ہلاسی بتایا جاتا ھے۔ پہلے اس کا رمبولا نام تھا لیکن بعد میں اس نے اپنا نام تلسی داس رکھہ لیا۔ اس کے وطن کے متعلق مختلف روایتیں ھیں۔ بعض اس کو ھستناپور اور بعض حاجی پور کا متوطن بتاتے ھیں لیکن سب سے مصدقہ امر یہ ھے کہ وہ راج پور میں پیدا ھوا تھا اور قنوجی برھمن تھا۔ اس کا گرو مرھتر داس تھا۔ اس کو اپنی بیوی کے ساتھ بے انتہا محبت بلکہ عشق تھا۔ اس سلسلہ میں ایك عجیب وغریب بیان کیاجاتا ھے کہ ایك دن جب ان کی بیوی اپنی میکے گئی تو تلسی داس کو اس کی مفارقت دوبھر ھوگئی اور بے صبری کے عالم میں دوسرے ھی دن اپنی سسرال بیوی کے ھاں گیا۔ اس کی بیوی نے اس کو لعن طعن کیا اور کہا کہ اگر یہی محبت رام کے ساتھ ھو تو زمین بھی سونا بن جائے۔ بس گویا یہ تلسی داس کی ھدایت کا وقت تھا اوس کی بیوی کے الفاظ نے اوس کے دل پر گہرا اثر کیا اور دوسرے دن صبح اٹھتے ھی وہ گھر سے نکل پڑا اور رام جی کا معتقد بن گیا بنارس کو اپنا مسکن بنایا اور اپنی عمر

کا بیشتر حصہ وہیں بسر کیا ۔ گو اس کا براہ راست دربار سے کوئی تعلق نہیں تھا تاہم راجہ مان سنگھ اور عبدالرحیم خانخانان اوس کے بڑے دوست تھے اور بیشک وہ اس لٹریچر سے متاثر ہوا جو اوس کے زمانہ میں اکبری دربار میں پیدا ہوا تھا ۔ اوس کا بنارس مین سنہ ۱٦٦۴ ع مین انتقال ہوا ۔

تلسی داس کا بہترین شہ کار راماین ہے جو بقول اوس کے سنہ ۱۵۷۷ ع میں شروع کیا گیا تھا تلسی داس کی راماین والمیک کی اصل سنسکرت کا ترجمہ نہین ہے بلکہ خاکہ و نقشہ وہی لیکن اوس مین اور اس مین فرق ہے ۔ والمیک مین دوسرے سے چھٹے باب تک رام ایک معمولی انسان کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے برخلاف اس کے تلسی داس مین رام شروع سے آخر تک آوتار بتایا گیا ہے بجائے والمیک کے معلوم یہ ہوتا ہے کہ تلسی داس کا ماخذ ایک سنسکرت کتاب ادھیاتما راماین (Adhyatma Ramayan) ہے جس کے مصنف کے نام و نشان کا پتہ نہین ان دونوں کتابوں کے مضامین ملتے جلتے ہین اپنی تصنیف میں اوس نے بھکتی دور کی ہندی کا استعمال کیا ہے ۔

تلسی داس کی رامایں شمالی ہند کے ہر ہندو کے (علاوہ چند سنسکرت دان پنڈتوں کے) دل میں بڑی وقعت اور عزت رکھتی ہے اور اس کو ہندؤں کی بائبل تصور کرتے ہین ۔

رامایں کی خصوصیات یہ ہیں کہ اوس کی طرز ادا نہایت اخلاق اور مضامین نہایت سادے اور سلیس ہیں ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے وہ ہر طرح بلند پایہ ہے ۔

تلسی داس کی زبان مشرقی ہندی کی اودھی زبان ہے وہ بعض اوقات برج بھاشا کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے ۔ وہ فطرت کا بڑا عاشق تھا اور متعدد مقامات

پر اوس نے منظر و فطرت نگاری کی ہے گویا اوس کو ہندی کا ورڈسورتھ (Wordsworth) کہہ سکتے ہین ۔

قصہ سات باب یا کانڈ مین تقسیم کیا گیا ہے جن مین دوسرا یعنی اجودھیا کانڈ نہایت اہم ہے جس مین رام جی کی جلا وطنی کا واقعہ منظوم ہے ۔

تلسی داس کا مقصد راماین سے نہ صرف رام جی کے واقعات بیان کرنا تھا بلکہ رام جی کی پرستش کی ہدایت و تلقین بھی اسی ذریعہ سے کی گئی ہے ۔ اس کی اپیل یہ ہے کہ ہندو خود کو اس زبردست اوتار کی پرستش مین وقف کردین ۔ بحیثیت ایک شاعر کے اوس کا درجہ نہایت بلند ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو اس کی راماین اوسکی عالمگیر اور دوامی شہرت کے لئے کافی ہے ۔ راماین کے علاوہ اوسکی اور بھی تصنیفات ہیں لیکن اون سب کا موضوع وہی ہے جو راماین کا ہے ۔ تلسی داس کے بہت سے پیرو بھی پیدا ہو گئے تھے جنھون نے رام جی اور اون کے متعلق عقاید پر بیش بہا تصنیفات کی ہیں ۔

کبیر کا جانشین

۱۵۰۰ تا ۱۸۰۰

کبیر نپتھیز | کبیر کی تلقین اور وعظ و نصیحت کا زبردست اثر اس کے متبعین کی بڑی تعداد سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کبیر پنتھیون کے دو فرقے ہیں ۔ ایک کا مرکز بنارس اور دوسرے کا وسط ہند ہے ۔ گو کبیر نپتھیون میں بت پرستی کی سخت ممانعت تھی تاہم ہندؤن کے بعض رسوم کا اثر ان میں پایا جاتا ہے ۔ کبیر گو اوتار کا مخالف تھا لیکن اس کے پیرو خود اوسکو اوتار مانتے ہین بیجک (کبیر کی نظمون کا مجموعہ) اوسکی موت کے پچاس سال بعد مرتب کیا گیا ہے ۔ ایک مشہور کبیر پنتھی پالستو صاحب نام نے سنہ ۱۸۰۰ ء میں فروغ پایا اور کنڈلیا بحر میں نہایت موثر نظمین لکھی ہیں

سکھ | اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ھے کہ سکھ مذھب جس کا بانی نانک تھا کبیر کے اصول و عقائد کا ممنون ھے۔ نانک کے پیرو نو گرو تھے جو سب کے سب شاعر تھے۔ سکھوں کی مقدس کتاب آدی گرنتھ کو سنہ ۱۹۰۴ء میں گرو ارجن نے، جو چھٹے گرو تھے، ترتیب دی۔ اس میں تقریباً کل گروؤں کی تصنیفات پائی جاتی ھین۔ سکھون کے لئے یہ عبادت کی کتاب ھے۔ اسکی نظمین ھندی کی قدیم زبان مین ھیں اور بعض اوقات پنجابی زبان سے مخلوط پائی جاتی ھیں۔

دادو پنتھیز، جس کا بانی دادو تھا، کبیر کے اصول و عقائد کے اثر سے ایک فرقہ پیدا ھوا تھا۔

کبیر کے زیر اثر جو دیگر فرقے پیدا ھو گئے تھے وہ حسب ذیل ھیں:—

سیونارائنز، غریب داسیز، رام سائنز، جگ جیون داسیز، پران ناتھیز۔

ان سب فرقوں کے بانی اور ان کے چند پیرو شاعر تھے۔ اپنی ھندی تصانیف کے ذریعہ سے اپنے اپنے مذھب کی اشاعت کرتے تھے۔ اس دور کے شعرا بھی بھکتی شعرا کہلائے جا سکتے ھیں کیونکہ انہوں نے مذھی شاعری کی تھی۔

کرشنا بھکتی

(۱۵۵۰ — ۱۸۰۰)

سور داس | آشت چھپ (آٹھ جواھر) کا سب سے بڑا شاعر سور داس تھا۔ اوسکی زندگی کے حالات بہت کم اور مشتبہ ھیں۔ کہا جاتا ھے کہ وہ برھمن تھا اور بابا رام داس کا، جو اکبری دربار کا گویا تھا، بیٹا تھا۔ آٹھ سال کی عمر مین وہ اپنے والدین کے ساتھ متھرا گیا اور وھاں ایک بھکتی کا شاگرد بن گیا لیکن اوس نے ایک شرح مین خود کو چند بردئی کی اولاد سے بتایا ھے اور یہ کہ اوس کے باپ کا نام رام چندرا اور دادا کا نام ھری چندرا تھا جو آگرہ

مین رهتے تھے ۔ اوس کے چھه بھائی تھے جو سب کے سب مسلمانون کے مقابله مین جنگ مین کام آئے ۔ وه تنہا اندھا رهگیا ۔ اس نے کرشنا جی کو خواب میں دیکھا تھا اور تمام دنیا اس کو اندھیری معلوم ھوئی ، شاید اسی وجه سے وه خود کو اندھا کہتا تھا ۔ وه برج میں مقیم ھوگیا اور آشت چھپ کا پیرو بنگیا ۔ اس کی پیدائش سنه ۱۴۸۳ء اور وفات سنه ۱۵۶۳ء میں بتائی جاتی ھے لیکن یه تاریخیں غیر مصدقه ھیں تمام افسانے اس کے اندھے ھونے پر اتفاق کرتے ھیں، معلوم نہیں که وه پیدائشی اندھا یا بعد مین اندھا ھو گیا تھا ۔ بہرحال اس کو آگره کا اندھا شاعر کہاجاتا ھے ۔

سور داس اپنے اسٹائل اور طرز ادا کے لحاظ سے سب شاعرون پر فوقیت رکھتا ھے کرشنا اور رادھا کی پرستش میں اس نے بہت سی پاکیزه نظمیں لکھی ھین جو ایک مجموعه ,, سور ساگر ،، میں جمع ھین ۔ اس نے هندی میں نل و دمن کی کہانی نظم کی ھے ۔ هندی ادب میں سور داس کا بہت بڑا درجه ھے ۔ بعض لوگ اس کو اور بعض تلسی داس کو هندی کا سب سے زبردست شاعر مانتے ھیں هندی کی ایک مشہور بیت ھے جس سے ان کے درجون کا پته ملتا ھے جس کا مطلب یه ھے که ,, سور آفتاب ھے ، تلسی ماھتاب ھے ، کیساؤ داس تارے ھیں ، لیکن آج کل کے شعراء ایسے ھیں کے تھوڑی بہت روشنی ادھر آدھر ڈالتے ھیں،، تمام متقد میں شعراء کی خوبیاں اس ایک شاعر سور داس میں جمع ھو گئی تھین ۔ سلاست وروانی اس کا خاص شعار تھا ۔

بہاری لعل چوب بھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ھے اسی کرشنا بھکتی کا شاعر تھا ۔

دور چہارم یا جدید دور

از سنه ۱۸۰۰ء تا حال

انیسوین صدی عیسوی کی ابتدا سے هندی ادب میں مغربی تمدن کے اثر سے ایک نیا دور شروع ھوتا ھے ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو برٹش پارلیمنٹ کی جانب سے تاکید کی جا رھی تھی که سیاست ، تہذیب وتمدن کے ساتھه ساتھه هندوستانی ادب پر بھی تسلط حاصل کیا جائے ۔

هندوستان میں مطبع کے آجانے سے یہاں کے ادب کو کافی فروغ ہوا۔ ہندی ادب کے ساتھ ساتھ یہاں انگریزی ادب کی بھی جب اشاعت ہوئی تو غیر احساسی طور پر انگریزی ادب کا اثر ہندوستان کے ہر لٹریچر میں سرایت کرتا گیا۔ نہ صرف ادب بلکہ ہندوستان کی زندگی اور یہاں کے باشندوں کے خیالات بھی رفتہ رفتہ بدلتے گئے اور بدلتے جا رہے ہیں۔ برٹش حکومت کے امن و امان کی وجہ ہندی ادب نے خاصی ترقی کی۔ اٹھارویں صدی کی خانہ جنگیوں اور بدامنیوں کی وجہ سے ادبی پیداوار رک گئی تھی اور جب برٹش دور میں امن و امان قائم ہوا ادب کا بھی کافی چرچا ہوا۔ اس دور میں نئے ہندی ادب یا ہندی نثر کی ابتدا ہوئی۔ اسی طرح اردو ادب بھی اس وقت تک محض شعر و شاعری تک محدود تھا۔ ہندی کی طرح اردو میں بھی اسی زمانہ سے نثر کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔

للوجی لال

انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے صدر ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے جنھوں نے دوسرے یوروپین افسران کالج (کپتان لاکٹ، پروفیسر ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر) کی مدد سے ملکی ادب کے فروغ و اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ یوروپین افسروں کی اردو تعلیم کے لئے کتابیں منتخب ہوئیں اور ملکی ادیبوں کو لکھنؤ اور دھلی سے بلایا گیا جنھیں ترجمہ کے ذریعہ سے نئے ادب کی اشاعت کی رغبت دلائی گئی۔ تقریباً یہاں کے سب ادیبوں نے اردو زبان کی خدمت کی لیکن ان میں للوجی لال نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کی بھی خدمت کی۔ ان ادیبوں کی مترجمہ نثر کی کتابیں اگر سب سے پہلی نثر کی کتابیں نہیں تو کم سے کم سب سے پہلی ادبی نثر کی معیاری کتابیں ہیں۔ جن کی وجہ سے نثر لٹریچر کی ایک شاخ بن گئی ورنہ اس وقت تک نثر بہت کم مروج تھی۔

للوجی لال برہمن تھا جس کے خاندان کا تعلق گجرات سے تھا لیکن ایک عرصہ سے شمالی ہند میں متوطن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے حکم سے للوجی لال اور سدا ال مسرا نے جدید اعلی ہندی کی بنیاد ڈالی۔ جدید اعلی ہندی اس طریقہ سے بنائی گئی کہ فارسی اور عربی

الفاظ کو نکالکر ان کی جگہ سنسکرت یا ہندی کے الفاظ بٹھادئے گئے۔ اردو ھندؤں کی بول چال یا نثر کی خواھش کو پوری نہیں کرسکتی تہی، کیونکہ اس مین عربی و فارسی الفاظ کی بہتات تہی۔ اور ناخواندہ ہندو اس قسم کی اردو بول یا لکہہ نہین سکتے تہے، اس لئے ھندی بول چال یا نثر کی ایك زمانہ سے خواہش کی جارھی تہی جس کی تکمیل مغربی اثر کے تحت ھوئی اور جدید اعلی ھندی نثر اور بول چال کا بہترین آلہ بن گئی۔ اس سے قبل دھلی اور میرٹہ کی زبان کو کہڑی بولی کہتے تہے اور اسی زبان سے یعنی کہڑی بولی سے اردو (عربی و فارسی کی آمیزش کے ساتہ) اور اعلی ھندی (سنسکرت کی آمیزش کے ساتہ) پیدا ھوئی۔ معلوم ھوتا ھے کہ للوجی لال نے اسی کہڑی بولی کو قدرے شستہ کر کے ادبی نثر کے قابل بنادیا۔ اردو نے برخلاف اس کے عربی و فارسی کے علاوہ اس کہڑی بولی میں بعض پنجابی اور راجستانی کے الفاظ بہی شامل کرلئے۔ للوجی لال نے حقیقت میں ایك زمانہ کی خواھش پوری کردی۔ اور ھندی ادبی نثر پر اس کا بڑا احسان ھے کہ ایك اعلی یا معیاری ھندی کو وجود میں لایا۔ شمالی ھند کے ھندؤں نے اس کو اپنے ادب اور بول چال کا آلہ بنا لیا۔ یہ اعلی ھندی نظم میں استعمال نہیں کی جاتی۔ آج کل بہی نظم میں وھی برج بہاشا یا اودھی مستعمل ھے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ھے کہ جدید اردو اور جدید ھندی میں فرق یہ ھے کہ اردو نظم و نثر دونوں کے لئے یکساں مستعمل ھے لیکن اس کے برخلاف جدید ھندی صرف نثر کی خدمتگزار ھے۔

اب تك ھندی میں سوائے نظم کے نثر کی پیداوار بالکل معدوم تہی یا تہی بہی تو بہت کم۔ لیکن اس جدید اعلی ھندی کے وجود کے بعد کثیر تعداد میں ھندی نثر کی کتابیں طبع اور شایع ھونے لگیں۔ سب سے پہلی ھندی نثر کی کتاب یا وہ ھندی نثر جسکو معیار قرار دیا جاتا ھے للوجی لال کی "پریم ساگر" ھے جو "بہگوت پورنا" کی دسویں فصل کا ترجمہ ھے۔ پریم ساگر سنہ ۱۸۰۴ء میں شروع اور سنہ ۱۸۱۰ء میں ختم کی گئی۔ اس کے علاوہ

اور دو نثر کی کتابیں ,, سنگھاسن بیسی ،، اور ,, بے تال پچیسی ،، بھی للوجی لال کی تصانیف سے ھیں جو اردو اور ھندی کی مخلوط زبان میں لکھی گئی ھیں۔ ان نثر کی کتابوں کے علاوہ للوجی لال نے بہاری لال چوب کی ,, ستہ سئے ،، کی شرح بھی لکھی۔ اور برج بھاشا کی نظموں کا ایک گلدستہ بھی تیار کیا جو ,, سَبَھا بلاس ،، کہلاتا ھے۔

جدید دور کا ھندی ادب ھندی نثر کی کتابوں پر مشتمل ھے جو کثیر تعداد میں لکھی گئیں لیکن ان کے فروغ و اشاعت کا سہرا چھاپہ خانوں کے سر ھے۔ چھاپہ کی ایجاد نے نہ صرف ھندی ادب کو بلکہ ھندوستان کے ھر لٹریچر کو کافی ترقی دی۔ سب سے پہلا چھاپہ خانہ فورٹ ولیم کالج کا ھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۳۷ء میں دھلی میں ایک لیتھو گراف پریس قائم ھوا۔ اب ھندی ادب کا اس قدر کافی فروغ ھوگیا ھے کہ وہ اب ھندوستان کی مہذب اور شستہ ادبی زبانوں میں شمار کی جاتی ھے۔

ھریشچندرا مغربی اثر نے جہاں ھندی نثر کو ترقی دی وھاں ھندی نظم کے فروغ کو بھی نہیں روکا چنانچہ اس زمانہ کے ھندی شاعر ھریشچندرا نے بہترین ھندی نظمیں لکھی ھیں ان کی تعلیم بنارس کے کوینس کالج میں ھوئی۔ سولہ سال کے سن میں انہوں نے شاعری کی، اور ایک قادرالکلام اور کامیاب شاعر بن گئے۔ انہوں نے ۱۷۵ مختلف تصانیف لکھی ھیں جن میں (۱۸) ڈرامے ھیں۔ یہ ھندی میں ڈرامے کے موجد ھیں۔ انہوں نے تاریخ، اخلاق، مذھب، غرض ھر موضوع پر نظم و نثر دونو میں قلم اٹھایا ھے۔ ھندی ادب کے زبردست ادیبوں میں ان کا شمار ھے۔

لینن اور انقلاب روس

از

جناب غوث محی الدین صاحب رضوی متعلم ال ال ۔ بی

———:o:———

بالشویت نےجس قدر تیزی سے ترقی کی ھے اور جس قدر جلد مختلف ممالک میں اس کی اشاعت ھوئی ھے اس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملے گی ۔یہ لینن ھی کی شخصیت تھی جس نے ایك تھوڑی سی مدت میں تقریباً بیس کڑوڑ انسانوں کو اپنا پیرو بنالیا ۔ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۱۷ء میں ساری دنیا میں جسقدر لوگ بالشویت سے آشنا تھے اسکی تعداد ایك ھزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی ۔ اور جب ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء کو بالشویك انٹرنیشنل کانگریس میں نمائندگی کیلئے دعوت نامے تقسیم کئے گئے تو دنیا کے مختلف ممالک سے نمائندے اسمیں شریك ھوئے۔ یورپ کے ھر چھوٹے سے چھوٹے ملك کی اسمیں نمائندگی ھوئی ۔ حتی کہ آئرلینڈ اور ٹوکیو نے بھی جو قطبین کے فاصلہ پر واقع ھیں اسمیں حصہ لیا ۔

لینن کا اصلی نام ولاڈی میر یولیانوو (Vladimir- oulianoff) تھا اور وہ دریائے وولگا (Volga) کے کنارے قصبہ سمبرسك میں پیدا ھوا تھا ۔ لینن متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا تھا ، لڑکپن سے ھی وہ انقلابی خیالات رکھتا تھا ۔ ابھی وہ کمسن ھی تھا کہ اسکے بڑے بھائی کو ایك اعلی روسی عہدہ دار کے قتل کے الزام مین سولی دیگئی ۔ اس واقعہ سے والڈی میر کو اس طبقہ سے نفرت ھوگئی اور وہ اون لوگوں کا جانی دشمن ھوگیا ۔ اس کے بعد وہ فوراً ھی آزادی کی تحریك میں کود پڑا اور پٹرو گریڈ کی یونیورسٹی میں جہاں وہ کچھ دنوں بعد داخل ھوا تھا اس نے اپنے خیالات سے ایك ھل چل مچادی ۔ اس نے بغیر کوئی

ڈگری حاصل کئے یونیورسٹی کو خیر باد کہا ، اور کچھ عرصہ تک روس کی معاشی حالت پر کتابیں لکھنے میں مشغول رہا ۔ اس نے اپنے زور قلم سے تھوڑے ھی عرصہ میں روس میں کافی شہرت حاصل کرلی ۔ کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے اس نے اپنا نام نکولائی لینن رکھا اور یہی وہ نام ھے جس کو دنیا میں ھر شخص جانتا ھے ۔

اس وقت روس میں دو زبردست سیاسی جماعتیں تھیں ، ایک تو معاشری عمومی گروہ (Social democratic party) اور دوسری معاشری انقلابی گروہ (Social revolutionary party)۔ لینن معاشری عمومی گروہ کا رکن ھوگیا اور بہت جلد اس جماعت میں اپنا اثر قائم کرلیا ۔ اس جماعت کا ایک اور رکن پلیک ھانوو (Plekhanov) تھا جس کو اس وقت جمہوری دنیا میں بڑی عزت حاصل تھی ۔ اس جماعت کے بھی دو حصے ھوگئے ۔ ایک حصہ انتہا پسند ھوگیا اور دوسرا قدامت پرست رھا ۔ پلیک ھانوو قدامت پرستوں کا لیڈر تھا اور نوجوان لینن انتہا پسندوں کی رھنمائی کر رھا تھا ۔ سنہ ۱۹۰۲ع میں پلیک ھانوو اور لینن کے مابین جھگڑا ھوگیا ۔ لیکن پلیک ھانوو کو شکست ھوئی ۔ یہیں سے لفظ ,, بالشویک ،، کی ابتدا ھوتی ھے ۔ بالشویک کے معنے اکثریت کے ھیں ۔ چونکہ لینن کو کامیابی ھوئی تھی ، اور اکثریت اس کے موافق تھی ، اس لئے اس کی جماعت کو ,, بالشویک ،، کا نام دیا گیا ۔ شکست خوردہ جماعت کو ,, مینشویک ،، کا نام دیا گیا جس کے معنے اکثریت کے برعکس ھیں ۔ سنہ ۱۹۰۲ع کے بعد سے کچھ عرصہ تک لینن نے ایک متوسط درجے کے انقلابی کی طرح زندگی بسر کی ۔ اکثر وہ یا تو روپوش رھتا تھا یا جیل میں ۔ پولیس اکثر اس کی تلاش میں رھتی تھی اور جاسوس اس کی نگرانی کرتے رھتے تھے ، روس کے حالات ھر وقت اس کے پیش نظر تھے ۔ اس کے کڑوڑ ھا ھم وطن غلامی کی حالت میں نہایت ذلت سے زندگی گذار رھے تھے انہی حالات کے مطالعہ میں اس کی زندگی بسر ھو رھی تھی ، اور اعلے طبقہ سے اس کی نفرت دن بدن بڑھتی جا رھی تھی ۔ مغرب کے بہت سے مصنفین نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ھے کہ کیونکر روس میں یکدم ایسا انقلاب رونما ھوا ۔ بات بالکل صاف ھے ،

جس طرح ایك بیج سے درخت پیدا ہوتا ھے اسی طرح زار کی حکومت کے خوفناك مظالم نے لینن اور اس کی جماعت کو پیدا کیا۔ گو ان مظالم کا شکار روس کا ھر متنفس ھوا، لیکن لینن ھی وہ غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی تھا جس نے ان کے اظہار کی جرأت کی اور لوگوں کو حکومت کے آلٹ دینے پر آمادہ کیا۔ اس عرصہ مین ایك طرف تو وہ اپنے خیالات سے لوگوں مین ھیجان پیدا کر رھا تھا اور دوسری طرف وہ ان مظالم کے سدباب کیلئے کوئی راستہ ڈھونڈ رھا تھا۔

روس سے جلا وطن ھونے کے بعد وہ کچھ عرصہ تك فن لینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں رھا۔ فن لینڈ سے اس نے ایك انقلابی پرچہ اسپارك (Spark) نامی جاری کیا۔ ۱۹۰۵ع میں جب روس میں انقلاب رونما ھو رھا تھا تو وہ اس میں حصہ لینے کے لئے پھر روس پھونچا۔ لیکن انقلابیون کو ناکامی ھونے کے بعد وہ روس سے فرار ھو کر "کراکو" پھونچا جو آسٹروی علاقہ ھے، اور روس و آسٹریا کی سرحد پر واقع ھے۔ یہان پر وہ اطمینان سے زندگی بسر کر رھا تھا، اگرچہ آسٹریا اور جرمنی ھزارون سیاسی مجرمون کو جو ان ممالك میں پناہ گزین تھے گرفتار کر کے روس کے حوالے کر رھے تھے، اسکی وجہ اب تك معلوم نہ ھو سکی کہ لینن کو کیون نہین گرفتار کیا گیا۔ خیال ھے کہ خفیہ طور پر وہ آسٹریا یا جرمنی کی ملازمت مین داخل ھو چکا تھا اور شاید ان ممالك نے یہ محسوس کیا کہ لینن ان کے مفاد کے لئے بہترین آدمی ھے۔

وہ جرمنی دستاویزات (Documents) جو فرانسیسی حکومت نے شایع کئے ھیں اور جن کو "سفارتی دستاویزات قبل از جنگ" کا نام دیا گیا ھے اس واقعہ پر کسی قدر روشنی ڈالتے ھین۔ یہ دستاویزات جرمنی کے بہترین دماغون اور زبردست مدبرون نے تیار کی تھین۔ ان میں ایك اھم دفعہ یہ بھی تھا کہ چونکہ جنگ کا ھونا ناگزیر ھے اس لئے جرمنی کو اپنی کامیابی کے لئے ضروری ھے کہ وہ روس میں انقلابی جماعت کی خفیہ طور پر حمایت کرے۔ غالباً جرمنی کے جاسوسون نے جو اس وقت روس میں بکثرت تھے اپنی حکومت کو لینن اور اس کے عجیب و

غریب اصولوں کی اطلاع دی ہوگی اور اسی لئے وہ کراکو میں محفوظ رہا۔

انقلاب کی ناکامی اور روس میں خون کی ندیاں بہنے کے بعد وہ پھر فن لینڈ واپس ہوا، لیکن، تھوڑے ھی عرصہ بعد جب کہ حکومت کے خلاف ایک اور سازش کا انکشاف ہوا تو وہ فن لینڈ سے فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ پہونچا اور ایک عرصہ تک جنیوا میں مقیم رہا۔ اسی زمانے میں جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ ستمبر سنه ۱۹۱۵ ع میں جب کہ ”فان میکن سن“ (Von mackensen) سربیہ کو تباہ کر رہا تھا اور اتحادی فوجوں کو کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی لینن نے زمروالڈ میں جوبرن کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس نے ہر ملک سے نمائندے طلب کئے عام اس سے کہ کوئی ملک جنگ میں شریک تھا یا غیر جانب دار۔ جرمنی اور آسٹریا نے فوراً نمائندے بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی۔ فرانس کی طرف سے دو نراجی اس میں شریک ہوئے۔ بہت سے غیر جانب دار ممالک کی بھی نمائندگی ہوئی اور لینن نے خود روس کی نمائندگی کی۔

کانفرنس نے فوری صلح کیلئے ایک پروگرام مرتب کیا اور یہ تجویز کی کہ ہر اس ملک کے جو جنگ میں شریک ہے سارے مزدوروں کو چاهئے کہ آس وقت تک ایک عام هڑتال جاری رکھیں جب تک کہ ان کی حکومت صلح پر رضامندی ظاهر نہ کرے۔

اس میں شك نہیں کہ زمروالڈ کی کانفرنس کا انعقاد لینن نے خاص مقصد سے کیا تھا۔ اس کو بخوبی علم تھا کہ جب تک جنگ جاری رهیگی اس کو اپنے اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں سخت دقت اٹھانی پڑیگی۔ زمروالڈ نے ساری دنیا میں شہرت حاصل کرلی هر شخص کی زبان پر کانفرنس کا پروگرام تھا، لیکن لینن کو صلح کرانے میں ناکامی ہوئی۔ دوسرے سال لینن نے کینتھال میں ایک اور کانفرنس منعقد کی اور اس میں گذشتہ کی طرح ان ممالك کی نمائندگی ہوئی۔ اس کے بعد هی روس میں انقلاب پھوٹ پڑا اور لینن محسوس کرنے لگا کہ اب اس کے خیالات کو عملی جامہ پہنانیکا وقت قریب آگیا ہے۔

عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ لینن کو جرمنی سے مالی امداد مل رہی تھی - بہت سے دستاویزات بھی اس خیال کی تائید میں شایع کئے گئے ہیں - میرے خیال میں ان دستاویزات کی کوئی ضرورت نہ تھی - اگر لینن سے دریافت کیا جاتا تو وہ خود اس کے متعلق کافی ثبوت بہم پہونچاتا - اس نے کبھی ایسے معاملات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہ کی - وہ خود بغیر کسی پس و پیش کے کہا کرتا تھا کہ اس کو جرمنی سے مالی امداد ملی ہے - اور اگر کوئی دوسری حکومت بھی اس کو امداد دینا چاہتی تو وہ اس کے قبول کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتا - لیکن اس طرح اس کو جو رقم ملی وہ ساری پروپگنڈا میں صرف ہو گئی - اس نے اپنے ذاتی مصارف کیلئے ایک پائی بھی اٹھا نہ رکھی - اس کو اپنے خیالات کی اشاعت کیلئے روپے کی سخت ضرورت تھی ، نہ تو اس کے پاس دولت تھی اور نہ ان لوگوں تک اس کی رسائی تھی جو ایسے ذرائع رکھتے تھے ، اس لئے اس کو اپنے ملک کے دشمن سے مدد لینے میں کسی طرح کا اعتراض نہ تھا اور اگر ضرورت ہوتی تو لینن وہی روپیہ اسی دشمن کے خلاف استعمال کرنے میں بھی دریغ نہ کرتا -

جب وہ ایک شاندار موٹر میں بیٹھا ہوا روس جا رہا تھا تو یہی خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے - وہ متمنی تھا کہ بہت جلد اس کو کام کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنے نئے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالے - جرمن حکومت نے اس کو جلد از جلد آرام کیساتھ بغیر کسی خرچ کے روس پہونچا دینے کا وعدہ کیا - اس نے فوراً رضامندی ظاہر کی لیکن ساتھ ھی ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ اگر اسکو کامیابی ہو تو جرمن حکومت جو اس سے مستفید ہونا چاہتی ہے سب سے پہلے تباہ کردی جائیگی -

لینن اسوقت پٹروگریڈ پہونچا جب کہ قدیم حکمران خاندان کا زوال ہو چکا تھا اور ساری دنیا اس کامیابی پر محو حیرت تھی - کسی ملک میں انقلاب کی حالت ایک زبردست طوفان کی سی ہوتی ہے ، طوفان کے وقت جس طرح سمندر میں موجیں اٹھتی ہیں اور جس طرح

ایک موج کے بعد دوسری موج اس سے زیادہ بلند ہوتی ہے، یہی حالت ایک انقلاب کی بھی ہوتی ہے ۔ انقلاب کی ایک موج گذر چکی تھی اور دوسری موج جو آٹھنے والی تھی اسی پر لینن کی نظریں جمی ہوئی تھیں ، اسی پر آس کی کامیابی کا انحصار تھا اور وہ اس سے پوری طرح فائدہ آٹھانا چاھتا تھا ۔

آخر اس کا کیا مقصد تھا ؟ کیا وہ دولت کا طلب گار تھا ؟ تمام قابل اعتماد ذریعوں سے ثابت ہے کہ اس کو اس کی پروانہ تھی ۔ کیا وہ طاقت و حکومت چاھتا تھا ؟ کیا اس کے دماغ میں یہ خیال جاں گزین تھا کہ ساری دنیا کے مزدوروں کا بادشاہ بنے اور ایک ایسے زبردست علاقے پر حکومت کرے جس کا جرمنی خواب دیکھہ رہا تھا، یا ایک انوکھی قسم کی حکومت کا انوکھا بادشاہ بنے اور اس قدر طاقت و قوت حاصل کرے جس کی نپولین کو بھی حسرت رھی !

یہ باتیں اس کے خیال میں بھی نہ تھیں ، وہ صرف اپنے ملک کا بھی خواہ تھا ۔ اس کو کسی بات کا خوف نہ تھا ، اگر اس کی موت سے مزدور پیشہ طبقہ آزادی حاصل کرسکتا تو وہ ضرور موت کی خواھش کرتا ۔ اس کو جرمنی سے کوئی محبت نہ تھی وہ جرمنی سے آسی طرح نفرت کرتا تھا جس طرح دوسری حکومتوں سے ، اگر ایک شخص اس کی مدد کرتا اور بڑے نازک موقعہ پر اس کو موت کے منہ سے بچاتا تو تھوڑی دیر بعد ھی اگر ضرورت پڑتی تو لینن اس کے قتل کا حکم دینے میں دریغ نہ کرتا بشرطیکہ اس سے اس کے ” تصور عظیم “ یا نصب العین (Great Idea) کو کوئی فائدہ پھونچتا ، یہ تصور عظیم کیا تھا؟ مزدور پیشہ طبقے کا راج ۔ اس کے نزدیک وھی چیز اچھی تھی جو اس کام میں اس کی مدد کرتی اور وہ چیز قابل نفرت تھی جو اس اصول میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرتی ۔ اس کی کامیابی کیلئے قتل و خون جائز تھا ، جائدادی حقوق کی منسوخی اس کے لئے روا تھی ۔

غرض شہنشاھی کی تباھی کے بعد جب وہ پٹروگریڈ پھونچا تو اس نے فوراً معاشری عمومی گروہ کے انتہا پسند حصے (Left Wing) میں لیڈر کی حیثیت سے دوبارہ اپنی جگہ حاصل

کرلی ۔ اس کے ساتھ ھی وہ تمام روس کے مزدورں ، سپاھیوں اور کاشتکاروں کی قومی کونسل کا رکن بن گیا جو اس وقت روس پر حکمراں تھی ۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ روس کو جنگ سے علیحدہ کرے ، اس کے لئے لینن نے فوراً کام شروع کر دیا اور ھر جگہ شرکت جنگ کے خلاف پروپگنڈا ھونے لگا ۔

افواج متحدہ (Allied Armies) کیلئے یہ وقت بڑا نازک تھا اس لئے کہ تقریباً چوبیس لاکھ جرمن سپاھی روسی سرحد پر ریگا سے رومانیہ تک جنگ میں مصروف تھے۔ اگر روس ان کو مشغول رکھ سکتا تو ممالک متحدہ امریکہ کے جنگ میں شریک ھونے تک فرانسیسی اور برطانوی فوجیں مغربی سرحد پر مدافعت کرسکتی تھیں اور اگر روس جنگ سے علیحدہ ھوجاتا تو یہ چوبیس لاکھ سپاھی فوراً مغربی سرحد پر ٹوٹ پڑتے۔

لینن کے خلاف اتحادی جاسوس برابر پروپگنڈا کر رھے تھے ۔ اگرچہ شہنشاھی کے زوال کے بعد اس زمانے کی تمام کارروائیاں منسوخ سمجھی گئیں ، لیکن یہ جاسوس چاھتے تھے کہ کم از کم زار کی فوجی کارروائیاں برقرار رھیں ۔

زار کے بعد پہلی حکومت جو برسر اقتدار ھوئی وہ ملی کووکی جماعت تھی لیکن تھوڑے ھی عرصہ بعد پرنس لیوآف کی جماعت حکمراں ھوئی ، کرنسکی اس کا وزیر جنگ تھا۔ لینن نے اس جماعت کے خلاف پروپگنڈا شروع کیا ۔ حکمراں جماعت میں تقریباً تمام وزراء مالدار اور صاحب جائداد تھے ۔ لینن کو موقع مل گیا اور اس نے ان کے خلاف زھر اگلنا شروع کیا ۔

اب لینن نے اپنے مددگار کی حیثیت سے لیون ٹرٹسکی (Leon Tratskey) کو منتخب کیا جس کا اصلی نام لیون برانسٹین تھا۔ ٹراٹسکی لینن کا ھمنواء ھونیکے علاوہ زبردست مقرر تھا اور وہ ایک زمانے تک ممالک متحدہ امریکہ اور انگلستان میں رہ چکا تھا ۔ وہ تمام خیالات

جن کا اظہار یکم جولائی کے مظاہرے میں جھنڈیوں پر ہوا تھا ٹراٹسکی کے ہی زور قلم کا نتیجہ تھے۔

حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ موجودہ حکومت کو بیحد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، سویٹ الگ ناراضی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے وقت پر کرنسکی نے بڑی جراءت کی، اس نے حکم دیا کہ روسی فوجیں اس مقام پر فوراً حملہ کریں جہاں خیال کیا جاتا تھا کہ جرمن محاذ بہت کمزور ہے۔

اس میں کامیابی ہوئی، جرمن فوجوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، اس پر پٹرو گریڈ میں حکمران جماعت نے بڑی خوشی منائی۔ پلك ھانوو نے ایك زبردست تقریر کی اور بتایا کہ روس اسوقت تباہی سے بچ سکتا ھے، جب کہ جرمنی کو شکست ہوجائے۔ لیکن عوام پر اس سے کوئی اثر نہ ہوا ناراضی بڑھتی گئی اور بالشویکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

جرمن پروپگنڈا پوری سرعت سے کام کر رہا تھا اور لوگوں میں جنگ سے بد دلی پیدا کر رہا تھا۔ اس کی بین مثال یہ ھے کہ جب تھوڑے دن بعد ھی جرمن فوجوں نے حملہ کیا اور روسی سرحد میں بڑھتی چلی آئیں تو عوام نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ لینن کی قوت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا اور حکومت اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی تھی، اس کی مثال یہ ھے کہ ایك روز جولائی کے مہینے میں لینن اور ٹراٹسکی نے بالشویکوں اور تراجیوں کی ایك بہت بڑی تعداد کے ساتھ مظاہرے کے بہانے پٹرا ینڈ پال (Peter & Paul) کے قلعہ پر قبضہ کرنیکی کوشش کی، لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ عوام نے ان کا ساتھ نہ دیا، سڑکوں پر بیحد کشت وخون ہوا اور آخر حکومتی فوجوں نے اس جماعت کو شکست دی۔

یہ حکومت کی کیسی سخت غلطی تھی کہ جب لینن اور زینوو فرار ھوئے تو کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ ٹراٹسکی کو کچھ دنوں جیل میں رکھکر پھر رہا کر دیا گیا،

اور جب لینن واپس آیا تو کسی نے اس سے بازپرس نہ کی اور وہ جمعیت دستور ساز کا رکن منتخب ہو گیا۔

لیوو وزارت عظمی سے مستعفی ہو گیا اور اسکی جگہ الکزنڈر کرنسکی نے لی۔ یہ خیال کیا جاتا ھے کہ یہ یا تو کرنسکی کی کمزوری تھی یا اس کی حماقت کہ اس نے لینن اور ٹراٹسکی کو ان کی غداری کی کوئی سزا نہ دی، لیکن اگر دیکھا جائے تو کرنسکی نے وھی کیا جو وقت کے لحاظ سے مناسب تھا۔ اس وقت روس کی حالت بالکل عجیب تھی۔ عوام کا خیال تھا کہ آزادی تقریر ھر شخص کا حق ھے۔ یکم جولائی کے مظاھرے کے متعلق بھی لوگوں کا یھی خیال تھا کہ جو لوگ تقریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتے ان کو حق ھے کہ مظاھروں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کریں، چنانچہ گورنمنٹ کا بھی یہی خیال تھا۔ ھر شخص کو آزادی تقریر و تحریر حاصل تھی روزانہ ایسے ایسے مضامین اخباروں میں شایع ھوتے تھے جو انگلستان امریکہ فرانس وغیرہ میں ایڈیٹر کو سزا ئے قید سے کسی طرح نہ بچا سکتے تھے، کیونکہ ان کی نوعیت بیحد باغیانہ ھوتی تھی۔ جب کہ ایک روسی سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ ،،یہ تو جمہوری حکومت میں ھر شخص کا حق ھے،، لیکن اس کو اس بات کا علم نہ تھا کہ جمہوری حکومت کو بھی ملکی اور غیر ملکی دشمن سے بچاؤ کیلئے کچھ نہ کچھ قیود عائد کرنے پڑتے ھیں۔ اس وقت کرنسکی کو کسی مستقل فوج کی ضرورت نہ تھی جو ھر جگہ اس کو حکومت کے قیام میں مدد دیتی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ جرمن اور بالشویک پروپگنڈا کا سدباب کیا جائے جو اس وقت کرنسکی کے اختیار سے باھر تھا۔

غرض کرنسکی کے حکومت کی حالت بد سے بد تر ھوتی گئی اور اس میں بالشویک پروپگنڈا کی وجہہ سے روز بروز اضافہ ھوتا گیا اور آخر میں کارنیلوو کی بغاوت نے اس کی رھی سہی طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا۔

لینن کے مددگار برابر کام کر رهے تھے اور وہ وقت قریب آ پہنچا تھا جب که حکومت کو شکست دیکر بالشویك حکومت قائم کی جانے والی تھی ، پٹروگریڈ میں جمیعت دستور ساز کا انعقاد هونے والا تھا ، ایك دستور مرتب کیاجانے والا تھا جمیعت کے نمائندے جو روس کے تمام مرد اور عورتوں کی آزاد رائے کے تحت منتخب هوئے تھے حکومت کے ایسے طریقه پر بحث کرنے والے تھے جو قابل نفاذ هو ۔ لینن کو معلوم تھا که یہاں پر اس کی آواز صدابه صحرا ثابت هوگی ۔ جب دستور کے مرتب هونے کے بعد ایك دفعه حکومت قائم هوجاتی تو پھر لینن کے لئے کوئی موقع نه تھا ۔ لوگ ضرور اسی حکومت کا ساته دیتے کیونکه وہ ان هی کے نمائندوں کی بنائی هوئی تھی اور پھر اسی حکومت کو آلٹنا معمولی بات نه تھی ۔ کم از کم یه اس کی زندگی میں ناممکن تھا اس لئے یہی موقع وار کرنے کا تھا ۔

لینن اس وقت نپولین سوم کی تقلید کرنا چاهتا تھا ، لیکن دونوں میں بین فرق تھا نپولین سوم کم از کم فرانس میں سیکڑوں طرفدار رکھتا تھا ، لینن کے پاس کچھ نه تھا سوائے اس کے که قومی کونسل میں (۱/۶) اور پٹروگریڈ سویٹ میں (۱/۱۰) اسکے ساتھی تھے اس سے زیادہ نه تو اسکے طرفدار تھے اور نه هونیکی امید هو سکتی تھی لیکن وہ روس کی بہتری چاهتا تھا اور اس کے لئے اپنی جان تك قربان کرنے تیار تھا ۔

لینن کو پٹروگریڈ اور ماسکو کی فوجوں پر کامل اعتماد تھا ۔ لینن کی کوششوں نے ان میں سے تقریباً نو دفی صد کو بالشویك بنا دیا تھا ۔ اسکو ان مقامات کے شہریوں سے بھی قوی امید تھی که اگر وہ اسکا ساته نه دینگے تو کم از کم همدردی کا اظہار ضرور کرینگے ۔ پٹروگریڈ صنعتی مرکز تھا اور ایك عرصه سے برابر ترقی کر رها تھا ، یہی حال ماسکو اور کائف کا تھا ۔ ان شہروں میں چونکه آبادی کا تعلق کسی نه کسی طرح پر صنعتوں کی پیداوار اور انکی تقسیم سے تھا اس لئے ممکن تھا که یه لوگ اسکا ساته دیتے یا اس سے همدردی کرتے ، اس کے سوائے لینن کا کوئی اور سہارا تھی نه تھا کاشتکاروں سے اسکو کوئی توقع نه تھی اسکی ساری همدردی

مزدوروں کے ساتھ تھی اور سارے فائدے ان ھی کے لئے مخصوص تھے۔

پٹرو گریڈ کے تمام شہری لینن کے ساتھ تھے۔ ھر نئے انتخاب کے وقت بالشویکوں کی تعداد بڑھتی جارھی تھی حکومت کے تمام دفاتر پٹرو گریڈ میں تھے، بہ الفاظ دیگر حکومت کی پوری مشین بغیر کسی محافظ کے اسکے دشمنوں میں گھری ھوئی تھی۔ ایک مرتبہ اسکی کوشش بھی کی گئی تھی کہ فوجوں کو وھاں سے کسی محفوظ مقام پر منتقل کردیا جائے، لیکن سخت اندیشہ تھا کہ اگر انکو وھاں سے منتقل کرنے کی کوشش کی گئی تو ساری فوج باغی ھو جائیگی۔ اگر اسوقت دارالخلافہ تبدیل کردیا جاتا اور اس کے بجائے حکومت ماسکو چلی جاتی تو شاید وہ تباھی سے بچ جاتی۔

۷ نومبر کو صبح سے کسی قدر پہلے بالشویک سپاھیوں نے پلوں پر قبضہ کرلیا، اور آمدورفت منقطع کردی۔ تھوڑی دیر بعد جب ٹیلیفون کے دفتر اور فوجی ھیڈکوارٹر ان کے قبضہ میں آگئے تو انہوں نے پٹرو گریڈ کی گلیوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔ میارنسکی اور زار کے قدیم سرمائی محل میں حکومت کے دفاتر تھے۔ بالشویکوں نے حملہ کرکے میارنسکی سے جمہوریہ کی کونسل کو نکال باھر کیا جو وھاں اجلاس کر رھی۔ تھی تھوڑی دیر بعد سرمائی محل کا محاصرہ ھوا اور اس پر قبضہ کرلیا گیا۔ سوائے کرنسکی کے حکومت کے تمام وزراء وھاں موجود تھے کرنسکی کو بروقت اطلاع ملنے کی وجہ سے وہ وھاں سے فرار ھوچکا تھا۔ ان تمام کو گرفتار کرنے کے بعد پٹیر اینڈ پال کے قلعہ میں مقید رکھا گیا جن میں سے بعض کو گولی مار دی گئی اور بعض وھاں سے فرار ھوکر روس کی سرحد سے باھر نکل جانے میں کامیاب ھوگئے۔

جوں ھی کہ سرمائی محل پر قبضہ ھوا بالشویکوں نے مزدور پیشہ طبقے کے راج کا اعلان کردیا جس کا صدر خود لینن تھا۔ اگر کہیں اس کی مخالفت ھوئی تو بالشویک سپاھیوں نے مشین گن اور بندوقوں سے مخالفین کا سر کچل دیا۔ اکثر لوگوں کا خیال

ہے کہ یہ انقلاب زیادہ خونی نہ تھا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے ، بلکہ نہایت خونریز لڑائی کے بعد حکومت کی فوجوں نے ہتیار ڈالے تھے -

غرض بالشویکوں کو فتح نصیب ہوئی اور لینن نے فوراً اپنی کابینہ مرتب کی - بجائے وزیر کے کابینہ کے اراکین کیسمریز کہلانے جانے لگے - لینن سب کا صدر تھا اور ٹراٹسکی وزیر خارجہ -

بالشویک طاقت جب پیٹروگریڈ میں کسی قدر محفوظ ہو گئی تو چار روز بعد ہی ماسکو میں بھی یہی واقعات رونما ہوئے اور لینن اور ٹراٹسکی اب آئندہ کے لئے پروگرام مرتب کرنے میں مشغول ہو گئے ، ان کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ صلح ہو جائے - صلح کے پردے میں وہ روس کو جنگ سے علحدہ کرنا چاہتے تھے - چنانچہ بہت جلد برسٹ لیٹیووسک (Brestlitousk) کے صلح نامہ پر دستخط ہو گئے -

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ لینن اور اس کی مختصر سی جماعت نے بڑی چالاکی سے کرنسکی کی حکومت کا تختہ آلٹ دیا - سارے روس میں بالشویک بہت تھوڑی تعداد میں تھے اور قومی سوویٹ میں بھی ان کی تعداد بہت کم تھی ، یہی حال سوویٹ مرکزی عاملانہ کمیٹی میں بھی تھا ، البتہ پیٹروگریڈ کے سوویٹ میں ان کی اکثریت تھی ، لیکن پیٹروگریڈ سوویٹ ایک شہری کونسل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی ، اور قوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا - ان باتوں کو محسوس کرتے ہوئے لینن نے سب سے پہلے یہ احکام اجرا کئے کہ سوائے نخرس سرخ (Red Gaurds) کے سب لوگ بے ہتھیار ہو جائیں اور بقیہ تمام فوج تخفیف کر دی گئی - لینن کو ڈر تھا کہ اسکے خلاف کہیں کوئی سازش نہ ہو - اسکے بعد اس نے جمعیت دستور ساز کو برخواست کرنیکی کوشش شروع کی جو تمام روسیوں کی رضامندی سے قائم ہوئی تھی -

۱۸ جنوری سنه ۱۹۱۸ ء کو جمعیت دستور ساز کا اجلاس ہوا اسکے لئے تاریخ بہت پہلے مقرر ہو چکی تھی مگر اسکے اکثر ممبر لینن کے حکم سے گرفتار کرلئے گئے تھے، اسلئے اسکے انعقاد میں برابر تعویق ہو رہی تھی - ۱۶ جنوری کو جمعیت کی نشست سے دو روز قبل لینن نے ایک سنسنی خیز اعلان کیا اور ہر جگہ اسکی اشاعت ہوئی اس میں شہریوں کو مخاطب کیا گیا تھا اور لکھا تھا "شہریو انقلاب خطرے میں ہے اپنی محافظت کرو وغیرہ وغیرہ"۔ لینن کو ڈر تھا کہ کہیں ایک دوسرے انقلاب کے ساتھ ہی پرانی حکومت پھر برسر اقتدار نہ ہو جائے اس لئے اس نے پٹروگریڈ میں بھی مظاہرے وغیرہ خلاف قانون قرار دئے۔ ایسی خوف وخطر کی حالت میں اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا، مگر فوراً اس کا پتہ چل گیا کہ بالشویک بہت کم تعداد میں ہیں۔ اس پر جسقدر بالشویک تھے سب کے سب اسمبلی ہال سے باہر نکل آئے، باقی اراکین نے وہیں بیٹھ کر بحث مباحثہ جاری رکھا لیکن بہت جلد بالشویک سپاہیوں نے ان لوگوں کو جبراً نکال باہر کیا جو حقیقی معنوں میں اسکی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد روس میں جمہوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

لینن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو چکی تھی کرنسکی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا ایک نئے سویٹ کا انتخاب عمل میں آنیوالا تھا اور لینن اپنی مرضی کے موافق انتخاب عمل میں لانا چاہتا تھا۔

لینن کی حکومت اشتراکی اصول پر مبنی تھی۔ تمام اہم کاروبار گورنمنٹ کی ملک قرار دئے گئے، بنکوں اور کارخانے پر حکومت کے قبضے کا اعلان ہو گیا، مسلح سپاہیوں نے بنکوں کا محاصرہ کرکے ان پر قبضہ کر لیا، آمریت کے کارندوں نے کارخانے کے مالکوں کو اطلاع دیدی کہ اس وقت سے تمام کارخانے حکومت کی ملک ہیں اور جمہوریہ سویٹ کے مفاد کیلئے ان پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ عالیشان مکانوں سے وہ لوگ جو مالدار اور صاحب جائداد تھے نکال باہر کئے گئے اور یہ مکانات سپاہیوں اور مزدوروں کیلئے وقف کر دئے گئے۔

نومبر سنہ ۱۹۱۷ء میں لینن کی کامیابی پر دنیا محو حیرت تھی، لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی اگرچہ اس کے ساتھ عوام کی بہت کم تعداد تھی لیکن اس کے مددگار غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے اور ان کے پاس حکومت کو آلٹ دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

انقلاب نے ہر شخص میں بیداری پیدا کردی تھی، زار کی حکومت کا خاتمہ ہونے کے بعد ہر شخص اپنے آپ کو آزاد سمجھ رہا تھا، غلامی سے ایکدم آزادی ہر شخص کے لئے واقعی تعجب خیز تھی، مملکت روس شہنشاھی سے جمہوریت میں تبدیل ہوچکی تھی، روس جو صدیون سے مردہ تھا اس کے بے جان جسم میں دوبارہ جان پڑگئی تھی، گذشتہ زمانے کی تاریکی دور ہورھی تھی اور روشنی کے آثار پیدا ہوچلے تھے۔ حکومت نئے اصولون پر چل رہی تھی، سوسائٹی میں وہ باتیں باقی نہ رھی تہیں جو زار کے زمانے میں تہیں۔ ان کی زندہ دلی پھر عود کر آئی تھی اور وہ چاھتے تہے کے ہر شخص ان کی طرح آزاد ہوجائے۔

لیکن کٹڑوڑون آدمی اس تبدیلی کے سمجھنے سے قاصر تہے۔ صدیون سے ان کے مالکون نے انکو جاھلیت اور تاریکی میں رکھا تہا تاکہ وہ کبھی بغاوت نہ کرسکیں اور ان لوگون کے غلام بنے رہنے کی وجہ سے ان کے مالکون کو کوئی تکلیف نہ پہونچ سکتی تھی۔ یہی وہ زمانہ تہا جب کہ لینن نے ان لوگون کو بیدار کرنا شروع کیا اس نے بتایا کہ اس کے نئے اصولون کے تحت ہر شخص آزاد ہوجائیگا۔ اس کا نظریہ بے حد وسیع تہا، وہ نہ صرف روس کو بلکہ بنی نوع انسان کو غلامی کی زندگی سے نجات دلانا چاھتا تہا۔ ان باتون نے عوام کے دل پر اثر کیا اور ایك بہت بڑی تعداد اسکا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئی کیونکہ ان کو آزادی ملنے والی تھی، انکو اسبات کا موقعہ ملنے والا تہا کہ اپنے قدیم مالکون سے ان کے بے رحمانہ سلوك کا بدلہ لیں، آزادی کا احساس ان کے دلون میں پیدا ہوچکا تہا اور نکولائی لینن انکا رہبر تہا۔

اس کے ساتھ ھی اور بھی کئی ایك وجوھات تھیں روس جنگ سے بیزار

ہو چکا تھا اس کے لئے اب جنگ میں کوئی دلچسپی باقی نہ تھی، خود زار روس کے زمانے میں لاکھوں آدمی جنگ میں کام آ چکے تھے، پھر بھی ان کے مالک کے دل میں رحم کا نام نہ تھا شہنشاہی کے زمانے ہی میں حالات ابتر ہو گئے تھے۔ ماسکو اور پیٹروگریڈ میں لاکھوں آدمی فاقہ کر رہے تھے اور ذرا سی غذا کے بدلے ہزاروں قسم کی سختیاں جھیلنے آمادہ تھے۔ اس کے بعد ہی لینن نے قیام امن کی جد و جہد شروع کر دی۔

جنگ عظیم کے پہلے ہی سے روس کی معاشی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی یہاں کی تقریباً اسی فی صد آبادی کا دارو مدار زراعت پر تھا اور دن بہ دن انکے گلے میں پھانسی کا حلقہ تنگ کیا جا رہا تھا، ریلوں اور ذرائع نقل و حمل کی حالت تباہ تھی، اور دن بہ دن اس میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ پرنس لیوو کی حکومت نے اس پر غور ضرور کیا لیکن اسکو مطلق فرصت نہ ملی اور بہت جلد اسکی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کا یہ خیال تھا کہ یہ تمام برائیاں جنگ کا نتیجہ ہیں۔ یہ زار روس کی وہ جنگ تھی جس سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی، یہ وہ جنگ تھی جس نے روس کی ساری زمین کو خون سے رنگ دیا تھا۔ ان کی نظریں لیوو پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ فوراً صلح کا اعلان کریگا۔ لیکن اس کی حکومت نے جنگ کے جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ اسکے بعد ہی لینن آیا اور اس نے فوراً صلح کا اعلان کیا جو اس کے خیال کے مطابق سب سے پہلی چیز تھی۔ عوام نے اس اعلان کا دلی خیر مقدم کیا۔

قدیم حکومت کے تحت روس روئے زمین پر بد ترین ملک تھا تقریباً نود فی صد آبادی کی زندگی آلام و مصائب سے پر تھی، ہر چیز پر خوف طاری تھا، شاہی خاندان کے ظلم وستم کی کارروائیوں سے جو ان کو ورثے میں ملا کرتی تھیں ہر شخص کانپ اٹھتا تھا۔

اس خاندان کی غلامی کا خونی طوق اٹھارہ کڑوڑ آدمیوں کی گردنوں میں پڑا ہوا تھا۔ اور ان لوگوں نے کبھی بھول کر بھی انبساط و مسرت کا منہ نہ دیکھا تھا۔ اگر بغیر

کسی انقلاب کے یہ ظلم و ستم یوں ہی جاری رہتا تو پھر قدرت کو اپنے اٹل قوانین بدلنے پڑتے - خود عوام بھی خوف و دہشت کے نظارہ دیکھتے ہوئے سخت دل ہو گئے تھے - حکومت ان کی نظروں میں ایک ایسی خوفناک مشین تھی جس کے نزدیک ہزاروں آدمیوں کو سولی چڑھانا یا سائبیریا میں جلا وطن کر دینا بہت معمولی بات تھی - اس کے بعد ہی لینن آیا اور اپنے اصول یعنے "مزدور پیشہ طبقہ کا راج" کی اشاعت سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا - آمریت سے وہاں کے لوگ بخوبی واقف تھے - لیکن یہ آمریت بالکل برعکس تھی - اس دور حکومت میں ان کے قدیم مالک ان کے مساوی تھے - ہر شخص اس چیز کا خواہاں تھا مگر وہ اس کو ناممکن خیال کرتے تھے -

لینن قوم کی رہبری کر رہا تھا ، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کے اصول کیا تھے "مزدور پیشہ طبقہ کے راج" سے کیا مراد تھی ،اس کا جواب بے حد مشکل ہے - روس کی پوری تاریخ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی ، یہی وہ باب ہے جہاں ہر شخص کی زبان خاموش ہے -

این ٹرالسکی کی کتاب (The Bolsheviki and The World Peace) "بالشویک اور امن عالم" میں ہر چیز کا نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان ہے - اس کتاب میں مسئلہ بلقان پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے - اشترا کی سیاسیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے - بین الاقوامی معاملات پر بے حد مواد مل سکتا ہے - اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ بالشویزم کے اصول -

آج کل بھی اگر اس کے متعلق تلاش کی جائے تو بہت کم مواد ملتا ہے - خود لینن کے مضامین جو بہت پر زور الفاظ میں حکومت کی مذمت کرتے ہوئے تبدیلی کی تعلیم دیتے ہیں اس کے اصولوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے -

مس لوئی برائنٹ (Miss Louise Brient) نے ایک معرکتہ الارا کتاب

("Six Red Months in Russia") ,, روس میں چھہ خونی مہینے ،، لکھی ھے - اس کتاب سے بالشویك تاریخ کا یکم فبروری سنه ۱۹۱۸ء تك پته چلتا ھے - اسمیں بالشویك حکومت کا ذکر ھے لیکن اس کے اصولوں کا پته نہیں البرٹ رئس ولیمس (Aebert Rhys Williams) نے ایك بہترین پیمفلٹ ,, بالشویك اور سوویٹ ،، (The Bolshevikl the Soviet) لکھی ھے - اس میں سوال وجواب کے پیرایه میں لینن کے طرز حکومت پر کسیقدر مواد ھے - لیکن اس میں بالشویك نقطه نظر سے سوسائٹی کا کوئی ذکر نہیں ھے -

اب سوال یه ھے که کیوں روسیوں نے ان کی حکومت کو برقرار رکھنے پر رضامندی ظاھر کی ، اس کی وجہہ یه ھےکه یه قابل لوگ ثابت ھوتے اورآنہوں نے قوم کی ضروریات کے موافق حکومت کی بہت سے بالشویك لیڈر معمولی درجه کے آدمی تھے جو قوم کی ضروریات اور ان کی تکالیف کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے - سرمایه داروں نے ان کو قاتل اور جرمن کارندوں کا خطاب دیا تھا - روسی قوم بخوبی واقف تھی که یه الزام بالکل غلط ھے - اور بالشویك لیڈر بے حد دیانتدار اور وطن کے لئے اپنی جان قربان کرنے ھر وقت تیار ھیں -

مس بیسی بیٹی (Miss Bessie Beathy) کی کتاب ,, روس کا سرخ دل ،، (The Red Heart of Russia) میں ان واقعات پر کافی روشنی ڈالی گئی ھے - اس میں بتایا گیا ھے که کس طرح ھر شخص کو اس حکومت کے تحت اس کا برابر حصه دیا گیا اور ھر قابل آدمی کے لئے کس قدر ترقی کی راہیں کھولدی گئیں -

وہ دستاویز جو بالشویك حکومت نے جمعیت دستور ساز کے سامنے پیس کی حسب ذیل تھی -

اس میں مزدور پیشه طبقه کے حقوق کو منوایا گیا تھا اور روس کو مزدوروں ،

اوقات غیر معمولی جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس میں روسی مرکزی عاملانہ کمیٹی کے لئے انتخابات عمل میں آتے تھے جو حقیقی معنوں میں روس پر حکمران ہوتی تھی۔ دوسرے شعبوں کے لئے ۱۷ نمائندہ منتخب کئے جاتے تھے یہ لوگ مرکزی کمیٹی کے سامنے ذمہ دار ہوتے تھے جو خود روسی کانگریس کے سامنے ذمہ دار ہوتی تھی۔ روسی کانگریس اور مرکزی کمیٹی اہم اور خارجی معاملات کا تصفیہ کرتے تھے۔ ہر شہر، ضلع، اور قصبہ میں بھی سوئٹ کانگریس تھی جس طرح کہ مرکزی حکومت میں روسی کانگریس کی ایک مرکزی عاملانہ کمیٹی تھی اسی طرح ہر شہر ضلع اور قصبہ میں بھی ایک عاملانہ کمیٹی تھی اپنے اپنے علاقہ کی حد تک یہ کانگریس پورے اختیارات رکھتی تھی، اور عاملانہ کمیٹی ان اختیارات کو عمل میں لاتی تھی۔ انہیں نمائندوں کی تعداد آبادی کے مناسبت سے ہوتی تھی اور ان کے نمائندہ تین ماہ کے لئے منتخب ہوتے تھے۔ شہروں میں اس کے اجلاس ہفتہ میں ایک مرتبہ اور قصبوں میں ہفتہ میں دو مرتبہ ہوا کرتے تھے۔

دفعہ ۴۔ یہ دفعہ حق رائے دہی سے بحث کرتا ہے۔ حق رائے دہی بغیر کسی قید کے حسب ذیل شہریوں کو عطاء کیا گیا۔ ہر وہ شخص جو جائز طریقے پر محنت کرکے روپیہ کماتا ہو اس میں مکانوں کی نگرانی کرنے والے اور مٹی اٹھانے والے بھی شامل تھے، سوئٹ حکومت کے تمام سپاہی اور ملاح اور تمام وہ شہری خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جو محنت کرنے کے ناقابل ہوں، ہر مرد اور عورت اٹھارہ سال کی عمر کو پہونچنے کے بعد رائے دینے کے مجاز گردانے گئے۔ حسب ذیل شہری نہ تو رائے دیسکتے تھے اور نہ ان کو حکومت میں کوئی دخل تھا۔ وہ لوگ جو مزدوروں سے کام لیکر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتے تھے وہ لوگ جن کو بغیر کسی محنت کے کافی آمدنی حاصل کرتے تھے مثلاً روپیہ سود پر قرض دینا، خانگی سوداگر وغیرہ، ہر مذہب و ملت کے پیشوا، قدیم زمانہ کے جاسوس اور پولیس کے سپاہی اور قدیم شاہی خاندان کے ارکین ناقابل رائے دہی قرار دئے گئے۔

علاوہ ازیں وہ لوگ جو قانوناً نا قابل رائے دھی قرار دئے گئے ہوں مثلاً دیوانے یا وہ لوگ جو کسی شخص کی نگرانی یا حفاظت مین ہون ، یا وہ لوگ جن کو کسی شہر یا قصبہ کی سوئٹ نے بعض خود غرضانہ افعال یا حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں شہری حقوق سے محروم کردیا ہو ، اور یہ اس زمانہ تك حق رائے دھی سے محروم رھتے تھے جب تك کہ ان کی سزا کی میعاد ختم ہو۔

لینن کے اصول میں جو کچھ بھی خامیان تھیں وہ بنیادی تھیں اور ان کا علاج ممکن نہ تھا۔ غور کرنے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں بے حد مشکلوں کا سامنا تھا۔ اس میں کوئی شك نہیں کہ وہ بالکل بے غرض تھا ، موجودہ حکومت کی غلطیوں کی اصلاح کرنا چاھتا تھا اور ملك کی معاشی ترقی کا خواھاں تھا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاھئے کہ صرف مزدور پیشہ طبقہ ھی پیدائش دولت کا ذریعہ نہیں ھے۔ ھر شخص جو پیدائش دولت میں ذرا بھی ھاتھ بٹاتا ھے اس کو اس نظریہ کے تحت نکال باھر کرنا خلاف انصاف ھوگا۔

یورپ کے بڑے بڑے صنعتی مرکزوں میں بھی مزدوروں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کیجاتی ، ان کی حالت بھی تقریباً وھی ھے جو دوسرے ممالك کے مزدوروں کی ھے۔ اس لئے اس تفریق اس کو مٹا کر مزدور پیشہ طبقہ کی حکومت قائم کرنے کا جو خیال پھیلا ھوا تھا اس کا تجربہ روس میں کیا گیا ، اسی لئے ابھی ھم اس کو ایك تجربہ سے زیادہ اھمیت نہیں دے سکتے۔

اس میں شك نہیں کہ لینن زیادہ غور و فکر کا عادی تھا لیکن اس نے انسانی فطرت کو سمجھنے میں کسی قدر غلطی کی ، اس کو یقین تھا کہ روس میں اسکو کامیابی ھونے کے بعد دنیا کے سارے مزدور اٹھ کھڑے ھونگے ، اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر کے روس کی تقلید کرینگے ، لیکن یہ صرف لینن کا خواب تھا جو کبھی عملی جامہ نہ پہن سکا۔

سپاہیوں اور کاشت کاروں کی جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا گیا تھا اس کی رو سے خانگی جائداد کے اصول کو مٹا دیا گیا اور بغیر کسی معاوضہ کے کل ایسی جائداد کو عوام کی ملک تسلیم کیا گیا، جس پر ہر شخص کو حق حاصل تھا۔

تمام جنگلات، معدنیات پانی کے خزانہ اور وہ تمام چیزیں جو معاشی لحاظ سے کچھ اہمیت رکھتی تھیں قومی ملک قرار دی گئیں، اور تمام کارخانہ، ریل اور ذرایع نقل و حمل سوئٹ کی نگرانی میں لے لئے گئے۔ سارے بنک جمہوریہ سوئٹ کی ملک قرار دئے گئے، جس سے مقصد یہ تھا کہ فلاکت زدہ عوام کو سرمایہ داروں سے نجات دلائی جائے۔ لیکن مالکان بنک کو کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔

محنت جبری قرار دی گئی۔ اس سے ان لوگوں کا طبقہ جو مفت کی روٹی کھاتا تھا رفتہ رفتہ غائب ہونے لگا۔ اور ہر شخص پر معاشی زندگی کی اہمیت روشن ہونے لگی۔ مزدوروں اور کاشت کاروں کو مسلح کیا گیا، اور سرمایہ داروں کے طبقہ کو بے ہتیار۔ تمام خفیہ معاہدات شایع کرا دئے گئے، تا کہ اس سے لڑنے والے ممالک کے مزدور اور کاشت کار آٹھ بیٹھیں، کسی طرح بھی اپنے ملک کو صلح کرنے پر مجبور کریں۔ سرمایہ داروں کی پالیسی کو ٹھکرا دیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ چند آدمی لاکھوں آدمیوں کو غلام بنائے رکھیں۔ تمام بیرونی قرضے جو زار کی حکومت یا کرنسکی کی حکومت نے حاصل کئے تھے یک قلم منسوخ کر دئے گئے۔ جمعیت دستور ساز کو مجبور کیا گیا کہ وہ سوئٹ حکومت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے کیونکہ ۷ نومبر کی بالشویکوں کی کامیابی سے پہلے عوام اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ حکومت کے کسی ارادہ میں سرمایہ داروں کو جگہ نہیں دی گئی۔

حکومت کا دوسرا اعلان جو جمہوریہ سوئٹ کے دستور کی شکل میں ظاہر ہوا بہت طویل ہے۔ اس کے بعض اہم دفعات کا خلاصہ یہ تھا۔

دفعہ ۱۔ یہ مزدور پیشہ طبقہ کے حقوق کی حفاظت سے متعلق تھا۔ روس سوئٹ مزدوروں، سپاهیوں، اور کاشت کاروں کی جمہوریہ قرار دیا گیا اور ساری قوت اسی مرکزی ادارہ میں مضمر رهی جس مین ان تمام کے نمائندہ نشست کرتے تھے۔ اعلان کیا گیا کہ روسی جمہوریہ ایك آزاد قوم کے آزادانہ اتحاد پر مبنی ہے۔ لوگوں میں طبقہ وغیرہ کا کوئی فرق نہ رکھا گیا، بلکہ سب مساوی کردئے گئے۔ حکومت نے اپنا یہ مقصد ظاهر کیا کہ وہ ایك اشتراکی معاشرہ قائم کرنا چاهتی ھے۔ انقلاب کو زندہ رکھنے کے لئے سرمایہ داروں کو حکومت سے بیدخل کردیا گیا۔ اور هر شخص کو اس بات کا حق دیا گیا کہ هر طرح سے اوس کو حکومت کے معاملات پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ھے۔

دفعہ ۲۔ اسکی رو سے تمام طاقت و قوت مزدور پیشہ طبقہ سے وابستہ کردیگئی شہرون یا قصبون میں رهتے هون۔ مذهبی معاملات سے سیاسی معاملات کو بالکل علحدہ کردیا گیا۔ مذهب کی تبلیغ یا اس کی مزمت کے لئے هر شخص کو آزادی عطا کی گئی۔ عالیشان مکانون کے لئے حکومت نے عوام کو ساری سہولتین بہم پهونچائیں، تاکہ عوام وهان پر آزادانہ طریقہ پر جلسہ کرسکیں اور حکومت کو ان کے خیالات کا علم هو۔ مزدورون یا کاشتکارون کی هر ایك انجمن کو مدد دینے کے لئے حکومت نے هر وقت آمادگی ظاهر کی اور اس بات کی بهی کوشش هونے لگی کہ هر شخص کو مفت تعلیم دی جائے۔ غیر ملکی لوگون کو بهی وهی حقوق عطاء کئے گئے، جو شہریون کو حاصل ھے بشرطیکہ وہ کوئی کام کررهے هون یا مزدور پیشہ یا کاشتکارون سے تعلق رکھتے هون، مگر سرمایہ دار نہون۔

دفعہ ۳۔ اس میں سیاسی معاملات پر روشنی ڈالی گئی ھے روسی کانگریس کی حیثیت سب سے اعلی قرار دیگئی اور ساری قوت اسی میں مضمر رهی، اس میں مقامی سوئٹ کے نمائندہ آتے تھے، سال میں کم از کم دو مرتبہ اس کا اجلاس هوتا تھا۔ بعض

زندگی
از
جناب علی حسنین صاحب زیبا متعلم بی۔اے

یہ نظم جشن یوم کلیہ کے بزم مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔
حاضرین بزم نہایت محضوظ ہوئے۔اور مہاراجہ بہادر نے
انعام عطا فرمایا۔

شاعر نے زندگی کی رنگا رنگی کو مختصر اور پر اثر الفاظ
میں پیش کر کے نظم کے حسن و خوبی کو دو بالا کردیا۔

نغمۂ غم اک ازل کے دن سے تھا بانسری میں عشق کی سویا ھوا
اک تبسم پر کسی کے چونک اٹھا
زندگی شاید اسی کا نام ھے

روح اک ذرّوں میں محو خواب تھی نور کے اوراق میں لپٹی ہوئی
تھرتھرا کر اس نے اک انگڑائی لی
زندگی شاید اسی کا نام ھے

اس قدر ظاھر کہ نظروں سے نہاں اتنی پوشیدہ کہ ھر شئے سے عیاں
راز ھونے پر بھی ھے جو داستاں
زندگی شاید اسی کا نام ھے

رقص میں جس طرح فانوس باور چھن رھا ھو جسکے ھر پہلو سے نور
مختلف رنگوں میں ھے جس کا ظہور
زندگی شاید اسی کا نام ھے

شاہ کی چین جبیں میں مستتر فلسفی کے تیوروں میں جلوہ گر
عاشقوں کا دل حسینوں کی نظر
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ایک حسرت اک دل خاموش میں ایک لرزش پیکر مئی نوش میں
ایک تجلی طور کے آغوش میں
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ایک مفلس بے نوا کے لب پہ آہ ایک منعم کا غرور عزّ و جاہ
ایک بت کافر کی دز دیدہ نگاہ
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ایک شعلہ آتشں رخسار کا ایک پھندہ گیسوئے خمدار کا
ایک سجدہ آستان یار کا
زندگی شاید اسی کا نام ہے

قطرۂ شبنم پہ لرزاں آفتاب بہتے پانی میں مچلتا ماہتاب
سرمدی دریا میں اک سرکش حباب
زندگی شاید اسی کا نام ہے

نوح تھے طوفاں میں جسکے ناخدا نغمۂ داؤد تھی جس کی صدا
تھی لب عیسی پہ جو شے معجزہ
زندگی شاید اسی کا نام ہے

پاسباں جس کا رہا رب جلیل شق ہوا جس کے لئے دریائے نیل
بن گئی آتش گلستان خلیل
زندگی شاید اسی کا نام ہے

کون فاراں میں یہ حشر انگیز ہے ذرہ ذرہ جوش سے لبریز ہے
نغمہ زن جس لئے میں نغمہ ریز ہے
زندگی شاید اسی کا نام ہے

شعبه قانون	۴۰ ف	۸	۳۹ ف	۲
جملہ	۴۰ ف	٦٦٨	۳۹ ف	٦٢٠

ان میں سے اکثر بلکہ تقریباً تمامتر طالب علم ریاست حیدر آباد کے هیں اور معتدبه تعداد اضلاع کے طلبه کی هے ۔ کلیۂ جامعۂ عثمانیه کو یه امتیاز حاصل هے که اس کے مسلمان اور هندو طالب علم ممالک محروسه کے هر گوشه سے آکر اس میں شریك هوتے هیں ۔

اس تفصیل کے ملاحظه سے واضح هو گا که سنه ۱۳۴۰ ف سے ایك نئی جماعت کا فتتاح هوا هے ۔ جس کی وجه سے آگے چل کر جامعه کو خصوصاً ،، اور ملك کو عموماً ،، گران قدر فائده پهنچنے کی قوی امید هے ۔ یه جماعت پوسٹ ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ یس سی ریسرچ کی هے جو بلا اضافه خرچ مندرجه موازنه زیر نگرانی مجلس تحقیقات کلیه قائم کی گئی هے ۔ مرهٹی ۔ تلنگی اور کنڑی مین حسب سابق بعد کامیابی امتحان بی ۔ اے هونهار طلبه کی ریسرچ زیر نگرانی پروفیسران متعلقه جاری هے ۔

شوقین طلبه کو جرمن زبان کی تعلیم کے علاوه فرانسیسی زبان کی تعلیم بھی دی جارهی هے ۔ فرانسیسی کی تعلیم اگرچه چند سال قبل جاری هوئی تھی بعض وجوه سے بند کردی گئی لیکن اب پھر جاری هو گئی هے ۔

فزیکل ٹریننگ کو بھی ان دنوں کلیه هذا میں بهت فروغ حاصل هے ۔ چنانچه جدید فزیکل ٹریننگ کالج میں شرکت کے لئے خصوصیت کے ساته سال گزشته اس کالج کے تین طالب علم منتخب هوئے جو اپنا ایك سال کا نصاب ختم کر کے بهترین ثابت هوئے ۔

نتائج امتحانات جامعہ عثمانیہ بابتہ سنہ ۱۳۴۰ ف

جماعت	شریک	کامیاب	اول	دوم	سوم	نتیجہ فی صد
شعبہ فنون						
یم-یس سی (سال اول)	۴	۳	۰	۰	۳	۷۵
،، ،، ،، (،، دوم)	۳	۳	۲	۱	۰	۱۰۰
یم-اے (،، اول)	۳	۳	۰	۰	۳	۱۰۰
،، ،، (،، دوم)	۵	۵	۰	۴	۱	۱۰۰
بی-اے	۷۹	۴۴	۰	۱۶	۲۸	۵۶
انٹرمیڈیت	۷۳	۳۸	۰	۱۳	۲۵	۵۲
شعبہ دینیات						
یم-اے	۰	۰	۰	۰	۰	۰
بی-اے	۵	۴	۰	۳	۱	۸۰
انٹرمیڈیٹ	۵	۴	۰	۲	۲	۸۰
شعبہ قانون						
ال ال-بی (ابتدائی)	۳۸	۲۷	۷	۲۰	۰	۷۱
،، ،، (آخری)	۱۰	۸	۴	۴	۰	۸۰

ان سے ظاہر ہے کہ جماعت ہائے یم-ایس-سی اور شعبہ فنون میں جماعت ہائے

یم۔اے و ال ال۔بی کے نتائج خصوصیت کے ساتھ اچھے ھیں۔ شعبہ دینیات کے نتائج بھی بہت ھی قابل اطمینان ھیں۔

ابتدائی جماعتون کے نتائج جن میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ھے اتنے اچھے نہین ھیں لیکن کامیاب طلبہ کی تعداد (۵۰) فی صد سے زیادہ ھے یہان ابتدائی جماعتون سے مراد انٹر میڈیٹ اور بی۔اے ھے۔ باوجود اس کے کہ ھر صوبہ میں ایك انٹر میڈیٹ کالج قائم ھوگیا ھے کلیہ ھذا کی ابتدائی جماعتون میں طلبہ کی تعداد ھر سال بڑھتی ھی جاتی ھے کالج کرایہ کے مکانون میں قائم ھے۔ کمرے ناموزون ھیں اور نشستیں محدود۔ لیکن پھر بھی حتی الامکان ان کو موزون بنا کر امیدوارون کو تعلیم کی برکات سے محروم نہ ھونے کی کوشش کی جاتی ھے۔ اگر کالج اپنی عمارتون میں خواہ وہ کہین بھی ھون اور کیسی بھی منتقل ھوجائے تو نہ صرف تمام امیدوار شریك کرائے جاسکین گے بلکہ تعلیم بھی معلمین کے شوق و اطمینان کے بموجب ھوسکے گی۔

جدید تقررات وغیرہ

یہ امر اظہر من الشمس ھے کہ علمی قابلیت اور ڈگریون کے اعتماد سے کلیہ جامعہ کے اساتذہ ھندوستان کے دوسرے کالجون سے بحیثیت عمومی کسی بھی طرح کم نہین ھیں۔ حالیہ طرز عمل کے بموجب خود کالج کے سابق اور بہترین طلبہ کو وظائف یورپ عطا کر کے اعلی ترین تعلیم دلائی جاتی ھے اور کامیاب واپس آنے کے بعد کالج میں ان کا تقرر کیا جاتا ھے۔ کوئی وجہ نہین کہ ان کے اساتذہ نے جو روایات قائم کردئے ھیں ان پر عمل نہ ھو اور تحقیقات علمیہ کی جو بنیاد ڈالی جارھی ھے مستحکم نہ ھو۔

شعبہ قانون میں ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب کا اضافہ ھوا۔ شعبہ اردو میں

ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب اور عبدالقادر صاحب سروری اور شعبہ فارسی میں لطیف احمد صاحب فاروقی کا۔ شعبہ ریاضی میں تعلیم انجینیری سے متعلق ڈاکٹر رضی الدین صاحب اور شعبہ کیمیاء میں بجائے عنایت خان صاحب جو ورنگل انٹر میڈیٹ کالج میں منتقل ہوگئے نذیر احمد صاحب طاہر ایم۔ ایس سی کا تقرر عمل میں آیا۔

ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا صاحب شعبہ تاریخ میں اور صلاح الدین صاحب ام اے شعبہ فلسفہ میں مامور ہوئے۔

اقامت خانہ جات اور تجربہ خانے

یہ حسب سابق اپنے اپنے کرایہ کے مکانون میں قائم ہیں۔ اقامت خانون کی تعداد (۵) ہے۔ ان کے کاروبار بھی پہلے کی طرح اچھے انجام پا رہے ہیں۔

اقامت خانہ قدیم و اقامت خانہ طیلسانین کے سابق مودب مقیم مستعفی ہونے کی وجہ سے ان کی جگہ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی او مولوی عبدالحمید خان صاحب کا تقرر کیا گیا۔

مقیمین اقامت خانہ کی جملہ تعداد (۱۳۷) ہے۔

تجربہ خانون میں ایم۔ ایس سی کی جماعتون کے لئے ایک مکان کا اضافہ کیا گیا۔ یہ مکان بڑی مشکلون سے آغا منزل کے پہلو میں کرایہ پر مل گیا۔ طرح طرح کی کوششون اور معتدبہ روپیہ صرف کرنے کے بعد یہ اب اس قابل ہوا ہے کہ اس میں ایم۔ ایس سی کا کام کیا جائے۔

توقع کی جاتی ہے کہ جدید سہ سالہ کٹ ریکٹ میں ہماری پیش کردہ اسکیم کے بموجب تجربہ خانون کے لئے روپیہ منظور ہوگا تاکہ آلات سائنس کی فراہمی اور ان کی دیکھہ بھال میں موانعات نہ پیدا ہون۔

کتب خانہ

کتب خانہ میں سال حال (۱۶۵۲) کا اضافہ ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

شعبہ مشرقی میں (۵۱۵) کتابیں

شعبہ مغربی و السنہ ملکی میں (۱۱۳۷) "

اس طرح ختم تعلیمی سال ۱۳۴۰ ف پر شعبہ مشرقی کی کتابوں کی مجموعی تعداد (۱۰۹۵۱) ہے اور شعبہ مغربی و السنہ ملکی کی کتابوں کی تعداد (۱۷۵۹۲)۔

جملہ تعداد (۲۸۵۴۳)

فہرست ہائے کتب کی تیاری کے علاوہ ان کی تنقیح کا اہم کام بھی انجام پا رہا ہے۔ چنانچہ میرے ایما سے اساتذہ کلیہ کی ایک بڑی جماعت نے متعدد کیٹیاں کیں اور کتابوں کا رجسٹرات کے ساتھ مقابلہ کیا۔

علمی انجمنیں

کالج کی تعلیم اس کی جماعتوں کے باضابطہ درسوں کی حد تک محدود نہیں۔ اساتذۂ متعلقہ اور صدر کلیہ کے زیر نگرانی طلبہ کی متعدد علمی انجمنیں خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہیں۔ ان میں انجمن اتحاد کلیہ کی سب سے بڑی اور اہم علمی انجمن ہے اس کے ذمہ علاوہ تقاریر و مباحثوں کی تنظیم کے طلبہ کے سیر و سیاحت وغیرہ کا انتظام بھی تفویض کیا گیا ہے۔ اس سال کالج کے طلبہ کی بڑی بڑی جماعتیں شمالی ہند۔ والٹیر۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ نظام ساگر۔ بیدر۔ اورنگ آباد وغیرہ کا سفر کر کے اور بیش قیمت معلومات اور تجربے حاصل کر کے واپس ہوئیں۔ ایک جماعت نے جنوبی ہند اور لنکا تک سفر کر کے واپس آئی۔

علاوہ انجمن اتحاد کے بزم قانون - بزم تاریخ - بزم معاشیات - بزم سائنس - بزم عربی - بزم مرہٹی - بھی قائم ہیں - ابھی ابھی بزم اردو کا افتتاح بھی وقوع میں آیا -

کالج کے علمی رسالے

مجلہ جامعہ عثمانیہ اور خزینہ تاریخ پابندی کے ساتھ شایع ہورہے ہیں - ان کے مضامین کی خوبی کا اعتراف نہ صرف ممالک محروسہ کے ارباب تنقید کر رہے ہیں بلکہ برطانوی ہند میں بھی ان کی شہرت قائم ہے -

میں امید کرتا ہوں کہ سررشتہ تعلیمات حسب سابق مجلہ کی خریداری کو برقرار رکھے گا بلکہ خزینہ تاریخ کی اشاعت میں بھی مدد دیگا -

کھیل

فٹ بال - ہاکی - کرکٹ - اور ٹینس حسب سابق جاری ہیں - فٹ بال ٹیم انٹر کالج ٹورنمنٹ میں اپنے روایات کو برقرار رکھا اور اس سال بھی ٹروفی جیت لی - آل انڈیا اورنگ آباد ٹورنمنٹ میں بھی ہماری فٹ بال ٹیم کو کامیابی حاصل ہوئی -

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم سے بھی مقابلہ رہا اور ہمارے کھلاڑیوں نے اچھے کرتب دکھائے -

جدید عمارت بیلی منزل میں ایک نیا ٹینس کورٹ تیار کیا جارہا ہے جس سے ہمارے کالج میں اس کھیل کے شوق کا پتہ چلتا ہے -

مسٹر وبر کی نگرانی میں جدید اصول کے موافق طلبہ شام کے وقت اجتماعی

حیثیت سے کھلی ہوا میں ورزش کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں کے لئے جو فٹ بال ہاکی وغیرہ جیسے بہت زیادہ تھکانے والے کھیلوں میں حصہ نہیں لے سکتے یہ ورزش نہ صرف تفریح کا ذریعہ پیدا کرتی ہے بلکہ ان کے اعضاء رئیسہ اور ہاتھ پاؤں کو بھی تقویت بخشتی ہے۔

اس موقعہ پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کلیہ ھذا کا ایک سابق طالب علم (سید حبیب اللہ حسینی) جو اندنوں بحصول قرضہ اسکاٹ لینڈ میں فزیکل ٹریننگ کی تعلیم پارہا ہے گلاسگو یونیورسٹی کے فرسٹ فٹ بال ایلیون میں اپنے کھیل کی خوبی کی بنا پر منتخب کر لیا گیا۔

ریسرچ اور دیگر علمی کام

جیسا کہ اس رپورٹ کے شروع میں بیان کیا گیا شہریور ۴۰ف سے ایم۔اے اور ایم۔ایس سی کے امتحانوں میں بہترین نتائج کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے والے منتخب طلبہ ریسرچ بورڈ کی نگرانی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ یہ بورڈ مسلمہ قابلیت کے سینیر پروفیسروں اور ریسرچ کی ڈگری رکھنے والے اساتذہ پر مشتمل ہے۔ جن کے یہ نام ہیں۔

اراکین ریسرچ بورڈ کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۱) محمد عبدالرحمن خان صاحب (صدر نشین)

(۲) پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب رکن

(۳) ” کشن چند صاحب ”

(۴) ” محمد رضی الدین صاحب ”

(۵) ” وحید الرحمن صاحب ”

(۶) ” سید محمد علی خان صاحب ”

(۷) ” مظفر الدین قریشی صاحب ”

(۸) " سید حسین صاحب "

(۹) " ھارون خان شروانی صاحب "

(۱۰) " مرزا علی یار خان صاحب "

(۱۱) " سید جعفر حسین خان صاحب "

(۱۲) " یوسف حسین خان صاحب "

(۱۳) " خلیفہ عبدالحکیم صاحب "

(۱۴) " میر ولی الدین صاحب "

(۱۵) " عبد الحق صاحب "

(۱۶) " محمد نظام الدین صاحب "

(۱۷) " قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب

(۱۸) " مولوی عبدالحق صاحب "

(۱۹) " سید غلام محی الدین صاحب "

(۲۰) " مولوی محمد عبدالقدیر صاحب "

(۲۱) " " سید شیر علی صاحب "

(۲۲) " " محمد عبدالواسع صاحب "

(۲۳) " حسین علی مرزا صاحب "

(۲۴) " سید عبداللطیف صاحب (معتمد)

ریسرچ کا جو کام اس وقت جاری ہے اس کی تفصیل بہت طویل ہوگی۔ مختصراً صرف اتنا بیان کر دیا جاتا ہے کہ سال حال محمد حمید اللہ صاحب مسلم انٹرنیشنل لا۔ محمد غوث صاحب فقہ حنفی و شافعی۔ بی سری نواس راؤ صاحب تلنگی۔ ڈی۔ کے۔ بھیم سینا راؤ صاحب کنٹری۔ اور رگھوناتھ راؤ صاحب بھوساری مرہٹی۔ راحت اللہ خان صاحب عربی۔ محمد عبدالقیوم خان صاحب باقی فارسی۔ شیخ چاند صاحب اردو۔ اور سید عبدالقدوس صاحب اسلامی فلسفہ کے منتخب

مسائل کی تحقیقات میں مشغول ھیں۔

ممالک محروسه میں السنه ملکی یعنی اردو ۔ تلنگی ۔ مرھٹی ۔ کنڑی اور تاریخ ھند کے مغلیه ۔ پرتگالی ۔ فرانسیسی و انگریزی دوروں سے متعلق ریسرچ کے لئے وافر مواد موجود ھے ۔ دفتر دیوانی تاریخ دکن وغیرہ کی معلومات کا ایک ایسا معدن ھے جس میں سال ھا سال تک کام کیا جاسکتا ھے ۔ اور ان سے بیش قیمت نتائج شایع کئے جاسکتے ھیں ۔ بر ایں ھم اگر کالج کے کتب خانه کو قلمی مکتوبات کے خرید نے کے لئے ھر سال ایک مناسب رقم دی جائے تو کارھائے ریسرچ میں بڑی مدد ملے گی ۔

کتب خانه آصفیه اور بعض پرائیوٹ کتب خانوں سے بھی ریسرچ میں مدد لی جارھی ھے ۔ حال ھی میں مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے اپنے کتب خانه سے دیوان شمس تبریز کا ایک نسخه مستعار دیا ھے ، جو موجب تشکر ھے ۔

طلبه کی ریسرچ کی نگرانی کے علاوہ بعض اساتذہ بطور خود انفرادی حیثیت سے یا طلبه کے ساتھ مل کر کام کر رھے ھیں ۔ ریسرچ بورڈ کے تقریباً جمله ارکان اور بعض دیگر اساتذہ مختلف تحقیقاتوں میں مصروف ھیں ۔ بعض صاحبوں کے نتائج سائنٹیفک اور دیگر مشہور علمی رسالوں میں شایع ھوگئے ھیں یا ھونے کو ھیں ۔ میں نے تحریک کی ھے که عثمانیه یونیورسٹی اسٹڈیز کے نام سے ھر سال ایک رساله جاری کیا جائے ۔ جس میں کالج کی علمی تحقیقات کے نتائج شایع ھوتے رھیں ۔ امید که یونیورسٹی سے جلد اس کی منظوری صادر ھو جائے گی ۔

کلیه جامعه عثمانیه کے طلبه

بڑی خوشی کی بات ھے که اس سال کی رپورٹ میں بھی ھمارے بعض ھونہار

طلبہ کی قابل تحسین علمی کامیابیوں کا ذکر کرسکتا ہوں ۔ محمد رضی الدین صاحب صدیقی
نے بعد کامیابی کیمبرج میتھمیٹکل ٹرائپاس Leipzig یونیورسٹی سے (Quantum Mechanics)
جیسے ادق اور خشک مضمون میں تحقیقات کر کے پی ۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ اور
رام چندر ریڈی صاحب مینچسٹر یونیورسٹی سے امتحان بی ۔ ایس سی انجینیرنگ میں
درجہ اول کی آنرز ڈگری لیکر واپس ہوئے ۔ مقبول علی صاحب نے ایل ۔ آر ۔ سی ۔ پی
اور ایم ۔ آر ۔ سی ۔ یس کا امتحان پاس کر کے ایم ۔ آر ۔ سی ۔ پی کے سخت مشکل اور کٹھن
امتحان کی تیاری شروع کردی ہے ۔ قاضی معین الدین صاحب ایم ۔ یس ۔ سی (عثمانیہ) جو
یونیورسٹی کالج لندن میں بعطائے قرضہ تعلیمی امتحان پی ۔ ایچ ڈی کے لئے ریسرچ
کر رہے ہیں نامیاتی کیمیا کے اچھے اسکالر بن کر واپس آنے کی توقع ہے اس لئے کہ ان کے
استاد پروفیسر انگولڈ نے قاضی محمد حسین صاحب سے دوران امپائر یونیورسٹیز
کانفرنس ان کی غیر معمولی تعریف کی اور کہا کہ ایسے طالب علم ہندوستان سے بہت کم
یورپ آتے ہیں ۔ ان کے علاوہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے متعدد سابق طلبہ جو اس وقت یورپ
کی جامعات میں تعلیم پا رہے ہیں جامعہ کے عمدہ روایات برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں ۔
اور امید ہے کہ ہماری سالانہ رپورٹیں ان کے کارناموں سے مملو رہیں گی۔

کالج کی عمارات

کالج کو اپنی عمارات نہ ہونے کی وجہ سے جو تکالیف اور نقصان برداشت
کرنا پڑتا ہے اس کا ہر سال ذکر کیا جاتا ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ اس رپورٹ میں بھی
اس کو دہرانا پڑا ۔ نہ بطور شکایت بلکہ بغرض اظہار واقعات ۔ اس سال مجھے ایک اور
مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ۔ چار دن کی نوٹس پر مجھے ایک بڑی عمارت خالی کرنی پڑی ۔
اگر خوش قسمتی سے ایک دوسرا امکان اس محلہ میں نہ مل جاتا ۔ تو بڑی سخت دقتیں
برداشت کرنی پڑتیں ۔ کالج تقریباً گیارہ سال سے کرائے کے مکانوں میں کام

کر رھا ھے۔ اس عرصے مین بعض مالکان مکان فوت کر گئے۔ بعضون نے مکان بیچ دئے اور اکثرون نے مدت معاھدہ کے اختتام پر مزید کرائیے کا مطالبہ کیا۔ ان امور سے انتظامی و قانونی جو پیچیدگیاں پیدا ھوئیں ان کا اندازہ صرف ان ھی کو ھوسکتا ھے جو ان کی اشاہ سے واقف ھیں۔ اگر جامعہ کی عالیشان عمارت کی تعمیر شروع کرنے مین ابھی کچھ دیر ھے تو مین امید کرتا ھون کہ کم از کم اس محلے میں چند مکانات و زمینات ھی خرید لی جائیں۔ ان پر کچھ زیادہ رقم صرف نہ ھوگی۔ مع ھذا یہ مکانات یونیورسٹی کی عمارات تیار ھو جانے کے بعد سرکاری دفاتر و دیگر مدارس کے کام آسکیں گے۔ کرایہ پر اس وقت ھزارھا روپیہ جو صرف ھورھا ھے بچ رھے گا۔ اور موجودہ حالات میں اعلی تعلیم و ریسرچ کے سد راہ جو رکاوٹیں پیش آرھی ھیں یک گونہ برخاست ھو جائنگی۔

اختتام پر مین عالی جناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ کا شکریہ ادا کرتا ھون کہ صاحب موصوف نے باوجود انتہائی مصروفیت کے اس جلسہ کی صدارت قبول فرمائی ممدوح نے گزشتہ چھارشنبہ کی شب کو مشاعرہ کی صدارت فرما کر رھین منت فرمایا۔

اب میں آپ سے درخواست کرتا ھون کہ انعامات تقسیم فرمائین۔

صدر

کلیہ جامعہ عثمانیہ

هز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر صدر اعظم

نے حسب ذیل تقریر جلسہ انعامات کے موقع پر فرمائی۔

صدر کلیہ اور حاضرین۔

کلیہ عثمانیہ کی مسلسل استوار کامیابی کا مزید ثبوت صدر کی پیشکردہ روئداد سالانہ سے ملتا ہے اس کامیابی کے ذمہ دار صدر کلیہ عبدالرحمن خانصاحب اساتذہ اور متعلمین ہیں جنکی محنت نے حاضرہ نتائج پیش کئے۔ ان سب کو میں دلی مسرت کے ساتھ مبارکباد دیتا ہوں۔

کامیاب طلباء اور شرکاء کلیہ کے شعبہ واری اعداد معلوم کرنیکے ساتھ مجھکو ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ یہ بھی معلوم کروں کہ اس کلیہ سے جو متعلمین اپنی تعلیم ختم کرچکے ہیں کن مشاغل میں مصروف ہیں اور کسطرح روزگار پیدا کررہے ہیں۔ رجسٹرار جامعہ عثمانیہ محولہ مواد کے فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں تو ایسا مواد جامعہ کی تعلیمی سود مندی کو ظاہر کرنے اور اس کی سیرت گری اور معاشی افادات کے دلچسپ نتائج کو معلوم کرنے اور مختلف شعبہ جات کے باہمی تقابل و توازن میں بڑی مدد دیگا۔

آپ سبکو معلوم ہے کہ قیام جامعہ سے مقصود دراصل اقامتی جامعہ تھا اور اس کے پیشرفت میں سرکار نے عمارات کی تعمیر

کے کام کو آغاز کرنے کی ممکنہ کوشش کی اور سرکار عالی کی ملازمت کے دو لائق انجینیروں کو دنیا کا دورہ کرنیکے لئے روانہ کیا۔ اب ان کی واپسی آغاز کار کا پیش خیمہ ہے۔ آپ کی بیان کردہ مشکلوں کو حل کرنیکے لئے آپ کی مجوزہ تدبیر پر یونیورسٹی کونسل کو غور کرنا چاہئے۔

میری دلی خواہش ہے کہ یونیورسٹی کیلئے جلد سے جلد مکان بن جائیں تاکہ اقامتی جامعہ کے وہ اہم اور بیش قیمت فوائد جو معلمین اور متعلمین کے تعلیمی فضا میں باہمی قربت سے حاصل ہوتے ہیں جلد ظہور پذیر ہوں۔

جامعہ میں مختلف شعبہ جات میں بزم قائم کرنے میں جو دلچسپی لیگئی لائق قدر ہے تلنگی اور کنڑی کے بزم بھی قائم ہوسکیں[1] تو بہتر ہے۔

میں نے پانچ سال قبل تقسیم اسناد کے جلسہ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جامعہ کے اساتذہ کے علمی خدمات محض متعلمین جامعہ کی حد تک محدود ہوں تو پبلک کو جامعہ کی علم گستری سے مستفید ہونیکا کم موقع ملتا ہے اسلئے ضروری ہے کہ جامعہ کی طرف سے پبلک کے علمی افادہ کیلئے ہفتہ وار لکچر ترتیب دئے جائیں تاکہ جامعہ کو پبلک کے علمی مذاق کو ترقی دینے اور مفید مباحث پر عالمانہ روشنی ڈالنے کا موقع ملے۔ مجھکو بڑی خوشی ہوتی جو طریقہ مذکور پر لکچروں کے انتظام کی مجھکو آج کے جلسہ میں

---

[1] اس بزم کا وجود طلبہ کی توجہ اور شوق کا محتاج تھا، یہ کمی بھی اب باقی نہیں رھیگی

اطلاع ملتی ۔ میں واقف ہوں کہ جامعہ کی طرف سے بیرونی علما کو یونیورسٹی کیلئے پبلک لکچر دینے کیلئے مدعو کیا جاتا ہے اس کے ساتھ مجوالۂ صدر تجویز پر بھی عمل کیاجائے تو اہل ملک جامعہ کے اساتذہ سے عموماً اور اس کلیہ کے اساتذہ سے خصوصاً مستفید ہونگے اور اس جامعہ کی مقبولیت اور سودمندی کی ملک میں بڑی قدر ہوگی ۔

پیوستہ شب مشاعرہ کی صحبت بہت دلچسپ تھی میں چاہتا ہوں آج کے تقسیم انعامات کے سلسلہ میں اپنی طرف سے بعض اصحاب کو جن میں کلیہ کے اساتذہ اور متعلمین شریک ہیں اور جنکے کلام نے مشاعرہ میں خراج تحسین حاصل کیا انعام دوں میری طرف سے مشاعرہ کے انعام پانیوالے (۱) خلیفہ (۲) زیبا (۳) فرحت (۴) باقی (۵) بدر (۶) علیم (۷) وفا اور (۸) جوش رند شاہد باز ہونگے ۔

اب میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقسیم انعامات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔

کلیہ کی خبریں

انجمن اتحاد

انجمن اتحاد کی سرگرمیان برادران کلیہ کی زندگی کا صحیح ثبوت ہو سکتی ہیں۔ اس کی مسلسل تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن اتحاد اپنی دلچسپیوں میں روز افزون اضافہ کر کے سال بہ سال منازل ارتقاء طے کر رہی ہے۔ چنانچہ اس سال کے نئے انتخاب کے موقع پر برادران کلیہ کے جوش نے جمود کے رہے سہے اثر کو بھی مٹا دیا۔ یہی هیجان تھا جو غالباً اس سال کی کابینہ کی مابعد سرگرمیوں اور ان کی کامیابیوں کا باعث ہوا۔ کالج کی زندگی میں تازگی اور شگفتگی پیدا کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے اس قسم کے مظاہروں کا رونما ہونا ضروری ہے۔

اگر انتخاب کی سرگرمیوں نے برادران کلیہ میں نئی روح نہ پھونک دی ہوتی تو یقیناً جشن یوم کلیہ کو یہ غیر معمولی کامیابی میسر نہ آتی۔

جشن یوم کلیہ ذیل کی رپورٹ سے یہ واضح ہو جائیگا کہ کابینہ جدید نے کس پر جوش طریقے پر برادران کلیہ کی توقع کو پورا کیا، اور وہ ہماری مبارکباد کے کس حد تک مستحق ہیں۔

"سال ہائے گذشتہ کی طرح اس سال بھی جشن یوم کلیہ شاندار پیمانہ پر منایا گیا۔

اس جشن کی ابتداء ۳- بہمن سنہ ۱۸ ف کو اسپورٹس سے ہوئی۔ صبح آٹھ بجے

سے بارہ بجے تک نظام کالج گراونڈ پر ہوتے رہے۔ علاوہ موجودہ و سابق طلباء کلیہ کے
پروفیسر صاحبان نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اور یہ جشن ہر طرح کامیاب رہا۔ چونکہ اسی
زمانہ میں معین الدولہ کرکٹ ٹورنمنٹ ہورہا تھا اس لئے بجائے ۵۔بہمن کے آسی روز یعنی
۳۔بہمن کو ہماری کالج فیلڈ موجودہ اور سابق طلباء کلیہ کے درمیان ہاکی کا نہایت دلچسپ
مقابلہ رہا اور برابری پر ختم ہوا۔ مذکورۂ بالا ٹورنمنٹ کی وجہ سے موجودہ اور سابق طلباء
کے درمیان فٹ بال کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ افسوس ہے کہ کالج ٹون کی عدم تعمیر کے باعث ہمیں
ان مواقع پر جگہ کے لئے دوسروں کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے ۵۔بہمن سنہ ۱۳۴۱ف۔ شب کے
۸۔بجے بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ ہز اکسلنسی یمین السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر
المتخلص بہ شاد نے جن کی علم دوستی اور ادبیات کا صحیح ذوق ایک روایتی حیثیت رکھتا
ہے صدارت بزم قبول فرما کر مشاعرہ کو زینت بخشی۔ شاعری کا ”مذاق نو“ رکھنے
والوں کی طبع آزمائی کے لئے نظم کا عنوان ”زندگی“ رکھا گیا تھا، اور غزل کے دلدادہ
حضرات کے لئے دو طرح مصرعے دئے گئے تھے۔ ع تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
ع چشم خوباں خاموشی میں بھی نوا پرداز ہے۔

ملک کے ذی کمال اور صاحب ذوق حضرات کا کافی مجمع تھا۔ مجلس مشاعرہ تقریباً
دو بجے رات تک گرم رہی ڈیڑھ دو ہزار آدمی شریک محفل تھے اور ہز اکسلنسی مہاراجہ
بہادر کی دلچسپی ختم مشاعرہ تک باقی رہی۔

حسن تنظیم اور آداب مجلس میں سر مو فرق نہ آیا اور اس اعتبار سے غالباً یہ
مشاعرہ کالجوں کے تمام مشاعروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ہز اکسلنسی مہاراجہ
بہادر نے ایک موقع پر اپنی تقریر کے ذریعہ اس خوبی انتظام کی تعریف فرمائی، اور تقسیم
انعامات کے موقع پر باکمال شعراء کو قیمتی تحفوں سے سرفراز فرمایا۔ نظموں اور غزلوں کا
انتخاب کسی آئندہ نمبر میں شایع کیا جائے گا۔

٦- بھمن سنہ ۱۴ف ۔ شب کے آٹھ بجے اردو مقابلۂ تقریر منعقد ھوا۔ موضوع حسب ذیل تھا۔

"قومی فلاح میں حکومت سے زیادہ انفرادی جد و جھد کو دخل ھے"

جناب اعظم خان صاحب متعلم سال سوم اور جناب بی۔ین۔ چوبے صاحب متعلم ال۔ال۔بی (ابتدائی) علی الترتیب اول و دوم انعام کے مستحق قرار پائے۔

۷- بھمن سنہ ۱۴ف۔شب کے آٹھ بجے انگریزی مقابلۂ تقریر حسب ذیل موضوع پر قرار پایا۔

"Should Indian State be included in the Federation."

جناب بی۔ین چوبے صاحب متعلم ال۔ال۔بی اول نے پہلا انعام دوسرا انعام کشن راؤ صاحب متعلم سال چھارم نے حاصل کیا ھم ان اصحاب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ھیں۔

۸- بھمن سنہ ۱۴ف۔کو چار بجے تقسیم انعامات کا جلسہ اور عصرانہ ترتیب دیا گیا۔ تقریباً تمام معزز عہدہ داران حیدرآباد مدعو تھے۔ ھز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے انعامات تقسیم فرمائے۔

اس کے بعد معزز مہمانوں نے سائنس کی نمائش کا معائنہ کیا۔ دوسرے دن یعنے ۹- بھمن کو صبح آٹھ بجے سے بارہ بجے تك سائنس کی نمائش سے عوام کو مستفید ھونے کا موقع دیا گیا۔ کالجوں اور مدارس کے طلباء کے سوا دیگر حضرات نے بھی کثیر تعداد میں دلچسپی لی۔ منتظمین نمائش کو ھم اون کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ھیں۔

اسی تاریخ شب کے ساڑھے آٹھ بجے ڈنر ترتیب دیا گیا۔ پروفیسر صاحبان

معزز مہمانوں اور سابق و موجودہ طلباء کی کثیر تعداد شریک تھی۔

ڈنر کے بعد جلسہ معاشرتی اور ڈرامہ ہوا جسمیں شرکاء ڈنر کے علاوہ دیگر حاضرین کی کثیر تعداد کے لئے اس قدر وسیع مقام بھی ناکافی ثابت ہوا۔

انجمن اتحاد کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ڈرامہ پیش کیا گیا۔ لیکن جس خوش اسلوبی سے اور جس اعلی پیمانہ پر اسے انجام دیا گیا وہ خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گو ڈرامہ ختم ہو گیا لیکن ابھی اس کے چرچے باقی ھین۔

عزیز احمد صاحب متعلم سال سوم مصنف ڈرامہ اور پروفیسر جناب ڈاکٹر سیادت علی خان صاحب۔ اور پروفیسر جناب شیو موھن لال۔ اور جناب وفا قانی صاحب بی۔ اے اسٹیج ڈیرکٹر کی محنتیں ٹھکانے لگیں اور وہ تمام برادران کلیہ کے شکریہ کے مستحق ھین۔

اداکاری کا پہلا انعام مرزا شکور بیگ صاحب متعلم ال۔ ال۔ بی کو ملا۔ دوسرے انعام کے مستحق صفی الدین صاحب متعلم سال سوم قرار پائے۔ علاوہ ان کے لاله بندا پرشاد صاحب و جمیل احمد صاحب فاروقی۔ نجم الدین صاحب انصاری۔ عبدالقادر صاحب میناٸی۔ اور ظفر الحسن صاحب نے بھی انعامات پائے۔ ھم ان سب کو مبارك باد دیتے ھین۔

علاوہ اس ڈرامہ کے شرافت اللہ بیگ صاحب متعلم سال چھارم نے "شائلاك" کا پارٹ نہایت خوبی سے کیا اور وہ بھی انعام کے مستحق قرار پائے۔

یہ دلچسپ اور کامیاب رات جشن یوم کلیہ کی سرگرمیون کی آخری قسط تھی۔

نظام کالج انگریزی مقابلہ

جناب احسن عزیز صاحب متعلم سال سوم نے نظام کالج کے فی البدیہ انگریزی مقابلہ تقریر میں ھمارے کالج کی نمائندگی کی۔ اور لطف الدولہ بہادر کپ کے مستحق قرار پائے۔ نظام کالج کے یونین ڈے (Union day) میں

نواب سالار جنگ بہادر نے ان کو طلائی تمغہ اور Rolling cup عطا فرمایا، ہم انجمن کو اور جناب احسن عزیز صاحب آن کی اس شاندار کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

لکچر بصدارت عالی جناب صدر صاحب کلیہ انجمن کا ایک غیر معمولی جلسہ گرامر اسکول (جمنازیم ہال) میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر الیاس برنی صاحب نے حسب ذیل موضوع پر تقریر فرمائی۔

"ملک کے نوجوانوں کے نام معاشی پیام"

جلسہ نہایت کامیاب رہا برنی صاحب نے دو گھنٹے تک دلچسپ تقریر فرمائی۔

انجمن اتحاد نے ان غیر معمولی مصروفیتوں کے علاوہ مختلف مواقع پر دیگر ادبی جلسوں کے انعقاد سے برادران کلیہ کے ذہنی نشوونما میں خاص امداد کی۔ علاوہ ازیں انجمن اتحاد نے سیر و تفریح کے بھی کافی مواقع بہم پہونچائے تاکہ برادران کلیہ کا احاطۂ نظر ممالک محروسہ سرکار عالی تک محدود نہ رہے۔ چنانچہ انجمن اتحاد کی جانب سے تین اکسکرشن مختلف موقعوں پر ترتیب دیئے گئے (۱) نظام ساگر (۲) بمبئی (۳) شمالی ہند والٹیر، کلکتہ، بنارس، لکھنو، کانپور، علیگڈھ، دھلی، لاہور وغیرہ۔

پرنسپل صاحب جامعہ ملیہ دھلی خاص طور پر انجمن کے شکریہ کے مستحق ہیں پرنسپل صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ اور پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج کی بھی انجمن شکر گزار ہے۔

ہم آغا جعفر حسین صاحب صدر انجمن، مرزا شکور بیگ صاحب معتمد انجمن نیز دیگر ارکان مجلس کابینہ کو انجمن کی مختلف النوع کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کابینہ انجمن اتحاد کی تاریخ میں ایک مستقل نقش چھوڑ کر جائیگی۔

پروفیسر وحیدالرحمن صاحب ہمارے شکریہ کے ہر طرح مستحق ہیں جن کی دلچسپی سے نہ صرف جشن یوم کلیہ بلکہ انجمن اتحاد کے دیگر انتظامات کو برقرار رکھنے میں بڑی سہولت ملی ہے۔

فہرست انعامات

بابت سنہ ۱۳۴۰ف

شعبۂ دینیات

نمبر	جماعت		مضمون	نام
(۱)	بی - اے (سینیر)		عام قابلیت	محمد عبد المعید خان
(۲)	,,	جونیر	,,	محمد مصلح الدین
(۳)	انٹرمیڈیٹ (سینیر)		,,	محمد یحیی صدیقی
(۴)	,,	(جونیر)	,,	محمد بدر الدین صدیقی

شعبۂ فنون و سائنس

نمبر	جماعت		مضمون	نام
(۵)	ایم - اے (آخری)		عربی	محمد غوث محی الدین
(۶)	,,	,,	اردو - فارسی	محمد رحمت اللہ
(۷)	,,	,,	فلسفہ	خواجہ سید عبد القدوس
(۸)			ریاضیات	اکبر علی
(۹)	ایم - ایس سی	,,	طبیعیات	محمد ذوالفقار حسین فاروقی
(۱۰)	,,	,,	کیمیا	نذیر احمد طاہر
(۱۱)	ایم اے	(ابتدائی)	فارسی	غلام دستگیر رشید
(۱۲)	,,	,,	تاریخ	سید سراج الدین احمد
(۱۳)	ایم - ایس سی	(ابتدائی)	طبیعیات	محمد حبیب الدین

(۱۴)	ایم۔ایس سی (ابتدائی)	کیمیا		سید شاہ محمد	
(۱۵)	بی۔اے (سینیر)	عام قابلیت		محمد باقر حسین قریشی	
(۱۶)	" "	انگریزی		محمد فاروق	
(۱۷)	" "	مضامین فنون		کھنڈے راؤ	
(۱۸)	" "	مضامین سائنس یا ریاضیات		خواجہ محمد واسع	(سائنس)
(۱۹) الف	" "	دینیات لازم یا اخلاقیات		محمد معجز علی	(دینیات)
(۱۹) ب	" "	"	"	محمد باقر حسین قریشی	"
(۲۰)	بی۔اے (جونیر)	عام قابلیت		وی۔پی وینکٹا چاریہ۔	
(۲۱)	" "	انگریزی		سید وحید الدین	
(۲۲)	" "	السنہ		دتاترے راؤ گرو	
(۲۳)	بی۔اے (جونیر)	تاریخ		سید عبد الغفار	
(۲۴)	" "	فلسفہ		سید وحید الدین	
(۲۵)	" "	ریاضیات		وی۔پی وینکٹا چاریہ	
(۲۶)	" "	طبیعیات		کے۔ویدانتا چاری	
(۲۷)	" "	کیمیا		وی۔بھیمیا	
(۲۸)	" "	حیاتیات		محمد عبد السلام	
(۲۹)	" "	(دینیات لازم یا اخلاقیات		محمد عبد السلام	(دینیات)
(۳۰)	انٹرمیڈیٹ (سینیر)	عام قابلیت	پہلا انعام	محمد محمود علی	
(۳۱)	" "	"	دوسرا انعام	محمد یوسف الدین انصاری	
(۳۲)	" "	انگریزی		سید عبد المجید رضوی	
(۳۳)	" "	مضامین فنون		نرسنگ راؤ مان وی کر	
(۳۴)	" "	مضامین سائنس یا ریاضیات		محمد یوسف الدین انصاری	سائنس

(۳۵)	انٹر میڈیٹ (سینیر)	دینیات لازم یا اخلاقیات			محمد محمود علی دینیات
(۳۶)	،،	جونیر	عام قابلیت، پہلا انعام		نذر محمد خاں
(۳۷)	،،	،،	،،	دوسرا انعام	بی۔ نرسمہوان ریڈی
(۳۸) الف	،،	،،	انگریزی		ڈگمبر دیش پانڈیہ
(۳۸) ب	،،	،،	،،		رگھو نندن راج
(۳۹)	،،	،،	مضامین فنون		کے۔ وینکٹ رام راؤ
(۴۰)	،،	،،	مضامین سائنس یا ریاضیات		نذر محمد خاں (سائنس)
(۴۱)	،،	،،	دینیات لازم یا اخلاقیات		رگھو نندراج (اخلاقیات)

شعبۂ قانون

(۴۲)	ال ال۔ بی (آخری)		عام قابلیت، پہلا انعام		سری نواس راؤ گڈ ورکر
(۴۳)	،،	،،	،،	دوسرا انعام	محمد میر خاں
(۴۴)	،،	(ابتدائی)	،،	پہلا انعام	کرشناجی گوئیندراؤ ھٹنالے کر
(۴۵) الف	،،	،،	،،	دوسرا انعام	ڈگمبر راؤ چودھری
(۴۵) ب	،،	،،	،،	،،	سید محمد مرتضی
(۴۶)	جرمن زبان		عام قابلیت		سید وحیدالدین سال چہارم
(۴۷)	مباحثہ اردو :				محمد اعظم خاں سال سوم
(۴۸)	مباحثہ انگریزی :				بی۔ این چوبے ال ال۔ بی ابتدائی

حیدرآباد دکن

محمد عبدالرحمن خاں

۳ شعبان المعظم سنه ۱۳۵۰ ھ م ۸ بہمن سنه ۱۳۴۱ ف م ۱۲ ڈسمبر سنه ۱۹۳۱ء صدر کلیه

جرمن زبان کا دوسرا انعام
(منجانب ڈاکٹر سید جعفر حسن صاحب)

محمد حمید اللہ
ریسرچ اسکالر شعبہ دینیات

مباحثہ اردو کا دوسرا انعام
(منجانب انجمن اتحاد)

بی - این - چوبے ال ال - بی ابتدائی

مباحثہ انگریزی کا دوسرا انعام
منجانب انجمن اتحاد

پی کشن راؤ سال سوم

انعامات مشاعرہ

منجانب ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنتہ
امیر جامعہ عثمانیہ

۱- جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ
۲- ،، علی حسنین صاحب زیبا متعلم بی - اے کلیہ جامعہ عثمانیہ
۳- ،، عبدالقیوم خان صاحب باقی ـ یم - اے عثمانیہ
۴- ،، ابوالکلام بدرالدین صاحب بدر - متعلم میڈیکل کالج
۵- ،، صاحبزادہ علیم الدین خان صاحب - سابق متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ
۶- ،، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب - فرحت
۷- ،، شبیر حسین خان صاحب جوش ملیح آبادی
۸- ،، عمر بن صالح صاحب وفا

روئداد بزم قانون کلیہ جامعہ عثمانیہ

میقات اول

بزم قانون ایک عرصہ سے اپنے کرم فرماؤں کی لاپروائی کا شکار ہو رہی تھی۔ نئی کابینہ نے اس کو دور کرنے کی جو کوشش کی اس کا اندازہ حسب ذیل مختصر خاکہ سے ہو سکتا ہے۔

جدید کابینہ نے طلباء کی مصروفیتوں کے پیش نظر جو انہیں میقات دوم میں امتحان کی تیاری میں ہوگی، اس میقات میں مختلف موضوعات پر مباحثے قرار دیے جن کی تعداد جملہ چھ تھی۔ اور موضوعات حسب ذیل قرار دئے گئے تھے۔

۱ وفاقی حکومت فردی حکومت پر فوقیت رکھتی ہے۔
۲ شبہ کا فائدہ ملزم کو نہ دیا جائے۔
۳ اسلامی تعزیری سزائیں انسداد جرائم کا بہترین ذریعہ ہیں۔
۴ وکلاء معمار قوم ہیں۔
۵ قانون شہادت کسی واقعہ کو معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ نہیں۔
۶ قانون سازی سوسائٹی کی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔
۷ علاوہ ازایں پروفیسر حسین علی مرزا صاحب نے (Law and Morals) پر حکیمانہ تقریر فرمائی۔

علاوہ ازایں ایک مصنوعی عدالت کا اجلاس ترتیب دیا گیا جس کی صدارت نواب اصغر یار جنگ بہادر جج ہائیکورٹ نے ازراہ عنایت قبول فرمائی۔

اس موقع پر ہم کو اس عصرانہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جو اراکین بزم نے اپنے شفیق استاد جناب میر اکبر علی خان صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) ال ال بی آنرز (لندن) بیرسٹر اٹ لا کی صحتیابی کی مسرت میں ترتیب دیا تھا۔ علاوہ اساتذہ جامعہ جناب رائے شیشر ناتھ صاحب جج ہائی کورٹ بھی شریک عصرانہ تھے۔

اس سال ایک علمی قانونی رسالہ کی اشاعت کا بھی قصد ہے، جس کی ترتیب و تہذیب کا کام جناب محمود علی صاحب متعلم ال ال بی اول کے سپرد کیا گیا۔

اسی سال میقات دوم کے ختم پر ”یوم بزم“ منانے کا ارادہ ہے امید ہے کہ ہماری یہ خواہش جلد عملی جامعہ پہنے گی۔

بزم سائنس کلیہ جامعہ عثمانیہ

اعلان

مین اراکین بزم سائنس کو مسرت سے اس امر کی اطلاع دیتا ہون کہ مجلس انتظامی نے ایک سائنٹفک میوزیم کے قیام کا تصفیہ کیا ہے۔ جسمین وہ اشیاء رکھی جائینگی جو سائنٹفک اہمیت رکھتی ہون۔ اسکے لئے خاص طور پر جملہ اراکین بزم اور شائقین سائنس سے استدعا کی جاتی ہیکہ جب کبھی اونہیں سائنٹفک اہمیت رکھنے والی کوئی شئے (مثلاً خاص قسم کے وزنی شفاف پتھر۔ معدنیات کے نمونے۔ حیوانیات کے چھوٹے جانور جو اسپرٹ میں رکھے جاسکیں۔ نباتیات میں اہمیت رکھنے والے جڑیں اور پتے وغیرہ) دستیاب ہو تو معتمد بزم ھذا کو لادیں تاکہ نہایت احتیاط سے میوزیم میں عطیہ کے طور پر رکھی جاسکیں ان اشیاء کے معمل متعلقہ میں تجربہ کئے جائینگے۔ جس سے اہم نتائج کی توقع ہے۔ فقط۔

صدیق احمد

معتمد بزم سائنس

EDITORIAL NOTE

THE aims and objects of our Magazine lay it down that it shall be a mirror of the social activities of the University College. This can only be achieved if we have some columns set apart for the purpose. We have, therefore, suggested the following four sections to be added to it:—

1. Tit-Bits.
2. Physical Culture.
3. News and Views.
4. Reviews.

And for these sections we have recommended Mr. S. Vahid-uddin of the Fourth Year Class as Sub-Editor.

It is a pleasant augury that the professors and students of the College staged a drama and a comic on the College Day.

The *dramatis personæ* included, among others, the Principal (Prof. Dr. Mir Siadat Ali Khan), Wasim (Mr. Mirza Shukūr Beg, Secretary, College Union), while Mr. Bindaprasad Srivastava (Secretary, Hindu Hostel Dramatic Association) acted as the Philosopher in Moliere's *Forced Marriage* presented in Urdu garb.

As a first trial, the efforts deserve encouragement.

The Associations of Economics and Sociology have been amalgamated with Mr. Shankarji as its President, and Mr. Z. A. Kamil as its Secretary. The subjects discussed in the Association included :—

(۱) ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے سیاسی اقتدار ناگذیر ھے ۔
(۲) ہندوستان کی موجودہ معاشی ترقی کے لئے جو کسی عمدہ بنیں ۔
(۳) قرون وسطی میں بھی ہندوستان کی معاشی حالت خراب تھی ۔
(٤) پردہ کی رسم دامن تہذیب پر ایک دھبہ ھے ۔

There was also a lecture given by Prof. Ram Narsu of the Nizam's College on *Present-day Financial Crisis*.

It appears that the Economics Association (one of the oldest institutions of the College), which played a prominent part in its earlier career, has again risen up from its deep slumber.

PRINTED AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS—1932. C3791

The book under review aims at the refutation of those European savants who strongly affirm the retarding and disintegrating character of religion. Unfortunately it abounds in dogmatic assertions by which books written from the conscious or unconscious motive of proselytising are marred. He sees 'nothing of practical value in civilization at present that could not find its origin in Islam.' If any religion conceives us at our birth as a mere *tabula rasa*, a clean slate to write upon, it cannot surely stand the overwhelming force of modern research which goes to prove the contrary. The writer then proceeds to enumerate and comment on many of the elements of Islam. In the end he gives way to the same tendency to dogmatising which runs throughout the book. What we surely need to-day is not an apologia for any form of religion but for religion in general. When its basic principles and its whole world of values are questioned it behoves the advocates of religion to sink all other differences and give a united front to their common enemy, the emancipated intellect of man. Religion at its best is not, as the writer seems to hold, an elaborate system of laws and conventions but a general name for that supra-sensuous experience which defies all intellectual analysis. But let not this detract from the value of the book which lies in presenting in a small compass the salient characteristics of a great religion.

S. VAHIDUDDIN.

REVIEWS

'Forget-Me-Not' and 'The Lily'

BY

N. C. MITTALL

Prince of Wales College, Jammu, Kashmir.

(Copies obtainable from the Author. Price annas eight)

THESE charming little volumes contain a wealth of Indian Folk-Tales, each of which provides endless amusement to both young and old. Well-written in a free and understandable style these two works will make an instant appeal to anyone who is fond of light reading for leisure hours. In each narrative there is an underlying moral that points out the manifold advantages of good clean living—a characteristic that makes these books of Mr. Mittall's doubly valuable to school libraries and to young students, whilst the many adventures of his imaginary men and women hold the attention of the reader to the end. After all, isn't it quite true that good fiction makes the greatest appeal to us of all literature? In view of this we find a lot of worthless fiction and literature placed on the market to meet the popular demand. It is therefore quite easy for young students to pick up undesirable works in their search for good adventurous readable matter. With this fact in mind, whenever I come across such good books as Forget-Me-Not and The Lily I attempt to bring them to the notice of my friends as much as I possibly can.

LELAND J. BERRY.

Muslim Faith: Its Division and Definition

BY

AL HAJJ KHWAJA KAMALUDDIN

This forms a Chapter of *Islam and Civilization*, a book by the well-known and indefatigable Muslim Missionary Mr. Kamaluddin. He is an extremely prolific writer, whose writings have done a great deal in propagating the principles of Islam.

Terminal Report of the Association of Economics and Sociology 1931.

A couple of years ago the Economics Society and the Sociology Society were amalgamated under the above designation.

Uptil now four ordinary meetings at this society have been held with Mr. Shankerji, the president, as Chairman.

(i). On the 12th of Meher 1340 F. in the Hindu Hostel. The subject given was:-

ھندوستان کی معاشی ترقی کیلئے سیاسی اقتدار ناگزیر ھے

Proposed by Mr. Mohamed Ali Khan, opposed by Mr. Khaja Hameed Ahmed. Ten students took part in the debate and there was a gathering of more than 50 students.

(ii). On the 17th of Meher 40 F. in Massurat Munzil Hostel Subject ھندوستان کی موجودہ معاشی ترقی کیلئے چوکسی عمدہ نہیں
Proposed by Mr. Khaja Hameed Ahmad. Opposed by Mr. Qazi Abdur Rauf. 10 speakers, gathering of about 60.

(iii). On the 27th of Maher 40 F. in Nizamat Munzil Hostel. Subject قرون وسطی میں بھی ھندوستان کی معاشی حالت خراب تھی
Proposed by Mr. Khaja Hameed Ahmed. Opposed by Mr. Ali Abdullah. 9 speakers, gathering about 40.

(iv). On the 3rd of Aban 40 F. in the Hindu Hostel. Subject پردہ کی رسم دامن تہذیب پر ایک دھبہ ھے Proposed by Mr. Abdur Rauf, opposed by Mr. Basheruddin. 12 speakers gathering 50.

On the 15th October 1931 an extra-ordinary meeting was held under the presidentship of Dr. Jaffar Hussain at Liaquat Munzil at 6 p. m. The president introduced the speaker Prof. Ram Narsu (Nizam College), who spoke on the subject *Present Day Financial Crisis*, for an hour. The lecture was a great success. A large gathering was witnessed.

I thank our Principal, Prof. Abdur Rahman Khan, on behalf of the Economics Society, for the use of the hall with lights for that evening, and also the House-masters of the various hostels, for the same kindness extended to the society.

Students have taken a keen interest in the debates, and one of the two Economics Professors—Prof. Mohamed Ilyas Burni and Prof. Jaffar Hussain—was present at almost every meeting.

Mir ZAHID ALI KAMIL, *Secretary*.

This awakening could not but influence other societies as well. The year before our society was also suffering from the same mental torpor. In spite of all our efforts our students at first failed to evince any interest in its activities. Though bitter disappointments were in store for us we never gave way. Our efforts were at last crowned with success. The awakening and progress of our society can also be gauged from the fact that one of our distinguished members Mr. Syed Saleh Hashimi stood first in the inter-hostel competition. No less than eight prize competitions were announced by our society. In one of the series confirmed to the students of the Intermediate Mr. Syed Saleh Ibrahim won the palm. Fully conscious of the value of general information our Librarian managed to secure some of the magazines and papers. As a visit to places of historical importance formed one of the principal parts of the programme of our society, its members were fortunate enough to see some of them. They got, moreover, the opportunity of studying the culture of Southern India and examining the coal mines.

Keeping in mind the lofty ideas that our society has placed before it, much indeed remains to be done. We earnestly hope that under the able guidance of the President-elect Mr. Najmuddin our society will realise its dreams and ideals.

MD. FAKHRUDDIN HASAN,
President.

which though not directly connected with our society, were held in its Hall from time to time on behalf of other societies. Many magazines and newspapers are provided by our society for the twofold purpose of mental recreation and knowledge. The former tutor, Dr. Abdul Haq and the present tutor, Mr. Abdul Majid Siddiqi have done the society invaluable service. It owes a great deal, no doubt, to their patronage. Prof. Abdul Majid has, moreover, awarded several prizes to the successful candidates at his own personal expense. We are responsible for an interesting and valuable innovation in the hostel-life. An excursion which was unique in its character was planned. We are glad to state that it was a notable success. Mr. Md. Fazlullah of Karimnagar won a gold medal for his success in the Nizam College Competition. We heartily congratulate the distinguished member of our society for his remarkable achievement. In the end we offer our sincerest thanks to all those professors who kindly attended our meetings.

MD. MASLAHUDDIN,

Secretary.

The Annual Report of the Debating Society Masarrat Manzil 1339–40F.

At the end of the year I have the honour to present before you the work of our Cabinet in such a manner as to give you an idea of the sincerity and the whole-hearted devotion with which we have carried on our work. But it will not be doing justice to us if our efforts are judged merely by their results. Such a pragmatic test will not work here. It is a matter of day to day experience how an unfavourable atmosphere counteracts the effects of our utmost efforts and perseverance. Having as its aim the development of the speaking powers of our students the society organised twenty-seven meetings under its auspices. The intellectual activities of our College and hostels were paralysed for some years. Thanks to Mr. Mir Ahmed Ali Khan's presidentship a new life was brought to the College Union.

NEWS AND VIEWS

Farhat Manzil Debating Society

Md. Yahya Siddiqi	....	*Vice-President.*
Syed Abdul Haleem	....	*Secretary.*
Md. Fazlullah Siddiqi	....	*Librarian.*

1. Md. Rasool Khan.
2. ,, Ghous.
3. ,, Osman Khan.
4. Syed Abdul Lateef.

} *Members.*

Science Association

Md. Baqar Husain Quraishi	....	*Vice-President.*
Siddiq Ahmed	....	*Secretary.*
Nazar Mohd. Khan	....	*Treasurer.*

Md. Abdur Rashid
Dhan Mohan Lal
Md. Ghous Siddiqi
Jameel Ahmed Farooqi
Syed Shah Mohammad

} *Members.*

The Annual Report of the Debating Society

Farhat Manzil 1339-40F.

Our strenuous endeavours for the realization of our aims and ideals need not be mentioned here. Though we participated in the activities of our College and Hostels with all the fervour and enthusiasm we never ignored the work of our society in any way. As a natural consequence of our efforts fifteen meetings were organized by our society. Prof. Waliuddin was kind enough to deliver a learned and enthralling speech dealing with the scope of philosophy, with the startling conclusion arrived at by the learned lecturer. Mention should also be made of those meetings,

On this veranda, where a little child is crowing in his pram as we talk of these things, we cannot be sure that we may not be invaded. The sambhar come into the garden at night and nibble the flowers, and not a hundred yards down the slope you can see the bones of animals the panther has lately been gnawing. That pram is never out of sight for a moment.

D. M. SPEIGHT.

me by members of my family, who have been fearless shikaris. Once a young engineer came out to India and went out with my grandfather on a shoot. They were upon a machan and they saw the tiger come out to the bait. The young man must have moved, for they saw the tiger look up and discover them. It gave such a roar that the young man fell off the platform straight on to the tiger. My grandfather fired and killed the tiger, but it had bitten the man through one lung, and he slowly bled to death during the night. They were far from help, and there were no motors in those days.

That scene flashes through my mind as Auntie Tarnina goes on.

'Their servants often used to be troubled by tigers. One day the ayah had gone out a little distance from the house, and as she did not return they went out to look for her. She was nowhere to be seen, but they found pug-marks and followed them. They came to the nullah, and there they found the head of the ayah and some clothing.'

It was only the other day that on the wonderful mountain railway which climbs the precipitous wooded cliffs six thousand feet in a few miles, well this side of yonder Drûg, a tiger stood on the track as a train came up. On those trains, which move very slowly, the engine is behind, and the flagman stands on the platform of the front car. Also the carriages are small and low and give no protection against attack. The flagman stopped the train, and they waited until the tiger walked off. On that line no trains run after dark, and the work-people are carefully removed upon the last trains, as the cottages they live in during the day are not safe. Last year a tiger broke into a cattle-shed of a friend of ours at Ootacamund and took out a calf. It was later killed in the railway station.

A few years ago, where the line climbs through a cutting in the rocks, a train met a wild elephant. The train stopped, and the driver blew the whistle. The elephant trumpeted, and for a quarter of an hour they kept up a ferocious duet, till at last the elephant backed out of the cutting and let the train pass.

'Isn't that the Drûg near Coonoor?' I ask.

'Yes, it falls sheer down for two thousand feet, and Tipu Sultan used to throw his prisoners from the summit.'

'Does any one live near there?'

'O yes; the lower slopes are laid out with coffee. The Mollisons have it, it has been in their family for years. It is very wild country, and they have had many adventures.'

I take my seat beside her, for she is in an expansive mood. And there in that savage yet beautiful spot, with the spear-like stops of towering trees actually beneath our feet, on a spur of the Blue Mountains, she speaks of things that have burnt themselves into her memory.

One day Mrs. M. was sitting on a ridge of the Drûg looking over the valley when she saw something moving near her, and there was a magnificent tiger not thirty yards away. She called to her husband who was further away, and he came at once and stood by her.

'Oh, Will, what a beautiful sight!' she said.

Mr. M. was unarmed; they just watched the beast walk past them as unconcerned as if no one was there at all. On another occasion, Mr. M. was walking home from his plantation, also unarmed, when he suddenly became conscious that he was being followed. He turned round and there was a big tiger on his tracks. He stood still, took off his hat and waved it at the tiger, which turned aside and disappeared in the bushes. He went on, but within a few minutes he had the same ugly feeling and again he turned and waved his hat, and the tiger would not face him. But now he was near his bungalow, and he went up for his gun. When he came out the tiger had gone, but they found the big pug-marks all along, some of them covering his own 'footmarks.'

The simplicity of her speech forms a marked contrast with the tale she has to tell. In the Bombay Museum there is one of those large tigers, which even there, motionless in its glass case, makes one shudder. For I have many memories of stories told

clung to the baby, but the baby's arm came off and the panther disappeared with it into the darkness.

When we went into the Nizamabad District some years later, we met some people who had had to live for a time in a cottage with walls of wattle and daub. They too had a baby, and, it cried a good deal owing to the heat, and the panthers would come right up to the cottage, and sometimes rub against the walls. The mother was so frightened that she would put the baby between mattresses to deaden its cries. One night they cut a hole in the wattle and her husband shot a panther that was standing just outside.

On the crest of the terraced slope above our cottage lives Auntie Tarnina, as my little boy calls her. This childish term of affection disguises a name well known in Indian history of the past eighty years, with a particular relation to Hyderabad in the time of the Mutiny. The old lady, strangely like Queen Victoria in profile, with wrinkles that tell of great beauty during her girlhood in high society in the various European capitals, sits in her veranda which is higher than Lebanon. Her throne commands one of the most entrancing prospects in the world, scenes which only a Turner or a Monet could suggest, for the mountain vistas owe a great deal of their grandeur to the constant changes of atmosphere and cloudscape.

As she gently rocks in her chair her eyes are passing over her slopes of tea-shrubs to a dense amphitheatre of forest, a dim and closely packed area of myrtles, laurels and kindred trees with writhen trunks, an evergreen, ever-damp sinister region were both timber and wild animals are strictly conserved. We call it simply the *Shola* and we all of us have unpleasant memories of the place and its denizens.

But I am sitting opposite her, at the north end of the veranda, and her saddened and disillusioned face is framed by such a startling background that I cannot help interiupting her flow of courtly, old-world English. She turns at my words, and I see her face in profile against a scene of swelling hills, mostly bare, with one dark precipitous mountain-mass looming in the distance.

work, and at night the boy put a table with a chair on it in the door way, so that if a panther came it would knock the chair down. I used to sleep in a room looking on to the cemetery, and the panthers would often prowl around, making gruff breathing noises just outside, but the window was too high for them to get in. One night we had a dog tied in the veranda, and a panther roared with anger because it could not get it. Before it went off it made a big hole just in front of the steps.

Then we moved to another house, where the panthers troubled us often, but we had no such experience as that of a woman who went to live in our old house. One night her husband was away and she was there with her baby and an ayah. The baby had been crying for some time and suddenly the woman heard a thud and soft steps on the roof. Opposite her she noticed one of the cords of a window-ventilator moving, and as she looked up she was horrified to see a panther put its paw through to try to get hold of the cord. She was so frightened that she was paralyzed. At last the panther seized the cord and jerked it. The jerk caused the nail to come out, and the ventilator closed. She took the baby and woke the ayah, and they hid themselves in a little room for the rest of the night. At another house about a mile away a man and a woman were sleeping out of doors on one of those nights when it is unbearable indoors. Suddenly the woman woke, feeling that something was breathing on her. She opened her eyes and there was a panther with its paws on her bed, watching her; it sniffed her all over and then walked off.

Near the Mohammadan burial-ground of that place, Hanamkonda, was a little tumble-down room which the watchman rented. They were very poor people, and could not even afford to repair the place. At night they roughly barred the door with a stick, as they had no lock or bolt. One night he and his wife were asleep on a string cot with their baby between them, when the woman felt something moving near her feet. She thought it was the baby rolling towards the foot of the bed. She stretched out her arm and tried to draw the baby back, but she could not, and sitting up what should she see but a panther with the baby's arm in its mouth! She screamed and her husband woke up and they both

We went round the cottage with a powerful lantern, but saw nothing. The beast had evidently stalked the dog from the tea-bushes up the slope on which the house stands, jumped down at him and chased him round to our front door where he was caught.

This morning a neighbour, a retired Colonel with a long big-game record, called to see us, and his first words were: 'Do you see those marks on that orange tree where a panther sharpened its claws last night?'

And there they were, deep grooves from a height of five feet down a gnarled tree standing isolated from the rose-bushes and dahlias. We have been looking for the paws and collar of the dog, but on each side of the lane leading into the forest are densely-grown ditches in which the wild boars lurk, and these give perfect cover and passage for several hundred yards. And less than that distance away begins the forest, with its network of animal tracks, and its gloomy green hollows and overgrown streams. Beyond it lies a rocky ridge, the haunt of wild beasts and further more gloomy woods, dropping down the precipitous mountains to a region of tigers, wild elephants and deadly reptiles.

When night comes, although the plains six thousand feet below are sweltering in unusual heat, we are glad to keep out the feel of the wilderness as well as the cold by making a merry fire with a blaze of fragrant eucalyptus leaves and logs. When the fire has died down and we are listening in the silence for ominous sounds, or when the mountain winds rise till the forest moans and murmurs in its sleep, then is the time when all is forgotten but old memories of danger.

When I was about twelve we lived in a lonely one-storey bungalow near a Christian cemetery with old graves, and just behind the house ran a ridge of black rocks. The panthers used to come into the cemetery and roar, and they used to walk on the cemetery wall about two hundred yards from the house. We had no compound wall, and the panthers would come right up to the veranda. This veranda was not enclosed, so we put up trellis

PANTHERS AND TIGERS

LAST night the panther came.

Our cottage stands at the entrance to a forest, a mountain forest into which no one ventures except when the sun is well up. It is reserved as a sanctuary, and in it sambhar and barking deer hide under the tall ferns, coiling lianas, and brushwood from which rise the sombre evergreens whose trunks are scarred with lichen.

Two months ago a tiger filled the hollow of these cloudy glens with his terrifying roar, and for sometime a cunning hyæna and a panther with two cubs have been seen at various spots near to us. So we have been expecting a visit, and each morning we have searched the garden for pug-marks. Night by night we have listened to the Badagas in a neighbouring potato field shouting and beating cans to drive the wild boars and porcupines away, and round our cottage we have heard strange heavy breathings and gruntings.

Last night we were seated at table waiting for the soup. Our little dining room opens into a tiny scullery, with a pantry to the left, and a covered passage of six feet in length leading to a cook-house to the left. By that covered way is a bin into which scraps are thrown, and every evening we hear it upset by a strange dog which goes the round of the lonely houses foraging. As the cook was passing to and fro between the scullery and the cook-house, we heard the dog moving the bin as it sought for food.

Suddenly there was a rush and scamper, at full speed. Our two kittens, only a few weeks old, dashed from the pantry, under our table, and into the next room, spitting and snarling, as though in terror. Immediately we heard a bang against a door at the other side of the house, as though an animal had tried to get in. Then all was silence.

प्रेमाचा ओघ सरल
वाहो तर सुखिं अविरल
अचरहि जग करुनि तरल—
बुडविं सुखिं विशालीं!

Open your eyes! Beautiful Dawn is smilingly approaching. Earth has dressed herself in the rays of the morning sun. Singing sweet melodious songs, filling the world with pleasure at this pleasant moment, a number of birds are flying in the sky. Flowers laugh, trees wave, creepers dance, bees dart, but you are still asleep! When you glance at them with loving eyes, Nature seems to be filled with bliss. Clouds have assumed a golden colour in the rays of the sun! Birds chirp, bees whizz, trees and creepers dance, but without thee they do not appeal to me! The flow of Love, let it go on constantly and drown the world in abundance of pleasure!

Conclusion

We have given above a few extracts illustrative of our Marathi poetry. It will be noted that the earlier poets seldom go beyond Love, which is the main theme of their writings. But as we approach the modern writers we find that they are concerned with almost every problem of life, their descriptions of Nature are more numerous and modelled on the Western prototypes. Their philosophical pieces are excellent pieces of morality presented to the masses in a form which is after their minds.

It may be said in conclusion that whereas the older poets concerned themselves with *Bhakti* and *Srangar*, the modern writers, though they never soar to such high empyreans, can still maintain a height where we can see them shining in their own places 'to the measure of the light vouchsafed.'

B. N. CHOBE.

to make a garland for gods, the other will present it to her husband, but the third will adorn herself with these. Then the poet moralises :—

सृष्टी ही त्रिगुणात्मका वदत हा सिद्धांत शाले मुनी ।
त्याचा प्रत्यय आज ये मज पुरा त्या बालिका पाहुनी ।
सत्वा श्वेत रुजे, रजा अरुण, तो काळा तमातें अहा ।
ज्याची वृत्ति जशी तशींच घडती कार्यें तयाहातुनी ।

Sages have said that the world has threefold tendencies. After meeting these girls I realised it. *Satwa* is white, *raja* red, and *tama* black, all actions proceeding from the particular tendency.

The *Prabodhan* should best be read *in extenso* for its music.

उघडि नयन । रम्य उषा हंसत हंसत आली ।
अरुणकिरणमय वसना अवनी ही न्याली ।
मंजु मधुर गान करित,
आनंदे भुवन भरित,
विहंगवृंद गगनिं उडत—
या सुरम्य काली ।
हंसति फुलें, तरु डुलती,
लतिकागण नृत्य करिति,
धावति या भ्रमरतती—
सुप्ति तुला आली!
स्निग्ध दृष्टि तव पडतां
होय वृत्ति सुखभरिता
रविकरिं घनपंक्ति तथा—
स्वर्णमय जहाली!
खगकूजित अलि गुंजित
लतिकातरुगणसिंजित
मुदित! विफल सकल गमत—
तुजविण या काली!

Trees shower leaves on their grave, creepers lend their flowers, and birds sing their dirges! The whole world is full of sorrow. That place still echoes forth the same pathetic moan. Just go and listen. 'My child is sleeping'.

We now come to Balkavi or Trayambak Bapuji Thomre (1890-1918). As another article appeared on this poet in vol. iv, No. 4 of the *Osmania Magazine* by Mr. P. G. Kulkarni, we may refer our reader to it.

The minor poets may be mentioned in brief. Their work may be divided into the following four classes:

(*a*) Natural description; e.g., *Ode to Earth*, *Ode to Autumn*, *The Himalayas*, *The Narbada*, *To the Cuckoo*, *The Tempest*, the *Rainbow* and many others besides; (*b*) sacred poetry or hymns; (*c*) Philosophic pieces and (*d*) translations from Sanskrit. We shall give here only a few extracts.

Goreh sings in his *Kavita-Rati*:—

किती दिवस आणखी तळमळूं तुझ्या कारणें?
नियोग विष पाजुनि उचित कां मला मारणें?
नको करूं नको असे। सकल संग मी त्यागितों।
प्रसन्न परि हो मला। वर अनन्य हा मागतों।

How long shall I suffer torments for thee? Is it fair thus to poison me with separation? No, do not do so! I'll forsake every thing for thee! Be pleased, this is the boon I ask of thee!

Modak says in his *Sculptor*:—

तुझ्या मार्गीं जे दगड आड येतो।
घाव त्यांवर आपुल्या घाल हातों।
काढ त्यांतुन रमणीय दिव्य मूर्ति।
करिल मग तो तव सर्व कामपूर्ति॥

When coming across a stone so shape it, make such a divine idol as will keep thy fame alive.

Another of his pieces, the *Three Tendencies* तीन वृत्ति is an allegory. Three women are gleaning flowers. One of them intends

हें चित्र दिसे डोळ्याला ।
निज चित्र चित्तनयनाला
मग रडुनि वदे ती सकलां "राजहंस माझा निजला" ।
करूं नका गलबला अगदीं लागली झोंप मम बाळा ।
आधींच झोंप त्या नाहीं । खेळाचा एकच चाळा ।
जागतांच वाऱ्यासरसा । खेळाचा घेइल आळा ।
वाजवूं नका पाऊल ।
लागेल तया चाहूल ।
झोपेचा हलका फूल ।
मग झोपायाचा कुठला । राजहंस माझा निजला! ।

Four persons have surrounded him to carry the corpse away. To her comes then the memory of the time when her husband lay dead. That was the first moment of grief, and here was another. Before her mental vision was that scene, and this was before her eyes. In her mind's eye was her own future. To all she appealed weeping: 'My son sleeps! Do not make any noise because my young one is sleeping. He is restless for he is always after some game, even a little breeze is enough to disturb him and then he will run away for play. His sleep is very light, pray gently pass on lest he should be disturbed. When once up how shall he sleep? My baby is now asleep!'

She embraces the dead child and dies herself.

मग मातापुत्रांवरि त्या । तरु गाळिती कोमल पानें ।
ढाळिती लता निज सुमनें । पशुपक्षिहि रडती गानें ।
दशदिशा दगडही कढती । मन दुभंगुनि शोकानें ॥
दुमदुमतें स्थळ तें अजुनी
त्या एकच करुण गानीं
जा जाउनि एका कानीं ।
ऐकाल याच बोलाला—
"राजहंस माझा निजला" ।

unto them. Their glory gives me new aspirations. Arya-land! thy name inspires me so much as none could do.

Keshavsut was the pen-name of Krishnaji Keshav Damle (1866–1905). He wrote on a variety of topics in a language which has a ring of its own. His *Whirlwind* वातचक्र may be compared with Shelley's *Ode to the West Wind.*

> मींहि कशाला येथ रहावें?
> काय असे ज्या मीं चिकटावें?
> वाटे गिरक्या घेत मिळावें
> या पवनाचा चक्रीं होउनि लीन सच्चिदानंदात
> जगद्द्रुमाचें पिकलें पर्ण
> गलित असे मी अगदी जीर्ण
> तर भर भर भर उडूं द्या मला शब्दासंगें स्वर्गांत

Why shall I remain here? What shall I stick to? Would I may join this whirlwind and become one with *Sachidanand* (God). I am a withered leaf of this world, an autumn leaf, with words let me be carried away towards the Heavens.

His *No Rose without a Thorn* is full of optimism, and urges us to action. We shall not quote anything more from him but pass on to Govindagraj.

The full name of this poet was Ram Ganesh Gadkari (1885–1919). The *Only One Cup* एकचप्याला is from the pen of Govindagraj. His melody and his tragic powers may just be guessed from his *My Child Sleeps* राजहंस माझा निजला. The mother is recently widowed, and here lies the only child dead. Who can portray her feelings of grief and dismay! The baby dies in her lap! So deep is the sorrow that the mother loses her balance of mind. Listen to what the poet says:—

> जन चार भोंवतीं जमले। मृत बाळा उचलायाला
> तों काळ नाथनिधनाचा। हतभागि मना आठवला
> तो प्रसंग पहिला तसला। हा दुसरा आतां असला!
> तें चित्र दिसे चित्ताला।

mentioned the names of Rev. N. V. Tilak, Keshavsut, Govindag-raj, and Balkavi.

Narayan Vaman Tilak (1865–1919) may well be called the first great modern Maratha poet. Brought up under the influence of the West, he has assimilated its best culture. To us he makes a greater appeal as almost all his poetry is either subjective or a description of Nature. His little piece *All the World is full of Flowers* is very charming. Says he :—

आकाशांत फुलें! धरेवर फुलें! वाऱ्यावरोही फुलें!
माझ्या गेहिं फुलें! मनांतहि फुलें! भूगर्भि सारी फुलें
माझें चित्त फुले सुगंधित भलें हें विश्व हो जाहलें
कोणाला कळलें किती पसरलें उद्यान हें शोभलें!
नक्षत्रें, सुमनें, विहगण, मुलें, काव्यें, मणी हीं जरी
नावें भिन्न, तरी फुलें सकल हीं रूपें निराळीं तरी
घेतो ह्यातुन थोडका रस पुन्हा त्याच्याकडे धावतों
देवाला स्तवितो सदा भ्रमर मी पुष्पांमध्यें राहतों

There are flowers in the sky, in the atmosphere, and on the earth, so also in my mind and the interior of the earth. I am attracted by these. This universe has become full of fragrance. But who can say how far this garden stretches. Stars, flowers, birds, children, poetry, beads, though different in name and form, are yet all of them flowers. I am like a bee whose sole business is to suck honey from tree to tree and pray to God.

His *Dry Rose* is also good. *My Country's Name* may well be compared with the *Hindustan Hamārā* by Iqbāl.

मांते! महात्मे तुझे, तत्वज्ञेते, तुझे शूर योद्धे, तुझे सत्कवी
श्रेणी ययांची सदा माझिया गे मना पूजनीं आपुल्या वांकवी
यांची यशें ज्या नव्या सद्गुणांना मला अर्पिती ध्येय ते गे जरी
सामर्थ्य नामी तुझ्या आर्यभूमी तसें पाहिलें मीं न कोठेतरी!

Motherland! thine are great persons, philosophers, heroes, and great poets. When I think of them I am compelled to bow down

whirlpool and care its banks. Those that have crossed over this river will never be troubled any more.

Moropant (1729-94) is the last great poet we meet with among the older order of poets. He is historically important as he marks the latest phase of the Classic Marathi poets. He struck a new path in *Arya* metre of which he still remains the greatest master. The subject of his poetry is of the old school and yet, like Byron, he stands forth as a revolutionary iconoclast. He is very artificial both in sentiment and expression. Hear what he says:—

भीष्म म्हणे "माते त्वां धर्मचि कथिला परि प्रतिज्ञाते ।
अत्याज्य भीति सत्यभ्रंशासि न बहु अरिप्रति ज्ञाते ॥
म्यां ब्रह्मचर्य सुव्रतनियम समुखें त्वदर्थ जो केला ।
देह त्याज्य परि न तो त्याज्य न सेवील सुज्ञ ओकेला ॥
त्यजितील पंचभूतें स्वगुणांसि रवी छवीस सोडील ।
शीतत्वातें चंद्रहि शक्रहि करविक्रमासि तोडील ॥
उष्णत्व त्यजिल दहन मर्यादेतेंहि सिंधु सोडील ।
धर्मपर धर्मराजहि सद्धर्म प्रीतिलहि तोडील ॥
परि हा शांतनव तुझा सुत केवळ कृपण मान सत्य जितां ।
मेल्याहि न टाकील प्राणासि न भीतमानस त्यजिता ॥

Says Bhishma to his mother Satyavati: 'You taught me my duty, but my vow is not to be broken because wise men are more afraid of breaking their word than even of their enemies. I took this vow for your sake, I'll rather sacrifice my life than break my word. The five elements may leave their nature, the sun may become dark, the moon may leave its coolness, Indra may lose his valour, fire may cool, the ocean may cross its limits, even the just Yama may swerve from the path of righteousness, but I'll not break my vow though I die in the effort.'

We now come to the modern poets. We see a large number of them arrayed before us, but not one of them deserves to be called a *mahakavi*. These have written a few good lyrics, have either borrowed their ideas from the West or have simply translated some English poetry. Among the original writers may be

His *Harinam-Sudhā* begins with the prayer :—

हरि-चरण-सरोजीं चित्सुधा-सार-पानें
भ्रमर परमयोगी गुंजती नामगानें
हरति सकल दुःखा हीं सुखाची निधानें
वद वद वद जिव्हे वासुदेवाभिधानें

O my tongue utter the names of Vasudeva, who is a store of bliss and removes all troubles. Just as bees suck the honey and hover around the lotus so also great ascetics drink the nectar of divine knowledge and concentrate on Hari.

He has also rendered some Sanskrit pieces into Marathi :—

मलिन रुधिरमांसावेगळें हाडदैवें
अवचट मिळतां तें श्वान संतोष पावे
क्षुधितहि गजहंता जंबुकातें न मारी
अवसरिं समजावी क्षुद्रता आणि थोरी

When, by chance, a dog finds a bone without any flesh or blood it is pleased with the discovery. Though hungry a lion will never attack a jackal. Greatness and meanness are, then, according to one's nature.

क्षीरानें दिधले स्वकीय गुणही नीरास आत्माश्रयें
त्या क्षीरास हुताशनें श्रमवितां तें तोय मेलें स्वयें
झाला ताप विशिष्ट अग्नि वदनीं तें दुग्ध जेव्हां पडे
तेव्हां धांउनि तोय शीतल करी मित्रत्व हें चोखडें

Milk gave its properties to water when mixed with it. When boiled, the water evaporated. Milk now began to flow over and water was thrown to quench the fire. This is friendship!

आशा थोर नदी, मनोरथ तिचें पानीय, वीची तृषा
स्त्री-पुत्राद्यनुराग हे जल चरें जेपूर्ण कूलंकषा
संसार-भ्रम भोंवरा गरगरी चिंताच जीचीं तटें
तीतें जे तरले मुनीश न कधीं ते पावती संकटें

Hope is a river, desire its sweet water, waves its thirst, attachment to wife and children a crocodile, the world is a

He who has suffered with the world, has undergone all sorrow, becomes fit for beatitude.

Compare this with what Shivi says :—

न त्वहं कामये राज्यं न स्वर्गं ना पुनर्भवम
प्राणिनां दुःखतप्तानां कामये दुःखनाशनम

A Hindi poet said :—

जो तू आया जगत में जगत सराहै तोय
ऐसो करनी करि चलो पाछै हंसो न होय

and Ramdas says :—

तनू त्यागितां कीर्ति मागें उरावी
मना सज्जना हेचि क्रीया धरावी
मना चंदनाचे परी त्वां झिजावें
परी अंतरीं सज्जना नीववावें

Do deeds that your fame may survive you, like sandal suffer thyself, but please others and make them full of fragrance.

We may bring this portion to a close by a prayer:

भजन रहित रामा सर्वही जन्म गेला
स्वजन-जन-धनाचा व्यर्थ म्यां स्वार्थ केला
रघुपति मति माझी आपलीशी करावी
सकळ त्यजुनि भावें कांस तूझी धरावी

My life is past without devotion. In vain did I love my relatives and wealth. Direct my mind towards thyself so that leaving all else I may be attached to thee !

Coming to Vamanpandit, the last of the great galaxy of poets of the age of Sivaji, we may note that he died in 1695, at a time when Aurangzeb was sweeping down the Deccan with the Mughal armies. Vamanpandit is very voluminous. He wrote the *Yatharth-dipika* (a verse commentary on the *Bhagvat-Gita* like the *Gyaneshwari*), the *Nigamsar*, and others in Marathi and the *Sidhant-Vijaya* in Sanskrit. He has left many minor works besides. We shall give here only a few extracts from him.

verses called the *Manach-e-Shlok* मनाचे श्लोक are attributed to him. His advice to Sivaji

मराठा जितका तितुका मेळवावा
महाराष्ट्र - धर्म वाढवावा

Bring the Marathas together and increase the Maharashtra religion, was characteristic of his patriotism. Like Kabir and Nanak he became the founder of a school of thought, and his band of followers came to be known as the Ramdasis after him.

He died in 1681 after remaining a *Brahmacharin* all his life. As is apparent from the extracts, he writes in colloquial Marathi, and seldom thinks of the right word.

आतां वंदूं कवीश्वर । जे शब्द-सृष्टीचे ईश्वर
नातरी हे परमेश्वर । वेदावतारी ॥
कीं हे सरस्वतीचें निजस्थान । कीं हे नाना कळांचें जीवन
नाना सद्विद्यांचें भुवन । यथार्थ होय ॥
कवि सृष्टीचा अलंकार । कवि लक्ष्मीचा शृङ्गार
सकळ सिद्धीचा निर्धार । ते हे कवि ॥
ऐसे पूर्वी थोर थोर । जाहले कवीश्वर अपार
आतां आहेत पुढें होणार । नमन त्यांसी ॥

Now let us salute the Bards who are the makers of speech, verily they are God, the embodiment of highest knowledge, they are the abode of the Muses, the lives of arts, the abode of true knowledge. Poets are the ornaments of creation, the embellishment of Lakshmi, the basis of all attainments. There have been a few such in earlier ages, but a few will be later on, to them also do we bow!

In another place he sings:—

जो संसारदुःखे दुखावला
जो त्रिविधतापें पोळला
तोचि अधिकारी झाला
परमार्थासी ॥

believed, but staunch supporters of *grahastha-ashrama* or household life. Their ideal was not the one of Buddhist or Christian monks but the one best suited for all grades of life. To us it seems to be a vernacular rendering of the message of the *Bhagvat-Gita* which says

कर्मण्येवाधिकारस्ते मा फलेषु कदाचन । मा कर्म फलहेतुर्भूर्मा ते संगोऽस्त्वकर्मणि ॥

It was no new ideal to them, for the *Yajur-Veda* says:—

पश्येम शरद: शतं जीवेम शरद: शत
श्रृणुयाम शरद: शतं प्रब्रवाम शरद: शत—
मदीना: स्याम शरद: शतं भूयश्च शरद: शतात

and again

कुर्वन्ने वेह कर्माणि जिजेविषेच्छतं सभा
एवं त्वमिनान्येथ तोऽस्तिन कर्म लिप्यते नर

But, as we said before, there are not wanting men who take a different view of life. Malūkdās, for example, says:—

अजगर करें न चाकरी पंछी करें न काम
दास मलूका यों कहै सब के दाता राम

Now compare this with the teaching of Jesus:—

'Which of you by taking thought can add one cubit unto his stature? And why take ye thought for raiment? Consider the lilies of the field, how they grow; they toil not, neither do they spin: and yet I say unto you, that even Solomon in his glory was not arrayed like one of these.' Matth. vi. 27 *et. seq.*

We now pass from Tuka to Ramdas—Ramdas was the name given to him, later on as his devotion to Ram grew, his name was Narayan. Born in the same year as Tuka, he was a Rig-Vedi Brahmin. It is said that his father lived on the banks of the Godavari, near Jamb, but he early left his parents and at last settled down at Parli, which was renamed Sajjangadh from the large assembly of learned men gathering round Ramdas. His relations with Sivaji are matters of common knowledge.

The *Das-bodh*, the fragmentary *Ramayana*, and a collection of

When the mother cuts the throat who dare protect the child? When the king confiscates all who can ward him? Says Tuka the thread of the universe is in thine hands.

Elsewhere he says:—

त्रैलोक्य पाळितां उबगला नाहीं
आमचे त्या काई असे ओझें
पाषाणाचे पोटी बैसला दर्दूर
तया मुखी चारा कोण घाली
पक्षी अजगर न करी संचित
तयास अनंत प्रतिपाळी
तुका म्हणे तया भार घातलिया
उपेक्षीना दयासिंधु माझा

Not tired of taking care of the universe how can He feel any burden for me. When the toad is inside a stone who feeds him there? Fowls and beasts have no granary and yet does God provide for them! Says Tuka if I throw my burden on Him, He will not leave me!

This may be compared with the Persian:—

سپردم بتو مایهٔ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را
and
کارساز ما بہ فکر کار ما
فکر ما در کار ما ازار ما

and contrasted with the Hindi verse:—

जब दांत नहे तब दूध दियो अब दांत दिये तोका अन्न न देहे ।
जो जलमें थलमै नभ में सबको सुधि लेत सो तेरो हू लैहै ॥
काहे को सोच करै मन मूरिख सोचकरै कछु हाथ न ऐहै ।
जान को देत अजान को देत जहान को देत सो तोहू को दैहै ॥

Strangely enough the meaning of this has been lost sight of—its lessons are never learnt and acted upon. Except for a few poets, Hindi poets have been, not Sanyasis as is sometimes

for the Heavens I shall have to return after the exhaustion of the fruits of my meritorious acts. If I desire long life, I am already eternal as there is no death for the soul. Says Tuka I ask only oneness, because oneness is indivisible.

Thus addressing God he says :—

कोठे गुंतलासी योगियांचे ध्यानी
आनंद कीर्तनीं पंढरीच्या
काय काज कोठें पडलीसे गुंती
कानीं न पडती बोल माझे
तुका म्हणे कोठें गुंतलेती सांगा
किती पांडुरंगा वाट पाहूं

Art thou engaged where saints are meditating on thee, or art thou busy hearing the pleasant songs at Pandhari? In what act art thou involved that thou canst not hear my prayer? Says Tuka tell me where art thou engaged, how long shall I wait for thee?

The intensity of his passion may just be imagined when one suddenly hears him burst forth :—

केव्हां भेटसी केशवा

When shalt thou meet, O Keshav?

भेटिलागीं जीवा लागलीसे आस
पाहें रात्रंदिवस वाट तुझी

Day and night I am waiting in expectation of thee! My soul is yearning after thee!

तुका म्हणे एके वेळे देईं भेटी
वोरसोनि पोटीं अलिंगावे

Says Tuka meet me but once and closely embrace me!

माता कापी गळा । तेथें कोण राखी बाळा
राजा सर्व हरी । तेथे दुजा कोण वारी
तुका म्हणे हरी । सूत्र तुम्हां हातीं दोरी

Like a mine of diamonds amongst the gutters, the blue diamond amongst the precious stones, so is Marathi amongst a host of languages.

Remarkable indeed is this attachment and patriotism at so early a date !

We now come to the greatest figure in Marathi literature—Tukaram. He was born in 1608 and died at the age of forty-one. Just like our Tulsi, he was indifferent to his home life and devoted himself to God. Tuka was essentially a love-lyrist, but he never defiled his pen by writing of earthly ephemeral beauty. He is rapt in Bhakti and in this is on a par with Tulsi. Sings Tuka:—

सिचन करितां मूळ । वृक्ष ओलावे सकळ ।
नको पृथकाचे भरों । पडों एक मूळ धरों ।
पाण चोन्याचें दार । वरिल दाटावें तें थोर ।
वश झाला राजा । मग आपुल्या त्या प्रजा ।
तुका ह्मणे धांवा । आहे पढरी त्रिसांवा ॥

Watering the root is useful for the whole tree. Do not vainly strive after the many but fix thy attention on the One Cause. Instead of stopping each streamlet it is better to dam the river. When the king is pleased the subjects also follow his will. Says Tuka, our shelter is Hari.

And

काय मागावें कवणासो । ज्यासो मागों तो मजपाशों
जरो मागों पद इन्द्राचें । तरो शाश्वत नाहों त्याचें
जरो मागों ध्रुवपद । तरो त्यासो येथोल छंद
स्वर्ग-भोग मागों पूर्ण । पुण्य सरल्या मागुतो येणें
आयुष्य मागों चिरंजोव । जोवा मरण नाहों स्वभावें
तुका ह्मणे एक मागें । एकपणा नाहों भंग

What shall I ask of thee ? Whatever I wish is already with me. If I ask for the throne of Indra it is not eternal, if I become fixed like a Pole-star yet is it influenced by the world. If I ask

When a difficulty befalls him, He takes it on Himself. Nama's servant says that thus God becomes subservient to his disciple.

In Hindi it was said :—

अंसुअन जल सींच सींच प्रेम बेलि बोई ।
अब तो बेलि फैलि गई आनंद फल होई ॥

Nearly the same idea is brought out by Eknath (1528–1608) when he sings :—

पीक पिकलें प्रेमाचें । सांठविलें गगन टांचें ।
भूमी शोधोनी पेरिले बीज । सद्गुरु कृपें उगवलें सहज ।
एकाजनार्दनी निजभाव । विश्वंभरित पिकला देव ॥

Love's crop is ready, it has grown in abundance. The seed was sown in a suitable soil, and it has easily grown by the kindness of the Lord. My feelings are centered on my teacher Janardan (God). It is He has thus manifested Himself.

It is well known that Goa was at this period the centre of Christian Missionary forces. In 1616 was brought out by the Jesuit Fathers a book in Marathi poetry which dealt with the Biblical Saga. The object of writing such a book is described as

परमशास्त्र जगीं प्रगटावया
बहुतां जनां फळसिद्धी व्हावया ॥
भाषा बांधोनी मराठिया
कथा निरोपिली ॥

To disseminate knowledge among the masses, so that the largest number may enjoy the fruit of it, this story has been given in Marathi.

Then speaking of the greatness of the language it says

जैसी हरळांमाजी रत्नकुइळा
कीं रत्नांमाजी हीरा निळा ।
तैसी भाषांमाजी चोखळा
भाषा मराठी ॥

Kshatriya, Vaishiya, women, Shudra, and untouchables go by different names until they reach me.

Namdev the next illustrious poet is said to have flourished in the fourteenth century and may have lived into the first quarter of the fifteenth century. He thus preceded our Kabir by at least a quarter of a century. Being a great devotee, his conception of God is of a devoted friend and not one of servant and master. Here was a re-valuation of life—an Umwerthmy aller wertbe. He prays :—

उडालो पक्षिणी गेलो अंतराळो । चित्त बाळाजळी ठेवूनिया ।
तैसें माझे मन राहो कां ईश्वरो । मग सुखें संसारों असेन कां ॥
धेनु चर बनों वत्स असे घरों । चित्त वत्सावरो ठेवूनि फोरे ।
विष्णुदास नामा विनवो परोपरो । हें प्रेम श्रीहरी द्यावें मज ॥

The bird flew away, but her mind is with her offspring, likewise let me remain in the world; yet must my mind aspire towards God. Cattle graze in fields but think of their calves. Nama, the adorer of Vishnu, persistently asks of you to give him this kind of love.

And again,

देह जावो अथवा राहो । पांडुरंगो दृढ भावो ।
चरण न सोडों सर्वथा । तुझो आण पंढरिनाथा ॥

Let me live or perish, let me be unswerved in thy love! I swear by thee I'll not forsake thee!

His servant, Janabai sings :—

ज्याचा सखा हरो । त्यावरि विश्व कृपाकरो
उणें पडों नेदों त्याचें । वारे सोसो आघातांचें
तयावोण क्षणभरो । कदा आपण नव्हे दुरो
आंगा आपुलें वोढोनो । त्याला राखे जो निर्वाणों
ऐसा अंकित भक्तांसो । म्हणे नामयाचो दासो ॥

When God is friendly the whole universe is kind. When the devotee lacks anything he is provided soon. Hari helps him in his misfortunes. Even for a moment He does not leave him.

तूं आनंदमय स्वयंप्रकाश । कैवल्यदाता परम ईश
तूं निजरूपें अविनाश । निराकार ॥
तूं निःसंग निरंजन । तूं निरंतर अभिन्न
नाहीं तुजसमान । कोणी देवा ॥
तुजयोग अन्य न देखों कोणी । ह्मणोनि आणिकांतें न मानों ।
हा मस्तक तुझिये चरणीं । ठेविला सत्य ॥

Bow to thee O Lord, thou art the bestower of bliss, thou art kind, Almighty, and Infinite! Blissful, Effulgent, Eternal, Formless, Desireless, Invisible! There is none equal unto thee. I do not find any one to match thee, therefore I do not consider any one. I have kept my head at thy feet.

Marathi poetry can be easily put into three broad divisions:—religious, didactic and love lyrics. Another element, that of descriptive poetry is also met with. We shall give some extracts to illustrate the wealth of Marathi.

Vithalpant had three sons: Nivrittinath, Gyandev and Sopandev, and one daughter Muktabai. Of these, our hero Gyandev was born in 1275 at Alandi near Poona, and died at the same place in 1296. Thus he flourished at a time when the Muslims had not entered the Deccan. But unfortunately we have no picture of society as he found it, for we do not know what he wrote. The two great books which keep his name alive are the *Amratanubhava*, and the *Gyaneshwari* named after him. It is a commentary in verse on the *Bhagvat-Gita* and shows how the Maratha mind had independently arrived at the conception of Bhakti.

Gyandev sings:—

कां खैर चंदन काष्ठें । हे निवंचना तंवचि घटे ।
जंव न घापती एकवटे । अग्नि माजी ॥
तैसे क्षत्री वैश्य स्त्रिया । कां शूद्र अंत्यजादि इया ।
जाती तंवचि वेगळालिया । जंव न पवती मातें ॥

The distinction between sandal and wood is apparent only so long as it is not thrown into the fire. In like manner

TENDENCIES IN MARATHI POETRY

FREDERIC HARRISON regards music as a better test of the moral culture of an age than its painting, sculpture, or architecture. Poetry takes its place just after music as it combines in itself all the merits of the Muses. Learning good poetry is a 'discipline which works deeper than any other discipline in the range of our schools', was the testimony of Matthew Arnold who had served long enough both as teacher and Inspector of Schools. Such being the importance of poetry, we have attempted to give here the salient features of Marathi poetry. And as Dr. W. Peterson of McGill University said: 'Not the least of the links that binds may well be found in the appreciative study of the same poetry, undertaken in the days when the heart is young.'

Marathi poetry may be classified into the earlier and the modern poetry. It is in the rank of the older poets that we meet with the familiar names of Gyandev, Eknath, Tukaram, Ramdas, Vamanpandit and Moropant. Among the modern writers may be mentioned the names of Rev. N. V. Tilak, Keshavsut, Govindagraj and Balkavi. We now propose to examine them in detail.

The foundation-stone of our poetry was laid at the time of Prithviraj, and it is quite natural that it should be heroic in nature. But Marathi poetry had its origin in a different way. The beginnings of English poetry may be traced to the hoary age of Cædmon who died about 680. In like manner Marathi poetry is traced back to Mukundraj (leaving aside the large body of the Mahanubhava literature for the present), who is said to have flourished soon after Sankarachariya, the traces of whose philosophy are found in his works. We know nothing definite about him. Only one example may be given of his poetry.

ओं नमो श्रीसद्गुरुनाथा ॥ तूं परमप्राप्तीचा दाता
कृपा-सिंधू जो समर्था । अनंता अपारा ।

VERSE

Sing me a song, dear,
    Sing me a song.
    Sing
    Oh! Sing
    Tired and full of woe am I.

Sing me of beasts in the forests,
    Of wild fish in the ocean,
    Of cannibals;
Never of man
    Or of me.

We live from day to day
    In the lap of death.
Yet, never knew our yesterday,
    Never know the coming day.

We gulp in
Our own kith and kin
From day to day,

Yet talk of peace, and love and truth,
God's kingdom and humanity
    Ahimsa and Ashram.

S. A. L.,
Osmania University College.

not got enough dirhems and A is willing to give him credit for a time, it is not allowed; the legal trick for this is that A shall take the dirhems the changer has got, and then should give them back to him on a loan, and then again change the dinars for the dirhems, and so on, if need be, till he (A) exchanges all his dinars.[1]

III. *Legal trick to allow the sale on credit of specie.* If A wishes to sell B dirhems for dinars on credit, it is not allowed. The legal trick to allow it is that A shall purchase from B some goods and give the price (dirhems) and take the goods; then B shall purchase back the goods for dinars on credit; the credit for price is allowed.[2]

Conclusion

Our comment will be confined to one or two remarks, for we have already commented in the sections themselves. We want to point out that the legal tricks made possible the decrees enforcing usurious contracts by Mohammedan courts. The transactions of usury were made by the parties who adopted the legal tricks in the form of contracts of sales, and as such enforced. In the case of Bai-bil-wafa, the product of the land 'sold' was not only decreed to the lender, but, as we have seen, much solicitude was shown to safeguard his interest. And it was in the form of a legal trick that at last usury received legislative recognition by the Caliphs of Turkey, as the commentator of Dur-i-Mukhtar informs us.[3] The comforting theory of Mohammedan jurists on the Firman of the Sultan of Turkey was that the duty of the judges was to carry out the law laid down by the Sultan. Beyond this, they said nothing and kept a discreet silence—discreet because the implication is plain that the Sultan, if he thinks it necessary in the public interest, can pass a law which violates the law of the Koran, if not in form (for it was a legal trick and the transactions in a legal trick are good in form) certainly in effect and intention.

[1] *Ilâm.*, ii. 87, 17-19. [2] *Ibid.*, ii. 87, 19-21. [3] *Rud.*, iv. 243.

MIR SIADAT ALI KHAN,
B.C.L. and D. Phil. (Oxon.)

Note.—This is a part of the thesis submitted at Oxford by Dr. Mir Siadat Ali Khan. It is reproduced here from the *Journal of Comparative Legislation and International Law* (vol. xi, part iv) to which our thanks are due.

general or particular stand on the same footing as of absolute necessity [i.e. in justifying the relaxation of law].'[1]

The usury consists in allowing the proceeds of the land sold to the purchaser, i.e. the lender. There are ample provisions made to safeguard this interest of the lender: 'The purchaser [lender] can draw all benefits from the land sold as he draws from his own property';[2] 'the purchaser becomes the owner of the usufruct';[3] 'the proceeds of the vineyards and the rent of the house [sold] are allowed to the purchaser [lender].'[4] 'The vendor [the borrower] cannot get back the vineyard by giving back the loan on the eve of vintage until after the vintage.'[5] 'If the parties agree to cancel the contract, the lender will none the less have a portion of the proceeds, the portion to be determined by the length of the time the lender was in possession.'[6] After some difference of opinion it was finally settled that the rent of the house 'sold,' whether the house is rented to the third person or to the borrower himself, is allowed to the lender.[7]

The jurists have discussed at length the character of the Bai-bil-wafa, viz. whether it is a sale, or a mortgage or an invalid sale, like that of a sale under duress.[8] We are not concerned with this question. The right opinion, however, seems to us to regard this sale as a composite sale, for it partakes of the character of all the three sales.[9]

We do not think it necessary to give instances of the legal tricks to evade the various other categories of usury; for in the previous section we have already given a number of them. Mâliki law prohibits these legal tricks; they are to be allowed, according to the Hanafi and Shâfi'e law, as legal tricks are allowed in these schools. But let us add one or two legal tricks to evade the hard rules of the law of Sarf.

II. *Legal tricks to evade the rule of immediate delivery in Sarf.* If A wishes to change dinar[10] for dirhems, and if the changer has

[1] Abdur Rahim, 296. [2] *Fusul.*, i, p. 411. [3] *Op. cit.*, p. 415.
[4] *Op. cit.*, p. 416. [5] *Op. cit.*, p. 418. [6] *Op. cit.*, p. 433.
[7] *Op. cit.*, p. 421. [8] *Op. cit.*, pp. 416-37.
[9] *Op. cit.* p. 414; also *cf.* Abdur Rahim, p. 296; also *Fatawa 'Alamgiri*, Bk. III, ch. 20, p. 268.
[10] A dinar is a gold coin and a dirhem is a silver coin.

report from him, allowed it, if the borrower is under dire necessity.[1] The legal trick mentioned in (2) above seems to have been the general way adopted to get loans on usury; for Ibn-Qayyim remarks with much exasperation that as the usurers know the sales to be fictitious and unreal, they have kept a 'golden article,' and some have kept an article and all such sales are made about them.[2] There are a few variations of the second kind of the legal trick given in *Fatawai Qâdi Khan*, but we have no space for them here.[3]

(*b*) *The legal tricks to legalize loans on usury by a peculiar kind of sale of land.* The sale is called Bai-al-Wafa or Bai-bil-wafa. It is a sale on condition that when the vendor pays back the price, the purchaser will return the land. The sale is illegal because of the illegal motive, the motive being to legalize usury,[4] and because of the vitiating condition, for no sale for a time can be allowed.[5] But the jurists hold that they have allowed the sale and hold the condition binding because of the need of men, the need, viz., of getting loans on usury. The author of the *Fusul-ul-'imâdi* then refers to the need of the people of Balkh and Bukhârâ for loans on usury in these words: 'We have legalized the sale because of the need of the people, especially in our countries; because of the need, the people of Balkh have legalized by making it a custom, "the loan and the hire of the vineyard,"[6] although, as it is well known, the hire of the vineyard is not allowed. And the people of Bukhârâ have legalized by making it a custom, "the long lease of the vineyard," the lease of the vineyard being prohibited they could only give the lease by making a sale, viz., the Bai-bil-wafa of the vineyard.'[7] As Sir Abdur Rahim points out, the jurists by acting thus have resorted to the well-known principle of Mohammedan law, viz. 'Needs of men whether

[1] *'Ilâm.*, ii, 75, 8-10. [2] *'Ilâm.*, ii. 95 Bas. [3] *Qâdi Khan*, ii, 512.

[4] We have already seen that the principle that motive even when illegal does not invalidate a contract is unsound. See pp. 73-4.

[5] Sales for a time are not allowed in Mohammedan law (*Fatawa 'Alamgiri*, iii. 268). The jurists therefore propose that the condition shall be made after the contract as a promise; and they hold the promise binding. We have already seen the effect of such a condition in making a contract void. (See note to p. 77, *supra*.)

[6] The letting of the vineyard in consideration for the loan, if we understand aright.

[7] *Fusul.*, i. 414.

tricks to legalize loans on usury are called *Al-eyanah.* These may be made in three ways.

(1) A asks a loan from B at the rate of 20 per cent interest. B agrees. A then places an article before B and says to him that he sells the article for 100 dirhems. B purchases the article, gives A 100 dirhems and takes the article. Then A asks B to sell the article for 120 dirhems, and B agrees. Thus the borrower (A) gets a loan of 100 dirhems and gets back the article, and the lender (B) gets a claim against him (A) for 120 dirhems.[1]

(2) Another legal trick. The lender, B, sells to the borrower, A, an article for a price on credit and hands over the article to him (A). Then A sells it to a third person, C, for less than he purchased it for; C then sells it to the lender B for the same price for which he (C) purchased it from A, so that the article might go back to him (B); C takes the price from B and gives it to A. Thus the borrower gets the loan, and the lender the 'profit.' This is the legal trick which Mohammed (ibn-al-Hasan, the disciple of Abu Hanifa) has mentioned. . . . It is related from Abu Yusuf (the other famous disciple of Abu Hanifa) that (the legal trick under consideration) is allowable and is deserving of heavenly reward. The parties to the transactions deserve the heavenly reward because of flying from what is prohibited (usury).[2]

(3) A needy person comes to another person and asks for a loan of 10 dirhems; the lender does not want to give a loan because of the greed of getting more, which he would not get in the case of a loan; thus he says to him: 'I cannot afford lending; but I sell you this garment, if you please, for 12 dirhems, although its price in the market is 10 dirhems, so that you would be able to sell it for 10 dirhems in the market.' The borrower agrees, and the lender sells the garment to him for 12 dirhems; and then the borrower sells it in the market for 10 dirhems, so that the lender gets a 'profit' of 2 dirhems from this 'business,' and the borrower gets a loan of 10 (at 20 per cent).[3]

The legal trick in (3) above Ibn-Qayyim says is the least bad of three ways; and that Imam Ahmed Hanabal, according to one

[1] *Qâdi Khan*, ii. 512. [2] *Qâdi Khan*, iii. 513.
[3] *Fatawa 'Alamgiri*, iii. 268.

days, for a garment for 10 dirhems on credit for thirty days; and thus it is obligation for obligation and as such prohibited.[1]

If A sells to B, say, a garment for 100 dinars on credit till a certain date, and then B asks A for the revocation of the sale offering to give A 10 dinars on cash, the revocation is not allowed: for it is regarded as the sale of dinars for dinars on credit. It is also considered as the sale of dinars and goods for dinars: for B gives the 10 dinars and the garment for the 100 dinars he has to pay under the sale.[2]

These illustrations shall suffice; we have chosen one or two illustrations of the evasion by means of two valid sales or a sale and a revocation, of each of the most important categories of usury. The rigour of the Mâliki law and the extent to which it carries the suspicion of the illegal motive of the parties is perhaps most apparent from our second illustration; for the second sale in it is made after a time. *Mudawwanah* suspects the illegal motive even if the second sale is made after six months.[3] If we do not think the cases given in the *Mudawwanah* and other books on Mâliki law purely imaginary, then it is clear that all the rules of usury were evaded as early as the time of Mâlik; for there is a ruling from Mâlik himself on almost all cases. Below we will give a few typical illustrations from which it will be quite evident that the legalizing of usury by means of legal tricks, beginning with Abu Yusuf and Mohammed, the disciples of Abu Hanifa, in the latter half of the second century of Islâm, was ultimately openly acknowledged in legal books of the following centuries as allowable.

A Few Instances of the Legal Tricks allowed by the Hanafi and the Shafi'e Jurists

I. *Legal tricks to legalize loans on usury.* (*a*) The two or more apparently valid sales of which the legal tricks consist may be made for a movable thing or for land. Let us first take those legal tricks wherein the two or more apparently valid sales are made for a movable thing. The most well-known and easy legal

[1] *Mudawwanah*, iii. 20-22. [2] *Bidâyah*, ii. 117. [3] *Mudawwanah*, iii. 184, 12.

the legal trick to legalize loan with excess by means of two valid sales. [1]

A sells to B a garment for 10 dirhems on credit for some time and then purchases it back before the time for 5 dirhems cash and a garment of the same kind or some other thing. The sales are not allowed because they result in a sale on condition of a loan, which is one of the categories of usury. This is so because A gets back the garment, and thus it is as if he (A) lent B five dirhems for, say, a month on condition that B should sell the garment with the 5 dirhems.[2]

If A owes B some money to be paid on a certain date, and on that date A purchases from B some goods for a part of the debt on condition that the remainder may be delayed till a future date. This is again a sale on condition of a loan, and not allowed. [3]

If A sells B two garments for 10 dirhems on credit for two months, and then A purchases back one of the garments for 5 dirhems on cash and a garment on cash. The sales are not allowed, for they evade the two rules of usury, viz. a sale on condition of a loan, and the sale of pieces of silver and a garment on cash for pieces of silver on credit. The former rule is evaded because the transactions may be regarded as if A *sold* the two garments on credit for 5 dirhems, and B *lent* him the 5 dirhems on cash on condition that he (B) would get it back at the end of the two months. The second rule is evaded because the transactions may be regarded as if A sold B the two garments and the 5 dirhems on cash for 10 dirhems on credit.[4]

A sells to B a garment for 10 dirhems on credit for a month, and then purchases it back for a garment of the same kind on credit for fifteen days. The sales are not allowed because they result in an obligation for an obligation. For, as A gets back the garment the sale about it is meaningless and the remaining transaction is to be regarded as if B sold a garment on credit for fifteen

[1] Introduction to *Mudawwanah*, iii. 193, 11-14, and p. 194, 1-2.
[2] *Mudawwanah*, iii.
[3] *Ibid.*, iii. 190, 3-4.
[4] *Ibid.*, iii. 183, 8-12.

that illegal motive invalidates a contract; and how, whenever they suspect the illegality of the motive of the parties to a contract, they hold the contract null and void. These illustrations of the rigorous prohibition of all sales amounting to legal tricks will be followed by a few illustrations of the legal tricks allowing usury, held valid by the later school of Shâfi'e and the later Hanafi jurists.

Sales held Illegal by the Mâliki Jurists because they suspect them to be Legal Tricks.—If A sells to B a garment for 100 dirhems on credit for a month and purchases it back from B for 150 dirhems on credit for two months, and takes the 100 dirhems at the end of the month, the sales are not allowed; for it is the sale on credit of dirhems for more dirhems; in other words the sales are prohibited because they result in the 'usury of credit' and 'usury of excess.'[1] The following sales are also prohibited for the same reason: A sells to B a garment for 100 Muhammadi dirhems on credit for a month, and then purchases it back for 100 Yazidi dirhems on credit for a month. The sales are regarded as a legal trick to legalize the sale on credit of Muhammadi dirhems for the better kind of Yazidi dirhems, or to evade the rules of usury of excess and credit.[2]

If A sells to B 10 ardebs (measures) of wheat for 10 dirhems on credit for a month and delivers the wheat to B, and after some time A purchases from B 8 measures (ardebs) of wheat of the same kind for 10 dirhems on credit for two months; the sales are not allowed because the jurists suspect them to be a legal trick for loan with excess; for the result of the sales is that B gives to A at the end of the month 10 dirhems, and takes them from him (A) at the end of two months; while A gives to B 10 measures of wheat and he (B) returns to A 8 measures out of 10 after they have been with him for some time and the two measures go to him in the bargain. Thus the two sales will be regarded as two transaction of loans, each party lending the other, on condition that A shall give B an excess of two measures as interest; the motive of the parties will be suspected and they will be regarded as doing

[1] *Mudawwanah*, iii. 182, 2-6. [2] *Ibid.*, iii. 182, 6-7.

Speaking of this need of the legal tricks, a Hanafi jurist is reported to have said: '. . . Similarly, a person may be under dire necessity, and he may not find somebody to lend to him without interest: the legal tricks to circumvent the law of usury will be a way out from the hardship. If he does not take the way out he and his family will be lost. God cannot have intended such a law: and His *shari'at* which applies to all men cannot intend to create such a hardship. Thus there are here only three alternatives, of which one must be adopted: the person either shall ruin [lose] himself and his family, or take a loan on usury openly, or do the legal trick to evade the law of usury.'[1]

It will be seen that the Hanafi jurist has overshot the mark. If the case of the needy person is of dire necessity, Mohammedan law recognizes the principle that 'Necessity knows no law,'[2] and the needy person, to save his life, might openly take a loan on usury just enough to keep his body and soul together; for 'what is allowed [because] of necessity is limited to the necessity.'[3] But let not the exaggeration of this jurist prevent us from seeing the real question. Society cannot do without taking loans. In the case of agriculture, for example, the whims of the weather and the uncertainties of the harvest compel the farmer to have recourse to loans. Loans cannot be had without paying interest. History shows that the experience of every age and every country is the same. Thus the precept of the Mohammedan law that all loans shall be free seems to be impracticable. The Hanafi and Shâfi'e jurists, it seems to us, quite early realized this. Their remedy by way of legal tricks is, in our opinion, an euphemism for their acknowledgment of the insufficiency of the precept that all loans shall be free, i.e. without interest. But as their method was that of legal casuistry, it only solved half the problem, and that in a clumsy way. Loans on usury were in effect legalized, but no regulations were devised to curb the insatiable greed of the usurer from sucking the blood of his victims.

It remains for us now to show first, by a few select instances, how the Mâliki jurists who shut their eyes to the need that prompted the legal tricks enforce rigorously their sound legal principle

[1] *'Ilâm.*, ii. 84, 12-15. [2] *Al Ashbah*, 108, 4-9. [3] *Ibid.*, 108 -10.

execution of this sentence; and there was no such certainty in the case under consideration.[1]

In short, let us repeat that the attempt of the Shâfi'e and the Hanafi jurists to maintain that motive is always a non-essential in considering the validity of a contract, and that a contract is to be allowed even when the motive is palpably illegal, is unsound on general legal principles, and unsupported by any convincing authority from the founder of the Mohammedan law. Credit is due to the Mâliki law for taking this view. From the legal point of view the Mâliki law on this question is sound. It is amazing that the acute Hanafi and Shâfi'e jurists erred in this matter; it requires, we think, an explanation.

The Need that prompted Legal Tricks.—The explanation is the need that prompted these legal tricks. The need is that of a 'way out' of the laws that press too hardly; the simple and rational way out is to amend, repeal or abrogate the laws. But as certain laws are regarded as Divine and Immaculate in Mohammedan law—the laws hinted at or at best very briefly dealt with in the Koran—this way out is impossible. So there remains a great deficiency in the Mohammedan system, viz. the power to revise or abrogate the laws of the Koran and the traditions that owing to the change of times may have become insufficient and create a hardship. The legal tricks supply this deficiency, by the method of legal casuistry, necessary because of the doctrine that we must regard the principles (the laws of the Koran and the traditions) as immutable. It was on account of this service rendered by the legal tricks that the Hanafi and the Shafi'e jurists decided for their legality, although their legal position was not sound.

[1] If the proposition falls, the conclusions also fall; therefore, the two conclusions which Shâfi'e has drawn from the decision of the Prophet in the case of Li'an (see *supra*, p. 72) fall. The conclusion, especially, that 'a sale shall not be held void because of any condition agreed to by the parties before or after the making of the contract, if the contract is itself free from the condition,' is important as it is the 'fundamental basis' of the legal tricks. But as the principle of this condition and the principle that motives are irrelevant to a contract are correlatives; and as we have already seen, that this latter principle is unsound on general legal principles and unsupported by authority, the same holds true of the principle of the condition as well. But let us note that Ibn-al-Qayyim has a lengthy discourse on this point (*'Ilâm*. ii. 62, 25–29, etc.) as on legal tricks (pp. 47–137) generally. This point is dealt with by him under the heading of 'the barring of the means to illegal contracts'; for, by holding that illegal motive and a condition made before the contract makes a contract void, the means to illegal contracts are barred.

Secondly, the case of jesting.[1] The legal consequences of the words creating a contract of marriage or of the words pronouncing a divorce or manumission bind the person who speaks them, although he is jesting and does not intend them. We submit that these cases are exceptions, and the very fact that the Prophet selected them for mentioning shows that they are exceptions. The reason, as pointed out by Ibn Qayyim and others, is that 'a right of God' is involved in these contracts; the jest is taken seriously, for 'it is not desirable that a man shall jest with his Creator.'[2] In other words, the Prophet, owing to the importance of these transactions, thought fit to lay down as law that there shall be no jesting with them. Thus, it is not right to generalize from these cases, for the exceptions cannot be the rule. We may add that, on general legal principles the tradition has not much to commend itself. Its justification is, however, the great rashness of the fiery Arabs; they were too free with divorce especially: it is meant to teach them deliberation, the necessity of thinking before acting. It is similar to the salutary rule that when a divorce is complete there can be no remarriage before the wife has been not only married *de jure* to a third person but has cohabited with him *de facto* and has been divorced by him.

Thirdly, the case of Li'an.[3] Shâfi'e's contention is that in the case of the wife of Hilâl the Prophet acted upon the statement made by her, although there was strong evidence of probability that she was telling a lie: and this proves the principle, he says, that we 'shall judge by the external deed and leave the motive behind to God.' But we submit that the great jurist forgets that she was taking an oath; and an oath is regarded as an evidence;[4] the fact, then, is that the Prophet preferred the evidence of oath to the evidence of probability. If this be so, how can this tradition be said to be authority for disregarding motives, and evidence of probability? We must not forget that the alternative to acting upon the oath of the wife of Hilâl was capital punishment for fornication. And it is well known that Mohammedan law, on the authority of its founder, requires the utmost certainty for the

[1] *Supra*, p. 72. [2] *'Ilâm.*, ii. 59, 16. [3] *Supra*, p. 72.
[4] 'Li'an is a testimony confirmed by oath' (Hamilton's *Hidâyah*, ch. x, p. 123.)

without reference to the motives of the parties; and this, as we have said above, is true in general, but is subject to the important limitation that the motive shall not be illegal; the attempt of the jurists to ignore the question of the legality of the motives is, as we have seen, unsound on general legal principles. But Shâfi'e at least goes beyond this. He means by the dictum that 'God alone knows the motives of the man', that 'indirect evidence,' that is the evidence of circumstances or probabilities, is not to be accepted. And he includes the evidence about any condition not part of a contract, but agreed to before the making of the contract, say a condition before making a contract about the repurchase of a thing by the vendor at a cash price far less than the price on credit on which he sold it, and which results in usury as we have already seen, among such inadmissible evidence.[1] This position is again untenable. Ibn Qayyim rightly disposes of it briefly by saying that the great majority of the Mohammedan jurists accept this kind of evidence and base their decisions upon it;[2] and indeed no system of law can do without accepting evidence of this kind.

It remains for us now to scrutinize briefly the instances which have been advanced on the side of Shâfi'e and by him in support of his view that motive is immaterial for the validity of a contract, although we have already seen that on general legal principles the opinion is not sound.

First, the tradition which begins with 'I decide according to what I hear,' etc.[3] We submit that the tradition hardly bears out even one part of the contention of Shâfi'e, viz. that the Prophet judged by the external deeds only; for he decided after hearing the evidence, that is, after taking whatever steps were possible legally to find out the truth about the suit. The tradition is a moral exhortation, meant to appeal to the conscience of the successful but undeserving party.

[1] See *supra*, p. 73.
[2] '*Ilâm.*, ii. 60, 5, 12-15, 15-30.
[3] *Supra*, p. 72. It may be noted that this and the following tradition are not cited by Shâfi'e himself, but are given by Ibn Qayyim as they support the contention of Shâfi'e. We selected these two traditions for treatment because the traditions cited by Shâfi'e himself are weaker still; like the tradition of Li'an discussed in the pages above and the following pages.

But when it is illegal the contract should no doubt be held void absolutely.

The following analysis by Ibn Qayyim of when motives are essential to a valid contract is interesting: 'A person who uses words creating a contract either intends what he says or he does not; if he does not intend, as in the case of a person under duress, no obligation binds him; if he intends, then either he knows what he is saying or he does not; if he does not know the meaning of what he says or does not keep it before his eyes at the time, then again, he is not bound by the legal consequences of his words. There is no disagreement among the Mohammedan jurists on this point. If he knows the meaning of his words and their implications are clear to him, then either he intends them or not: if he intends them, then the legal consequences of the contract will bind him; and if he does not intend using them, then either he intends the contrary or does not intend anything whatever. In the latter case, viz., when he does not intend more than uttering the words, he is jesting; we shall explain the legal consequences in this case a little later on. And if he intends the contrary, then either he intends what is legal or what is illegal; if he intends what is legal, as, for example, if he says about his wife that she is his mother, meaning in his love and respect, and not meaning divorce, the legal consequences of his words will not bind him; if circumstantial evidence bears him out, otherwise his mere assertion without evidence will not be accepted. And if he intends what is illegal, as for example if he intends usury by the words of a sale, or the avoidance of poor-tax by the words "I have made you the owner of my property," then the law will see that his object is not realized; for, if the law were to allow the realization of his object (by allowing and enforcing the contract), it would be the enforcing of what is forbidden, the avoidance of an obligation, the aiding and abetting of a sin, and the dismemberment of the *shari'at*.'[1]

Now take the second argument of the Hanafi and Shâfi'e jurists that 'God alone knows the intentions (motives) of the man.' By this they mean partly that contracts shall be allowed

[1] *'Ilâm.*, ii. 57, 58.

Thus there was a strong probability that the woman was taking false oaths, and yet the Prophet decided according to her own statement: 'He judged by the external deed[1] and left the motive behind the deed to God.' From the decisions of the Prophet in the case of Li'an, Shâfi'e draws two conclusions. Even an evidence, (and) a probability, stronger[2] than the evidence in the sales or transactions which are regarded by the Mâlikis as a means to something illegal and prohibited, e.g., usury, is not to be acted upon; this being so, the evidence in the sales which are means to something illegal is to be regarded as insufficient; and these sales 'shall not be held void[3] because of any condition agreed by the parties before the making of the contract or after making it, when the contract itself is free from the condition, or because they are a means to something illegal, or because the motive is bad (illegal).' The second conclusion is that 'it is forbidden to a judge[4] to pass a judgment against a person except on the most favourable interpretation of his statements; even when the statement contains a probability unfavourable to him (the person), the judge will have authority if he gives preference to the favourable interpretation.'

Now it must be said clearly and definitely that the above arguments of the Hanafi and the Shâfi'e jurists are on general legal principles not sound. Take their first argument that motive is immaterial to the validity of the contract. That is true in general, but it cannot be true always. It is true that motive is external to the essentials of a valid contract. But no legal system can shut its eyes completely to the motives of the parties to a contract. Certain motives must be declared illegal for the welfare of society. Contracts to commit crime, for example, valid though they may be in all the essentials of a valid contract, must be null and void on account of the illegal motive of the parties. In short, it cannot be denied that on sound legal principles, freedom of contract has got to be limited; and the legality of the object of the parties must be an essential of every valid contract: motive is immaterial for the validity of a contract so long as it is legal.

[1] Viz., her statement supported by her oath.
[2] '*Ilâm.*, ii. 51, 13-14.
[3] *Ibid.*, ii. 51, 25.
[4] *Ibid.*, ii. 50, 25-26

purchases a weapon, and his motive is to kill somebody, the contract is valid, and the motive is immaterial to the validity of the contract of purchase. Thus, motive being external to the essentials of a valid contract, it does not prevent a contract valid in all essentials, from being operative, obligatory and enforceable. This is so, the jurists of the two schools assert, and this is their second argument, because 'God alone knows the motives of the man.' 'We can only judge the external deeds, and leave the motives behind to God.'[1] 'The decisions of the Prophet regarding all civil rights and crimes' were based, Shâfi'e declares, upon this principle of judging the external deeds and not questioning the motives.[2] As for civil rights, one example is the tradition in which the Prophet declared that 'I decide according to what I hear: if I give a judgment entitling a party to what really belongs to the other party, he shall not take it, for it is really a piece of hell-fire which I carve for him';[3] another example is that the Prophet has said that 'he who jests with the words that will make a binding contract of marriage, or with words that pronounce a divorce or declare a slave free, shall be taken to have meant the words seriously.[4] As for crimes,[5] Shâfi'e gives the example of Li'an.[6] In the tradition about Hilâl ibn-Omeyyah the Prophet is reported to have said that 'were not this the law of Li'an, as laid down by the Koran, I would have decided about the woman differently.' The law of the Koran referred to by the Prophet, Shâfi'e explains, is to decide according to the statements of the husband and the wife—ignoring circumstantial evidence. In this case[7] the woman, before taking the fifth oath, faltered, and it seemed for a moment that she was going to admit adultery; she even said that she was not going to dishonour her tribe by her admission of adultery; and that is why she took the fifth oath.

[1] '*Ilâm.*, ii. 85, 27.
[2] *Ibid.*, ii. 50, 21-22.
[3] *Ibid.*, ii. 51, 27-28.
[4] *Ibid.*, ii. 51, 26.
[5] The Arabic word is *Hudood*. These are offences the punishment of which is specified by the law on account of the right of God. As it includes theft, fornication and slander, we have taken the liberty to render it by the word 'crime.' But it includes, e.g. 'drinking of wine,' and Li'an as well. Thus we beg to point out that the division of the offences in the two laws is not quite similar.
[6] 'Li'an in the language of the law, signifies testimonies confirmed by oath on the part of a husband and wife, in case of the former accusing the latter of adultery' (Hamilton's *Hidâyah*, ch. x, p. 123).
[7] *Nail*, vol. vi, pp. 202-3.

because they are *prima facie* perfectly allowable; or shall they be disallowed because the motive behind the sales is to legalize what is illegal, viz., usury. The Hanafi and Shâfi'e jurists hold that the contracts of the sales are to be allowed: because, in the words of Shâfi'e, 'Contracts are legally established by the external evidence that they were properly concluded: the motive of the parties to the contract with which they concluded the contract is immaterial; it does not invalidate the contract.'[1] The Mâliki jurists hold that the contracts of the sales are not to be allowed because, though in some cases the motives of the parties to the contract are immaterial, in other cases 'motives determine the legality or illegality' of the contracts;[2] and in the sales under consideration the motive of the parties is illegal, and therefore the sales are to be held null and void. Thus the legal point raised by these sales, which are one of the best known[3] legal tricks to evade the law of usury is, 'whether the judge shall always restrict himself to the external form of the contracts, although the motive behind them is palpably illegal, or shall the contracts be rendered void because of the illegal motive?'[4]

The Arguments for and against the Question whether Motive determines the Legality or Illegality of Contracts.—The main legal arguments of the Shâfi'e and the Hanafi jurists for holding that the motives of the parties are immaterial in considering the validity of a contract are two. In the first place, motive is external to the essentials of a valid contract. If the parties to the contract are competent, if the thing about which the contract is made answers to the description of 'mâl,' or property, if the offer and acceptance are duly made so that there is a consensus of wills and the contracting parties are of one intention, of their own free choice, and the contract is not made dependent upon any conditions, the motive with which the parties concluded the contract is irrelevant: it will not render the contract inoperative or unenforceable. For example, if a person purchases the juice of grapes, and his motive is to make wine of it, the contract of purchase is valid, and the motive is immaterial to the validity of the contract; or, if a person

[1] *'Ilâm.*, ii. 51, 25.
[2] *Ibid.*, ii. 48, 24-26.
[3] *Ibid.*, ii. 62, 15-16.
[4] *Ibid.*, ii. 62, line 8, p. 71.

THE MOHAMMEDAN LAWS AGAINST USURY AND HOW THEY ARE EVADED

THERE is ample evidence in the law-books and in books of literature,[1] law and history to show that the hard rules against usury were evaded from an early time. In books of literature and history we find them simply disregarded, and in books of law we find methods explained by which the rules can legally be avoided. The tide seems to have begun quite early. The founders of the three schools of the law are arrayed in opposite ranks on the question of the legal tricks to evade the law of usury: Abu Hanifa and Shâfi'e have allowed the legal tricks, while Mâlik and his disciples have prohibited them emphatically. This very difference of opinion is evidence of the presence of the question as early as the first quarter or so of the second century of Islâm.

In this article we will first state the legal point arising from the question of the legal tricks, followed by a very brief mention of the main arguments of the jurists for and against; then we will state the need that prompted legal tricks; and then we shall give a few illustrations of the contracts prohibited by the Mâliki schools because the jurists of that school regard them as legal tricks; this will be followed by a few instances of the legal tricks as allowed by the Hanafi and the Shâfi'e schools.

The Legal Point arising from the Question of the Legal Tricks.—When a person sells, say a garment, to another person for 100 dirhems on credit, and then purchases it back for 50 dirhems cash, there are two contracts of sale, perfectly valid in themselves if they are looked upon separately, as is quite clear. But if they are taken together it is obvious that these two valid contracts of sale become a legal trick to get a loan of 50 dirhems for 100 dirhems. The question is, shall the sales be allowed

[1] *Jawbari*, p. 29, lines 5-25, etc.; *Manuscript Oriental* 9586, p. 14 (British Museum); *Agâni*, xvii. 140.

our opinion, the conception of the abolition of war will be quite impracticable as long as this world is inhabited by man in his present psychological mood.

Conclusion

The protocols and pacts, the treaties and conventions for limiting armaments and outlawing war are quite useless, because inspite of them the competition in armaments is going on as in pre-War days, armaments are daily increasing, and the danger of war is ever present on account of the antagonisms in international relations. Unfortunately, no effective instrument has yet been devised to control international relations and curb the jealousies of the states. With all its ravages, calamities and miseries, war is inevitable and, try what we may, we can never get rid of it. The attainment of the ideal of perpetual peace is almost impossible, and the ideal of internationalism, that is to say the subjection of national interests to the considerations of international well-being, is still beyond the sphere of practicability. Humanity has not yet progressed so far and there is no hope of it even in the future, where the achievement of this ideal could become a possibility. War is a necessary evil and will exist in this world as long as human beings are divided among different religious, political, national, and racial groups whose aims and ideals are quite distinct from one another, and as long as the plurality of states remains.

LIEUT. ALI AHMAD,
Old Boy.

War and Human Nature

Why do men fight and kill one another? The answer to our question should be sought in human psychology. Psychologically there are three primary groups of instincts to which all mankind is subject; they are the instinct of self-preservation, the instinct of nutrition, and the sexual instinct. These groups of instincts influence man whether he be in a primitive condition and living a free individual life in the state of nature, or organised into society and living a civilised life. There is also a fourth instinct which we will call herd instinct or the community sense. This instinct acts most powerfully on men bound together as a tribe or nation, and at certain times it becomes all-pervading and influences men in such a manner that the three above-mentioned instincts cease to work altogether. This 'community sense' has been responsible for thousands of years for warfare and bloodshed on this planet.

The nature of man is composed of many elements, and as nations are nothing but sum-totals of human beings they are influenced by the same passions and impulses which affect their component parts. Like individuals, nations are never reconciled with their lot; they also strive after new gains. Every nation wants to accomplish its desires by some means. There is sure to be a clash between the wishes of different nations, and it is only a short way between diplomatic rupture and the clash of arms. Each nation wants to gain its object by political negotiations, and if these fail, the matter is left to the arbitration of the sword.

It is in the nature of man to fight. In his primitive condition he fought individually on account of personal grievances. When bound into a society he fought collectively for the common cause of his tribe; and in his modern stage becoming cultured and civilised and organised into different national groups, he is still warring with other such groups for the realisation of his national ideals. We are sure that he will continue to fight as long as he remains divided among diverse political groups. Human nature is unchangeable and it is a law of human nature to fight, so, in

and up to quite recent times the battles consisted chiefly of hand to hand combats. Man being a gregarious animal did not live for long in the isolated and individual state; necessity soon compelled him to join in the tribal link, and the common aims and purposes strengthened the tribal relations. When these different groups of men were formed and fought against each other war in its present sense originated, for now if there came about a clash of interests they tried to settle it not individually but collectively, and this deliberate use of organised physical force by one group against another is called war.

It is an undoubted fact that the tribal or communal instinct is so intense that sometimes even the slightest cause is sufficient to provoke a bloody and relentless war, and even to this day this kind of warfare is not extinct. The tribal conflicts of the Arabs, and the communal riots in India are wars of this category. By the submergence of tribes into different national groups the tribal sense has sunk into the idea of nationalism, and consequently the wars of to-day are largely national wars. The national sense is as intense as the tribal instinct of old, and the policy of mutual jealousy and hatred which is current nowadays is the sure outcome of this ideal. The opposition with which the political and economic interests of one nation are met on the part of other nations is the chief cause of international conflicts in these days.

The history of the world is to a great extent made up of wars which occurred between different tribes, communities, and nations. In the beginning, the methods and means of warfare were very simple in form and character, and with the progress of humanity they did not decrease but developed by leaps and bounds. The march of civilisation and culture never retarded and hindered the evolution of war, and the inventions of arts and sciences accentuated the process of its perfection. The wars of modern times are most ruinous and annihilating in comparison with those of the past, and it is certain that every war of the future will be bloodier and more destructive than the preceding one. New engines of destruction are invented daily, and every step taken in the direction of progress and culture is perfecting the means of warfare,

influence it at some special time and place, so the scope of impressions produced by actual experiences is limited. Amongst this agglomeration of inconstants the evolution of the art of war was very difficult, so its development took place very slowly until it took its present form. It was necessary to make sound deductions from experience, reflection and comparison when dealing with war, but this could not be done on account of personal tendencies of those many who dwelt on it.

In war the things which are inconstant and ever changing are its means and its methods; the element which does not change is its object. War is nothing but a duel on an extensive scale, and its object has been, still is, and, in our opinion, will ever be, the compulsory submission of the enemy to our will. As in a duel the opponents try to disable their adversaries, so also in a war the opposing states try to compel their enemy to submit to their will. Physical force—army, navy, air force, poison gases, etc.—is the means, and complete submission of the opposing state is the real object of hostilities. The object of war is essentially the same for all ages, although its causes, methods, and events, and the means with which to conduct it, may differ greatly from time to time. For instance the wars of Rome against Carthage, the wars of Turkey against Europe, the Napoleonic wars and the recent World War, are, considering their objects, absolutely the same, though the causes which actuated them, the events which occurred during them, the weapons with which they were fought and the methods according to which they were conducted, are quite different and, in some cases, poles apart.

The Origin and Development of War

The history of war is as old as that of mankind. Even in the remotest and most primitive stage of man we are aware of the existence of war. Primitive man fought with weapons made of flint, then there came bows, arrows, and pikes, and with the march of time more complicated and destructive weapons were invented and the modern arms of war are their advanced type. Before the organisation of man into families, tribes and communities, the wars which occurred might have been to a great extent individual fights,

WAR AND ITS ABOLITION

Introduction

NOWADAYS we hear very much of the efforts which are being made by the politicians of Europe and America to abolish by means of international conventions that relic of barbarism—WAR—which has held humanity under a perpetual shadow of evil for thousands of years. It is a matter of common knowledge that after every war the prophets of peace come forward to preach their idealistic theories to a suffering humanity, who as a result of having undergone horrible calamities, and having endured great losses, give a ready ear to them. Hundreds of kinds of solutions are thrust on a people afflicted with the privations of war for remedying this 'collective insanity' of mankind, and the general public, without paying any heed to historical teachings, turns its gaze towards any alluring mirage. Times without numbers ideas of this kind have worked the passions of men to the highest degree of agitation against war, but on every such occasion they did not take deep root in human hearts and proved only ephemeral.

Is it possible to end this nightmare and free humanity from its baneful effects? We will try to solve this question as briefly as possible, in the light of historical perspective.

The Nature of War

War is life, and like all life is ever changing. It is beyond all description; it is infinite and free from all restrictions of principle and precedence. It has not yet attained the position of an exact science and there is no hope of its reaching this point even in the distant future. In war no two situations are identical and so its principles are very difficult in practice and their application varies according to special circumstances. Nearly every day brings new facts and new problems which require quite new solutions. Armies are confronted at every turn of their existence with new situations for which new decisions are needed. Every war has some distinctive features, because there are many elements which

be in the same condition as I had dreamt of. Ringing the bell I was answered by a maid who opened the door for me. On inquiring who lived there I got the same name and the very same story that I had dreamt of from the maid, and becoming nervous I have come to you to seek your advice.

P. All right, I will look into the case and give it my attention.

C. Then I take my leave. Thank you very much for the trouble given.

The client and the pleader after shaking hands parted. There was another rap at the door. 'Who is there?' inquired the pleader. 'I am an agent of a Life Insurance Company, and have come to see you on urgent business,' replied the man who had rapt at the door. 'Yes, come in,' said the pleader, and the agent entered the room and shook hands with the pleader.

P. May I know what are your difficulties?

The pleader was astonished to hear from the agent that the lady who had died in that house and was certified by Feroze as dead from natural causes had insured her life in favour of her husband for a considerable sum.

P. Well, I will try to help you through this.

The agent being relieved took his leave, and Rustoom being left alone soon fell into deep thought.

Suddenly a smile came over his lips and he got up and went to the phone and taking up the receiver he asked his two recent clients to come to him soon. And when they came, he went to the dead woman's husband, accompanying them in his car. And after a serious cross-questioning he proved the husband to be guilty and began to explain the proceedings to his two clients.

The husband wanted to cheat and extract that money out of the Insurance Company so with the help of a peculiar trick which he had learnt he made the wife seem dead, and made Feroze so loose-headed and dizzy-minded that he had forgotten about going to that house once before, when he had actually signed the certificate.

MIR MAKHDOOM ALI KHAN,
IV YEAR,
Osmania University College.

THE PLEADER

A Story

THERE was a rap at the door. 'Who is there?' inquired Rustoom the Pleader. 'May I come in?' asked Feroze the client. 'Yes come in,' was the curt reply of the pleader. On entering the room Feroze found an elderly man sitting at his desk engaged in some serious work. When Feroze came near the Pleader got up, shook hands and expressed his joy at their meeting.

P. Yes, I got your letter, please take your seat and let me know the details of your case.

C. The case is, that one night I dreamt that I was urgently asked on the phone to come to a certain house in Delhi. I was not familiar with the name, yet as a doctor I was in duty bound to go there. I jumped into my car and drove straight to the house where I was wanted. As soon as my car stopped at the steps the door opened for me and it seemed to me that they were anxiously waiting for me. A young man came forward and introduced himself as the owner of the house. He led me into a bedroom where a sweet lady was lying unconscious on the bed. 'This is my wife, Doctor,' said he; 'unfortunately she has not been well for a few days and she has been unconscious since I called you on the phone.'

I put my hand on her pulse and drew back aghast because the woman was dead. 'She is gone to her Maker,' said I. The news was a stunning blow to the husband who after a little sobbing asked me to give a certificate, certifying that the death occurred owing to natural causes. And I fulfilled his request. After which he thanked me, and I drove back home.

P. Is that all?

C. Yes, but I have not as yet reached my main object in coming to you. I dreamt that same dream twice again.

P. I do not see where your anxiety comes in.

C. Thinking it strange I went to that house on the morning after the third dream and curiously enough I found the house to

Here one may raise a question. Can this poetic truth help mankind as scientific truth does? .It does help to keep up the emotions, the feelings and the sentiments which were felt, seen and known in ancient times, which take in the long run, a concrete shape of the spirit of the age which becomes characteristics of nations and from which nations are distinguished from each other. If we turn the pages of any nation's poetry we come to know of their characteristic feelings in times of war and peace, of their ways and expressions on occasions of love and hatred and of their particular similes corresponding to their different nationality. Thus it adds a good deal to the stock of knowledge. It keeps fresh the spiritual and æsthetic qualities and faculties of mankind. To add to this, it helps science to realise the ideal truth, we are all struggling to achieve. Poetry is indeed the compliment of Science.

MD. ABDUL MOID KHAN,
V YEAR,
Osmania University College.

Proceeding, we find that comparison and similes form a unique characteristic of poetry. A scientist can analyse each element of a certain article and can call it by a Latin name. An artist can draw a picture true to nature in every respect ; but both will find themselves at a loss while comparing two things different to each other in one and the same object. See how Wordsworth has rightly observed human characteristics compared to those of a plant :

> The budding twigs spread out their fan
> To catch the breezy air
> And I must think, do all I can,
> That there was pleasure there.

Here is another example of comparison, from Cowper.

> How fleet is a glance of the mind
> Compared with the speed of its flight,
> The tempest itself lags behind,
> And the swift-winged arrows of light.

Look at Shakespeare's metaphors :

> .Life is but a walking shadow, a poor player
> That struts and frets his hour upon the stage
> And then is heard no more : It is a tale
> Told by an idiot, full of sound and fury
> Signifying nothing.

See how these two things—life and theatre, life and a tale, seemed to us wholly different, but they are now true in comparison.

So far, we have seen the content of poetry. There is another aspect of truth in poetry. Through spontaneous expression we discover the true man who composes the ideas. His experience and his personal views on life are true to the poet as well as to those who look up to life with the same experience and from the same angle of vision as the poet did. These are truths no less than those found in other branches of learning, let it be Science or Art. So it is wrong to say that poetic truth is ' Truth of madness '. It is now clear that we misunderstand poetry in thinking that in poetry ' reasonings are just and premises false.'

along with other forms of human effort, are striving to reach, there is no difference. In this respect science is no less Utopian than poetry in the eyes of its critics. However great the achievements of science may be, the 'divine discontent' will ever create Utopian visions. Perhaps it was with this view that Professor Thorp said 'There is no truth cognizable by man which has not shaped itself into poetry'. Indeed, there is a truth which every one admits to be true, at least in his own age. This truth can be nothing but self-convincing to those who are seekers of truth. Now let us see if this is to be found in poetry. Leaving aside the religious and philosophic doctrines which find their way into poetry and which are inevitable results of the spirit of the age, there are other aspects of truth in poetry. There are truths in description and expression, truth in comparison and similes, and truth in revealing the self. This can be illustrated by selecting some stanzas from English poetry alone.

The first function of a poet is to express what he feels, to describe what he sees in nature and to depict what appeals to his mind. Is this not true interpretation of life? Shelley is true to feel—

> Smiling they live and call life pleasure
> To me that cup is dealt in another measure

Again see the descriptive power of Shelley:

> Higher still and higher,
> From the earth thou springest
> Like a cloud of Fire,
> The blue deep thou wingest
> And singing still do'st soar and soaring ever singest.

See how this picture takes a concrete shape in our imagination. Indeed, Sir Philip Gibb has well said that on such occasions we say not: 'How beautiful!' but: 'How True!'

Now let us examine the criticism of life. Here is Wordsworth deploring the condition of London (1802).

> The homely beauty of the good old cause
> Is gone; our peace, our fearful innocence
> And pure religion breathing household laws.

TRUTH IN POETRY

IN our days of materialism, poetry is often discarded for its myths and mystery. Poetic truth is supposed to be a 'truth of madness'. To some, poetry appears to be Utopian literature. To some its 'reasonings are just and premises false'. Here in this short essay we shall try to correct these misunderstandings about poetry.

Mankind has long been in quest of truth. All branches of knowledge are nothing more than varied forms of this struggle. It has been rightly said 'All literature, art and science is valueless unless it endeavours to express truth truthfully'. But the most difficult question is: What is the Truth? Are those theories evolved in the old laboratories true? Every day a new discovery comes to light and throws the old problem back into darkness. Are the aphorisms, maxims, and doctrines of our philosophies true? Many of them are no more current beliefs. So the truth of yesterday is not always the truth of to-day. One scientist differs in opinion from another, and one philosopher from another, an artist from a brother artist. Once there were no more than four elements known and it was then a truth. There are 89 or more elements now, and this is now truth.

To Spinoza, the world is all material and to Berkeley and Hegel it is all illusion of senses. So the truth of one person is not truth of another. The morality of one country may not be that of another. If it be a fault of ignorance or prejudice, the same things can be applied to those truths which are often discarded for their supposed false appearance. Whatever be the case, the truth—the ideal truth for which each branch of knowledge is striving to attain, is still as unknowable as the self was unknowable to Carlyle and as the vital elixir was still undiscoverable by the late famous scientist Edison. This ideal truth may seem Utopian, but modern inventions were also regarded in the past as Utopian. With regard to this ideal truth which both science and poetry

thereby? In this connection I remember a very interesting story about two most distinguished men in India,—one the greatest poet of to-day, the other the greatest politician India has ever produced. Tagore, in one of his letters to Gandhi asked him why he did not take any interest in poetry, and why devoted himself wholly to politics. Then Gandhi, our exalted political leader, replying to his letter wrote, 'Dear Tagore, a song cannot soothe the starving millions of India, they want only one poem and that it is life-giving food'. It is here that politicians show their greater importance. The poet feels and sings, but politicians feel and act. Poets express their passions and emotions in their songs. Politicians' passions and emotions work in their own bodies; and acting is more useful than singing; for, battles of freedom are fought not with words but with deeds. It is not the beautiful songs of Tagore, but a heart-felt cry of Gandhi that has roused the political consciousness of the masses of India to such an extent as had never been experienced even in Italy and Germany when they overthrew their respective ancient regimes. Poets get for their rewards praises, fame and name. Politicians get through their endeavours freedom, emancipation and liberty. Tagore won the great Nobel prize of poetry. Gandhi, let us hope, will one day get Swaraj. Well now, I put you this question: 'And which of them is more useful to our nation?' The answer comes undoubtedly, Swaraj and not the Nobel prize. And here the question is decided.

D. M. MUNGIKAR,
III YEAR,
Osmania University College.

POETS AND POLITICIANS

POETS have always occupied their mature place in my mind but when the question comes as to which of them are more useful to our nation, I shall say that the importance of poetry cannot overshadow the still greater importance of politics. It requires God-given talents to become a poet, I admit; but at the same time I say that it requires still more extraordinary and God-given talents to be a politician. Poetry, as Wordsworth said, is merely 'a spontaneous overflow of powerful feelings: it takes its origin from emotion recollected in tranquillity.' But politics is the flesh and blood of a country. Without politics and politicians a country is nothing but a mere geographical expression. Shakespeare himself says 'The lunatic, the lover and the poet are of imagination all compact'. They are fed by imagination. They live in the world of imagination. They create new worlds of their own. They describe things such as can never be found in any part of the world. Poetry can be used as an entertainment in times of prosperity of a nation; but in troubled times I shall say that it is of no use. Now, some may say that in troubled times also the eloquence of poets may well be used in inflaming the nation against the oppressor. Yes, I admit this, but still I shall say that poets lack the actual human activity which alone inflames a nation more than anything else can do. I know that there are natural songs like *Our Battle has begun*, by Chattopadhaya, but then I shall say that poets are useful to a nation only as far as these national songs are concerned. But it is not always that their talents produce national songs. Very often they soar in sweet imagination. But politicians, on the other hand, have to fight with reality. Their life is a hard struggle with hard fact. Theirs is a life of incessant self-sacrifice and adventure. They have to 'take arms against a sea of troubles and by opposing end them.' If need be, they have to lose their lives. The political history of a nation is written in the flesh and blood of a country.

Moreover, of what use is poetry to a semi-starved and half-naked nation like India? Will the poet go to a peasant who is starving with hunger, recite his poems and satisfy his hunger

LINES WRITTEN ON THE TUNGA BHADRA AT HAMPI

LOW is my grassy bed. The tallest shrub
Only a yard above the head. I can hear
At early dawn, and noon, and silent eve,
The faint murmurs of Tunga flowing by
The open field is rich with jasmine, rose and lily
The garden trees and the pleasant landscape round
Are but a vast emerald that refresh the eye.
This was the spot which once did rule Karnatic
Mighty queen of cities Vizayanagar proud,
To-day a spot which you might aptly call
The Valley of Seclusion.

VYAS.

NOTHING

THE wide, wide, and immensely populated world with its innumerable creatures and inanimate objects—with its great populace of civilised and uncivilised mortals, following different castes and creeds, and holding contradictory outlooks, and belief—with its gigantic, and sky-kissing mountains, green, fruitful, and picturesque valleys, with blossoming flowers and chanting birds with sweet, graceful, lovely maidens, with meditating philosophers, lofty-minded poets, and dignified prose writers, with all the so-called exalted beings, the world is *nothing* and all that we see is no more than an optical illusion, because ' There is nothing but God '.

MIR HASSAN,
III YEAR,
Osmania University College.

BACKBITING

ONCE a great and famous sage
Who lived afar in a long past age,
Told me of two men who had
A little talk. The first one said :
' Your enemy, I have just heard,
Abused you with a bitter word.'
The other answered, after thought :
' He shot an arrow that hit me not ;
But you lifted it and pierced my heart.
Now, was that fair upon your part? '

SHER MOHAMMAD KHAN,
I YEAR,
Osmania University College.

of their woes. Henceforth they swore to live and work and strive together to have no secrets for one another—in fact to live as brothers, I mean, as friends together.

Marvellous results followed from this reconciliation. The biscuits they jointly manufactured were always crisp and would melt into water in the mouth. The tiles they jointly manufactured were hard and lasting—not in the least fragile. For, had they not sworn to have no secrets? Each learnt the other's trade secrets and hence the entirely satisfactory nature of the products of their joint manufacture began to flourish.

So they lived happily ever afterwards with their wives and children's children.

Unfortunately I cannot satisfy your curiosity. I have not been able to locate their factories which produced light and crisp biscuits and unbreakable tiles. So you and I will have to put up with what we get.

M. NASRULLA,
I YEAR,
Osmania University College.

support of his better half. The result was, they decided to separate, each taking his share.

What was a sufficient income when they lived together, proved to be barely sufficient, when each set up house for himself. As each man's wife had little to do and no one to talk to, in the kitchen, the two ladies soon became bored, restless, envious, nasty and finally ambitious. Their husbands, therefore, began to think of schemes of increasing their incomes. 'Please note' said the ancient teller of tales, 'how effect follows closely upon the feet of cause.'

One brother decided upon biscuit manufacture, while the other set up a tile factory. The goods manufactured were not entirely satisfactory.

The biscuits had one defect. Though they looked like biscuits, they were always too hard. 'So hard were they' said the ancient 'that I lost my teeth in trying to eat them when I went to tea with the manufacturer. Don't think they fell out through age. I am not old. Not at all. Why! I have been thinking of marrying again. Only, I cannot find a girl suitably old. Old, did I say? No! No! I hate that word. I mean a girl suitably young.'

The tiles manufactured by the other brother had so only one effect. Looking at them, you could immediately say they were tiles. But they were too brittle.

So, neither the biscuits nor the tiles would sell. Stock accumulated. Their capital diminished to a vanishing point.

The Biscuit brother was at last forced to live on his biscuits, and, poor fellow, he found them hard to eat and hard to digest. Till finally he became very ill. The tile brother had to sell his house and live on it—I mean on the proceeds of the sale. To live in, he built a house of his own bricks and tiles. Alas! in the first monsoon shower, his house collapsed and the bricks and tiles melted away into a heap of mud.

These unfortunate difficulties threw the two brothers into each other's arms in spite of their wives. They wept on each other's shoulders and became reconciled. They told one another

A FOLK-TALE OF THE COAST

ONCE upon a time there was a man named——but names do not matter in folk-tales. That is one advantage of calling this a folk-tale. Moreover, in this particular tale the name of the man does not matter at all, because he died at the very beginning of the story or even before. If he had not died, there would have been no tale to tell. If he had not died in time, my stock of folk-tales would have been less by one, and that would have been a calamity, for yours truly would have missed his M. N. As you see, if you look above, I have not missed it, which is also proof positive that this is a true folk-tale, a *rara avis* in folk-lore.

I am afraid I have made a bad beginning with this tale. My excuse is, that the ancient, from whom I got this first-hand, had only two teeth in his head and those too in the same jaw and both artificial. I thought it well to mention as a further proof of the authenticity of this tale. I had better set this down just as it was told to me.

Once upon a time, a man died and left his two sons a few thousand rupees. Not too much, you know, but just enough, which, as a local proverb has it, is more than enough.

As is usual, the two brothers very soon fell out with each other. Or rather their wives quarrelled which means the same. The cause of the quarrel was trifling. One woman had preserved a little of the previous night's sardine curry as a sauce for the morning's *Nashta*; and the other woman's child ate it all up, during the woman's absence at the village well. What made the offence appear bigger was the fact that in its hurry the child broke the pot. It was a valuable one of black clay and shining and had cost as much as 9 pies, a month or two before. The loss of such a chattel is, of course, too much for a good housewife to bear without a wild protest. She protested wildly and her sister-in-law retorted wildly. Then their husbands were dragged to witness the iniquities of their wives. From witnessing, they passed on to participating in the quarrel, each in

it was my fate always to remain in a coagulated state. But no, it is not so. Your letter assures me.

You say I possess your secret. How kind of you to let me possess your secret, and I am proud of it and I will keep it close to my heart.

It is this: You love me. Oh! you love me!

Your Sour
CURD.

What do you think I did?—Enjoyed Milk or Curd?

S. KHAIRAT ALI ZAIDI,
IV YEAR,
Osmania University College.

I was extremely harassed and embarrassed and knew not how to deal with Curd. I could not go straight to her and ask what she knew of Milk and my liking. No, I could not do that even if I had the nerve for it.

So I adopted a round-about process. I wrote to her:—
My dear Miss Curd,

Will you kindly turn your attention for a moment to a wretched being who is in extremely sour circumstances and who is undergoing a coagulation of spirits. His is the case of a man who can eat nothing, drink nothing, oh! not even Milk. What is the use, Miss Curd, of congealing the vital sentiments of one who, as I have said, is already undergoing a coagulation of spirits? What is the use of teasing a man, who has already tasted bitter things and is at the point of death, about what he thinks if he does not get, he will die and which if known to your father will bring instant disaster? You already know what he wants. I tell you Miss Curd, I implore you to save him from the miserable end which awaits him and restore him to his normal condition by assuring him that you would not betray him to any one. You have his heart's secret which he would have told nobody. Keep it in your bosom and let it lie there close to your own heart.

MISERABLE WRETCH.

I received this answer:—

Dearest Man,

Can I hope, oh! say may I hope that the pangs of my loving heart can ever have an effect upon and rouse feelings of love and sympathy in the heart of one whom I so passionately adore, so deeply and so truly love, whose face is always fresh in my mind and for whom every breath that comes out of my mouth, sings songs of love?

How cruel of me, my dear, not to know that you were in such a miserable condition, that you could eat nothing, drink nothing, oh! not even Milk! Pardon me, my dearest man, for I have quite unconsciously teased you. I was sad and consequently silent for I thought you did not care. I had become almost sure that

COLLISION

An Allegory

I WAS in a great perturbation of mind and dejection of spirits for a very disastrous thing had happened that had knocked my brain out of its balance. My beloved had abused me and said she would never look at my face. To take you into confidence, the thing really is—well—er—don't you say that to any one;—the thing really is that I was staying with an old man. He had two offsprings who resembled each other as closely as milk resembles curd. To tell you the upshot, I did just what the world does: I began to like milk. Milk was very pure, white when cold and rosy when hot, had a good taste and was in every way worth liking. But the Milk-man would not give me milk. Here lay the sour part of the business. I was thirsty to get milk and milk was also ready for me, but the milk-man knew nothing of it. He had a strange apprehension and would not let Milk and me remain together, for fear I should drink away through the lips. But he knew nothing of it. No one knew anything of the Milk-process. Not even Curd.

So we sometimes informed each other of our miserable condition through the medium of letters. I said I was burning with thirst and could not quench it and Milk said she had become cold and would get condensed at any moment.

So it continued, till one day I found myself in a great perturbation of mind and dejection of spirits. Milk had refused to have anything to do with me, said that I was a worthless fellow and that thenceforward she would neither peep at my face nor care a drop for me. Let me go to the devil, I would get no more milk.

For a time I could not make out what had set Milk boiling. At last I discovered my error. I had endangered the purity of Milk. One of my sentimental prescriptions was caught. Curd had probably come to know our relationship.

within such a short period are unique. Nothing can mar his ambition to make Italy the predominant nation of the world.

Centralization in the state is the key-note of his policy. Since this achievement, a great impetus has been given for the prosperity of his nation. Trade, industry and agriculture are on the increase and their progress is marvellous. Many roads, canals, ships, railways have been constructed under his guidance and have added immensely to the national wealth. Thus stability has been brought and nation's international fame has been increased. Even the League of Nations cannot now ignore the significance of Italy, as was the case before. The homage of equality given by England, France and Japan is the highest symbol of the greatness of Italy to-day.

Only the worshippers of truth know what Mussolini is! Not only in Italy is he given a place in the heart of hearts, but in the whole world he is adored and admired. To many of his followers his name brings a divine solace and to many of his admirers it brings ecstasy. While Italy has gained by his birth, the world is benefited by his actions. 'For the ashes of his father and temples of his God' inspire him to behold the glory of the golden age of the Roman Empire. His awe-inspiring nature expects reverence from king and clown alike. Just as King George of England takes pride to shake hands with him so also Rabindranath Tagore boastfully opens a friendly conversation with him. To have a glimpse of his face has been a most enchanting duty of many a man and woman of his country. His actions oblige his countrymen to bow their heads to him. Italy by worshipping its benefactor by words and deeds has shown its love of hero-worship. To him it owes what it owes and to him it pays what it should pay! Italy, thou shouldst be proud of Mussolini the Dictator!

JANKIRAM PANT AHERWADKER,

B. A., LL.B. *Previous.*

Osmania University College.

of Mussolini this movement has been nourished, and under his patronage this movement has reached a climax. Socialism influenced his early political career but he soon found that the salvation of his country did not lie there. ' To direct action' he wholly adhered, and to it he is ever faithful.

But Mussolini did not attain such a high position without hard perseverance. The son of a cobbler, he rose to the position of prime minister and dictator. High ambitions and their fulfilment are the message of his life. A cobbler, schoolmaster, bassoonist, editor of newspapers, socialist leader and afterwards a Fascist Dictator, these are the stages through which he has passed. Now his unrivalled position in the state is not of prime minister only, but he is also the head of eight different departments. He works just like a machine without rest and without selfishness. For this reason he is sometimes called a ' devil for work '. Working for 18 hours a day has become his hobby. His life in fact is a life of labour dedicated to high ideals of humanity.

Nobility and sincerity of purpose have dominated his life. Like the skylark of Wordsworth he soars towards the heavens but does not forget the ordinary duties of life. His purity of mind is guided by the shining star of discipline. Sometimes he is harsh in his attitude but his love of discipline is at fault. Patriotism even makes him intoxicated, forgetful of the love of his wife and babes. Thrice he was shot at and thrice he escaped. ' My life will not be extinguished unless its mission is fulfilled ', are his exclamations on these occasions. His is a life dedicated to high ideals and noble aims.

Mussolini as a dictator is a supreme power in the state. The grand Fascist Council, the highest advisory body in the state, dare not oppose any action of Mussolini. His word is law and his action the only just action in the state. The newspapers and periodicals which criticise his policy are forcibly put down by his ordinances. Liberty of speech and liberty of the press, which are supposed to be the boons of the twentieth century are but

in Italy, were the persons who by their own will power guided the destinies of their countries.

But let us see what were the conditions of Italy which led Mussolini to establish peace and order and thereby heighten the international reputation of his country? His wish was that Italy by taking part in the Great War, should show to the world that she is not in any way unequal to the great powers of Europe. His country did take part, but the recompense was not satisfactory. At home, the Government of King Victor Emmanuele not only did not heed the great services of his countrymen but could not satisfy their ordinary wants also. Discontentment among the martial races was the natural outcome. Secondly, the economic condition of Italy hindered its progress. The depression in Industries and downfall in Agriculture were the general results of the Great War. The labour problem due to unemployment taxed the brains of the greatest statesmen but remained unsolved. As the clouds of socialism were floating over Italy, unrest was created by means of general strikes. Unable was the then ministry to face all these difficulties. Moreover, it had no enthusiasm to uplift the state from so depressed a condition. Mussolini with an undaunted spirit marched on Rome with 30,000 Fascist followers to sieze the reins of Government and at last succeeded in his bold attempt.

That memorial day of 31st October, 1922 is a landmark in the history of Italy. Fascismo up till now was without power, but now the power of the state came into its control. The arrival on the scene of Mussolini, the leader of Fascismo, compelled the king to hand him over the charge of the ministry. Mussolini by accepting the invitation formed his own Fascist Cabinet and thus started his career as Dictator.

The new era dawned with the birth of Fascism. 'Fascism is a movement of youth,' he once said. It is a military organization brought forth to inculcate the idea of nationalism based on the basic principles of discipline and order. Every Fascist is a soldier wearing a black shirt and marching under the banner of a bundle of sticks. Capitalists and labourers are valued on the scale of nationalism. Under the wise guidance

MUSSOLINI THE DICTATOR

(Paper read before the Historical Society on 5th November, 1931).

THE fame of Italy rests in the name of Signor Mussolini. His is a glorious name which has brought honour to his country, increased the reputation of his nation and realized the dreams of the ancient Romans. To-day, newspapers and magazines describe his personality in letters of gold. Italy of to-day is being made and remade by one single person only who is all in all in the state. What can be more important than his policy as a dictator by which his country is guided? The historic importance of Mussolini is based on the fact of his new creed of dictatorship!

To-day, Mussolini is Italy and Italy is Mussolini. But this seems to be a great revolution in the present age of democracy. The idea of government of the people by the people and for the people, appears to be upset, and government by the best man has come into existence. This new plant of dictatorship has been nourished on the ashes of democracy. This was not due to the ambitious nature of any man but to the time and the circumstances. They proved that the so-called most beneficial principles of democracy are of no use for the present world. The pendulum began to swing from one end to the other and finally the ultimatum was given: 'Thou art a failure, Democracy'!

Was not the wind blowing quite against the democracy? After the Great War, the sovereignty of the state was paralyzed in the hands of the people and it passed eventually into the hands of a single competent person. Distraction and disorder had spread throughout Europe and a strong hand was required to clear them out. To establish order and discipline were matters of sole concentration of the great statesmen and politicians of Europe. At last, that was brought about by the rise of dictators in many countries. Lenin in Russia, De Rivera in Spain, Lloyd George in England, Mustafa Kemal in Turkey and Mussolini

HIDE AND SEEK

HE shuts her eyes and the sight,
Withheld from space-bound things,
Opens to the vision Eternal.
It's all a play, a *Lila* forsooth.
But would like Radha all had known
It is Krishna who plays the game !

ANON.

TWO GEMS

I FOUND a gem and I cut it round and round,
And the more I cut, the more its lustre grew;
My cutters were but Truth and Honesty,
And its lustre but the lustre of pure love.
This gem was my true friend.

I found another gem and cut it likewise;
And the more I cut, the more its lustre dimmed;
My cutters still were Honesty and Truth,
But its lustre was the lustre of self-love.
This gem was my false friend.

SHER MOHAMMAD KHAN,
I YEAR,
Osmania University College.

prose contributions are indeed very valuable in thought, although they may not be great models of English and do not represent a vigorous and lucid style. Meanwhile England was slowly passing that stage of uncertainty and unbelief and drawing to a more definite end. We miss 'the eternal note of sadness' in his poor writings and a few touches of cheerfulness takes its place. But it is Arnold the poet, in his moments of gloom and shadow that is really famous. His poetry is the crystallisation of the best thinking of his time. It affords food for thought, because it has grown out of memories and personal sufferings.

P. V. R. NARSIAH,
III YEAR,
Osmania University College.

Again, he speaks of the uncertainty of life:—

For we are all, like swimmers in the sea,
Poised on the top of a huge wave of Fate,
Which hangs uncertain to which side to fall
And whether it will heave us up to land,
Or whether it will roll us out to sea,
Back out to sea, to the deep waves of death.
We know not, and no search will make us know,
Only the event will teach us at its hour.

His melancholy would assume yet another grace. The sound of the ebbing 'sea of religion' would ring sharp in his ear and he would burst into a wail of regret and despair. Nevertheless, he preached fortitude and courage. Later in his life he recognised a certain terrific justice in the very Nature he had spoken ill of. Nature in her unscrutable wisdom has set up limits which she does not overstep. He recognised this truth, after all. He often sought refuge from the bewildering complexity in a sort of stoic resignation.

Ah! let us make no claim,
On life's incognisable sea,
To too exact a steering of our way.
Let us not fret or fear to miss our aim
If some fair coast has lured us to make stay,
Or some friend hailed us to keep company.

In his beautiful poem *Sohrab and Rustum*, he paints a very sad picture of life. There is the guilty father sitting by the side of his dying son, his 'not unworthy, not inglorious son'. There is Ruksh standing 'with his head bowing to the ground'. There is Sohrab lying, bathed in a pool of blood. Rustum, the mighty Rustum, feels the prick of conscience. He realises that his life has been spent in bloodshed and that true peace lay elsewhere. He says:—

But now in blood and battles was my youth,
And full of blood and battles is my age;
And I shall never end this life of blood.

It is after 1867, that we find Arnold the poet and critic, converted into Arnold the prose-writer and critic of his time. His

Distressed by doubts and unable to reconcile the old faith with the new knowledge of his time, Arnold carried into his work, especially poetry, which formed his earlier production, a sort of uncertainty and unbelief, and we see that the most characteristic of his poetry is the outcome of this mood—having in its doubts a forlorn hope and pathetic bravery sadder than open despair. England of those days was to Arnold

> The weary Titan, with deaf
> Ears and labour—dimmed eyes
>
> . . . .
>
> Bearing shoulders immense,
> Atlantean, the load
> Well nigh not to be borne,
> Of the too vast orb of her fate.

His duties as Inspector of Schools were of the most monotonous and unsympathetic kind. Yet he seemed ever to act with a severe and lofty estimate of duty, to be honest and truthful. There was an intense sympathy in him for his fellow-beings. And could a man of such deep sympathy and tender heart rest without qualms of conscience? He was tormented between the longing for rest and lovely life and the sense of the terrific call of human crime for resistance and human misery for help.

In his loving study of nature, art and beauty, the cry of his country would not let him rest. The thought of the ugliness of the world about him, of the sufferings, the problems of humanity beset him and he could not put it by. Besides, the consciousness of the pains of life, weight of the world's misery—coldness and unbelief, pressed heavily upon him. He was troubled by the knowledge of the difficulty of being good. And often we find in his poetry 'the eternal note of sadness'. The world to him

> Hath neither joy, nor love, nor light
> Nor certitude, nor peace, nor help for pain
>
> . . . .
>
> . . . .
>
> And we are here as on a darkling plain,
> Swept with confused alarms of struggle and flight
> Where ignorant armies clash by night.

WAS MATTHEW ARNOLD SAD?

MATTHEW ARNOLD one of the greatest of Victorians, was the son of Thomas Arnold of Rugby. But his father and grandfather were clergymen of the Church of England. He was brought up in a religious atmosphere. He was thus by heredity and sentiment essentially religious; yet he was troubled in his mind by the new learning. By heredity and sentiment he was intensely classic; yet he found himself suddenly placed in the midst of the romantic movement in literature, that conflict of beliefs and non-beliefs, which marked a spiritual crisis.

The industrial changes of the first half of the nineteenth century brought about not only an increase of wealth but gave new chances of acquiring it, to people of every class. With the glitter of gold in their eyes, the greater mass of men became more and more selfish; they forgot mercy and pity. 'Men, women and children were sacrificed to Mammon by labour in mills and factories so prolonged and severe that it stunted and twisted their miserable bodies and darkened their miserable souls.' This modern spirit has been often assailed but no protest has been more direct and momentous than that of Arnold.

Science in making is a battle-field of competing theories. It affected the life of modern England remarkably, by its researches into history and the nature of things, by theories which touched upon the problems of man's origin and destiny. It has been a disturbing or modifying element in almost all contemporary thought and in almost every department of intellectual activity. It has both transformed life and altered the conception of life. Nay, it has penetrated the very soul within. And there was the doctrine of Evolution—a doctrine which struck at the root of men's conception of existence, excited many a thoughtful head, and attracted to its service a large proportion of the intellectual forces of England at that time.

TENALI RAMLINGA

OF all the literary people of Andhra, Tenali Ramlinga is most famous for his short stories. He was one of the eight Court-poets of Vijayanagaram Kingdom in the time of Krishnadevaraya. Almost all the stories he told are full of humour. All his stories deserve publication in collected book form. As an illustration I reproduce here a story of his.

Once the king Krishnadevaraya got some kittens and gave them to his courtiers, one each, and asked them to bring them up. The king also ordered a cow to be given to each of these people to supply milk for the kittens. So Tenali Ramlinga also got a kit and a cow.

All the courtiers paid special attention in bringing up the cats, except Ramlinga. Not a single drop of milk did he give to the cat, but took it all for his own use.

Some time passed. The king expressed his desire to examine all the cats. So he ordered them to be brought to the *darbar* the next day. All the cats were full grown and fat except the one with Ramlinga. He knew fully well that the king would be offended to see his cat starving. So he played a trick. He brought in a saucer some milk at a very high temperature and placed it before the cat. As soon as the cat put its mouth to it, its tongue was burnt. Next day the king asked Ramlinga why his cat was in such a condition, then Ramlinga replied that the cat would not drink milk at all. Surprised at this, the king ordered some milk to be brought and to be placed before the cat. The cat would not go near the saucer at all. How was the poor cat to know that milk was not hot always?

A. B.,
IV YEAR,
Osmania College.

matter. What they say is comparatively of little interest. The chief thing is how they say it. A few things of beauty are enough for them to harp upon for centuries. This is the reason why we find Saadi expressing the same idea in different words; yet we appreciate and admire his verses only for their style and elegance. Whenever he praises his own poetic genius, he always alludes to the sweetness of his tongue. Saadi's utterances are marked by pure and lofty thoughts, clarity of expression, chaste language, varied and graceful style and, above all, their high moral tone.

MASOOD YAZDANI,
I YEAR,
Osmania University College.

'the Nightingale of the groves of Shiraz', supports the well-known quatrain which includes Saadi among the three prophets of Persian poetry.

در شعر سه تن پیمبرانند
هر چند که لا نبي بعدي
اوصاف و قصیده و غزل را
فردوسي و انوري و سعدي

Saadi's Contemporary

The Atabak of Fars, probably during Saadi's exile, bestowed the title of ملک شعراء (poet laureate) so richly deserved by Saadi, on another poet, Humgar. This poet, inspite of the matchless position which he so undeservedly held, could not behold unmoved Saadi's poetic fame and gave vent to his feelings, when he was approached by his contemporaries to give his opinion on the comparative merits of Saadi and Imami. In the following line he says:—

گرچه به نطق طوطي خوش نفسیم — بر شکر گفتهاي سعدي مگس ایم
در شیوهٔ شاعري به اجماع امم — هرگز من و سعدي به امامي نه رسیم

Saadi retorting said:—

همگر که به عمر خود نه کرده است نماز
شک نیست که هرگز به امامي نه رسد

By impartial minds Saadi was undoubtedly considered as the best poet of his time. Thus, for instance another poet of his time, named Hamam, regrets his inability to compete with Saadi. He says:—

همام را سخن دلفریب و شیرین است
ولي چه سود که بیچاره نیست شیرازي

Style in Persian Poetry and the Special Character of Saadi's Ghazals

Persian poetry is before all things, an art. The Persian poets are in the first place stylists, and with them manner comes before

Many poets of Persia who lived long before Saadi were Sufis of the first rank and through their efforts Sufistic phraseology became common. The ghazal writers who preceded Saadi had also devoted their whole thought and energy to the exposition of Sufistic doctrine. So in the time of Saadi, Sufism was the current topic of Persian poetry.

Saadi as a Poet

Saadi is essentially an art poet. He studied nature and loved to reflect on the mysteries of nature. ' He gives us principles of goodness written in the Soul. ' He lifts the veil from the beauty of the world and his imagination gives colour, and life even to inanimate objects. The exposition of his imaginative outburst has grace, exquisiteness, daintiness, fancy and variety of rhyme, harmony, melody and rhythm.

Saadi as a Ghazal Writer

The ghazals of Saadi are, like all ghazal poetry, in strict harmony with the rules of Persian prosody, ' The words of love, beauty, distraction, madness, details of the pain of separation, lamentations for love, anxieties for union, praises of moles on the cheeks of the beloved, absence of patience and ease, restlessness and sleeplessness, heart-burning sighs, bitter cries, weeping and crying, weakness and leanness. On the brighter side, it also depicts the pleasures of wine, the beauty of nature and creation, the delights of cool morning breeze, the murmuring brooks and the ever-green gardens and orchards'. Side by side with the expressions of these apparently temporary delights, runs the current of Persian theology and philosophy, and Saadi has been at all times considered inferior to no other Persian poet, not even Hafiz. Indeed Hafiz himself acknowledges Saadi's superior genius in the following lines :—

أستاد غزل سعدي است پیش همه کس امّا
دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

Gusely calls him ' The bright ornament of Persia, the matchless possessor of piety, genius and learning '. Jami calling him

age and it is not at all unlikely that the works by which he is best known to us, were all written by him after he was already well advanced in middle age. His more popular work, the *Gulistan*, was certainly written after his fiftieth year, as he himself tells us in the preface to that book. It is quite likely that in his journeys too he found time to write as well as gather material for his later works. A European critic well sums up this subject in the following words :—

'Amidst the real distress of poverty and the dissipation of a wandering and unsettled life, he rose to eminence in wisdom and learning; for, ill supplied with the gifts of fortune, the most precious part of that life was a continued sojourn from city to city, from kingdom to kingdom, first perhaps led by a hope of patronage and preferment, and afterwards through choice and habit. During this period, though he began them late in life, his *Kuliyat* or works were composed, and amidst a roaming activity he contrived to write more than what another might, in a like condition, have managed to read.'

Saadi's writings were compiled about forty years after his death by a friend of his, named Ali bin Ahmad, into a *Kuliyat* of which the following are his important works :—1 *Gulistan*, 2 *Bostan*, 3 *Tayabat*, 4 *Ghazliate Qadim*, or early poems, 5 *Badai*, or rare or matchless gazels, 6 *Khavatim*, 7 *Qasaida* Farsi, 8 *Qasaida* Arabi, 9 *Pind Nama* or book of precepts, 10 *Hazliat* or Humour.

Saadi and Sufism

Saadi represents on the whole an astute, half-pious, half-worldly side of the Persian character. Mysticism was in his time so much in the air and its phraseology was, as it still is—impossible for the average mind to understand—that the traces of it in Saadi's writings are neither few nor uncertain, but it can be said without hesitation that worldly wisdom, rather than mysticism, is the chief feature of his works. Saadi by nature had only a moderate leaning towards mysticism but he was a product of his age and could not resist the current of ideas which attracted every cultivated and imaginative mind.

(2) The period of travel commenced in A.D. 1226. Owing to the incursions of the Mongols, he left Shiraz and journeyed over a large part of the world from Asia Minor to India and from Turkestan to Abyssinia. During this period he married twice. By his first wife he had a son, of whose death he gives an account in the *Bostan*.

(3) The third period of Saadi's life, namely the period of literary activities commenced on his return to Shiraz. During the last thirty years, Saad's son and successor (Abu Bukar) had so well ruled in Fars that the country had returned to its former peace and prosperity. On his return to Shiraz, he attended the said king's court and composed panegyrics in his praise and dedicated his well-known works, the *Bostan* and the *Gulistan*, to him. During this period Saadi appears to have enjoyed the highest honours ever paid to a poet. Towards the end of his life Saadi took up his abode in a hermitage outside the city of Shiraz where he devoted himself to religious meditations and where he was visited by a number of admirers, including princes and ministers. He died in A.D. 1291. His mausoleum known as Saadia is about two miles from Shiraz.

Saadi's Character

The salient features of Saadi's character were his piety, humour and wit, catholicity, insight into human character and straightforwardness. The last point is well illustrated by his frank and fearless counsels to his own patron, especially his bold remonstrance with Abu Bukar, the king of Fars, who had assisted the Mongols in the destruction of Bagdad (A.D. 1258). Nothing is more dangerous in a despotic rule than the free criticism of the conduct of the ruler, but the Sheikh pointed out the defects of the government so well that it would be difficult to speak in such a frank manner even under a constitutional rule.

Saadi's Works

Saadi's writings are typical of Eastern thought. In his works one finds matter for every taste, both the highest and the lowest. Most of his works bear the stamp of a wise and mature

SAADI

THE NIGHTINGALE OF PERSIA

His Life

THE exact date of the birth of Saadi is not known. Biographers differ in their opinions, and the date is fixed approximately somewhere between A.D. 1175 and 1194. His birth-place is the celebrated city of Shiraz, a city immortalised in Persian literature.

His *nom de plume*, Saadi, was adopted from the name of his literary patron, Saad-bin-Zangi of the Atabak dynasty, who reigned in Fars, A.D. 1196–1224. Jami, the last of the classic poets of Persia, assigns the same reason for Saadi adopting his *nom de plume*. His own name was Muslah-ud-din.

In his childhood the Sheikh took lessons in religion and its practical duties and was scarcely allowed to leave the company of his father, who kept a watchful eye over him and always observed the behaviour and the deeds of his infant boy, which the child recalls in later years in his *Bostan*, and affectionately attributes a good deal of his early training to his father. He, however, lost his father when he was still young and was probably brought up by his mother.

Saadi's life may be divided into three periods :—

(1) The period of study which commenced when he left Shiraz to join the Nizamia College at Bagdad, where he obtained a scholarship and formed a friendship with the celebrated Sufi and philosopher Shahabuddin of Suharvard. This period which lasted up to A.D. 1226 was spent mostly in Bagdad and he became a religious doctor and a Master of Literature. The Sheikh was also a linguist. He was a perfect master of the Arabic and Egyptian languages and also knew Zend.

themselves as conquerors and would hardly listen to any reconciliation. Kabir says :—

कित मनाउं पांइ पि
कित मनाउं रोइ
हिंदू पूजे देउता
तुरक न काहू होइ.

The social fusion of these two we owe, then, to Kabir. And how many are there that recognise this, and, after recognition, are ready to admit it?

It may be said in conclusion that if Kabir lacks the melody of Mira, the pathos of Sur, the grandeur of Tulsi, the sublimity of Bihari and the grace of Gang, he has a simplicity and charm of his own. Besides, his services are to be accounted the greater, as he brought peace, unity and strength, and welded the two great communities into one nation. Thus, while the others have only a literary importance, Kabir will attract the attention alike of students of History, Sociology and Literature.

B. N. CHOBE,
Osmania University College.

Then he suddenly bursts out in ecstatic rapture :—

(३) तूं तूं करता तूं भया मुझ में रही न हूं
बारी तेरे नामपर जित देखूं तित तूं

(४) कर्त्ता ऐक और सब बाजी
ना कोइ पीर मसायख काजी।

God is one, all else is false; there is no Pir, Shaikh, or Kazi, all are equal.

(५) पाहन पूजे हरि मिलें तो मैं पूजूं पहार
ताते यह चाकी भली पीस खाय संसार।

(६) लूट सके तो लूट ले संत नाम की लूट
पीछे फिर पछतावगे प्राण जावेंगे छूट।

(७) दुइ जगदीश कहां ते आये कहो कौन भरमाया
अल्लह राम करीम केशव हरि हजरत नाम धराया।
गहना एक कनक ते गहना तामें भाव न दूजा
कहन सुनन को दोइ कर थाते एक नवाज एक पूजा।

(८) चलन चलन सब कोइ कहै मोहि अंदेसा और
साहब से परिचय नहीं पहुचेंगे केहि ठौर।

Kabir's position in Hindi literature is a unique one. If *feeling* is the essence of *lyric* poetry, then Kabir must be accounted a great lyrist. He says what he feels, and his feelings are so intense that he suddenly bursts forth into song.

But it must not be forgotten that Kabir is a preacher first, second and last. His aim, like that of Guru Nanak, was to fuse the two nations that had lived together for ages and yet looked askance at each other. His teaching was ill-received at first as he himself says :—

जाहि कहूं नित आपना सोइ उठि वैरी होइ।

Both the communities discarded him and would have nothing to do with him. The pathetic prophet goes unheeded. The Hindus were there given to idolatry and class disruption, and were a down-trodden majority. The Muslims regarded

The Bhakti school outlived its utility. It was now warped by superstition, idolatry, and class-distinctions. Islam again entered India. But one greater than Mahmud was now its champion. The year when Khaja Moinuddin Chishti set foot at Ajmere, forms a land-mark in the annals of Hindustan. Islam has had a deeper influence on Indian life than one can realise at the first glance. I would here refer the student to the speech of Justice Ranade delivered before the Indian Social Conference at Lucknow in 1900 and published by Messrs. Ganesh & Co. in the *Indian Nation Builders*. But to return to the subject.

The system of Ramanuj, I have said, required pruning, and the knife was applied by Ramanand, who, according to the author of the *Bhakta-Mala*, was fifth in spiritual descent from Ramanuj. A rough idea of Indian society during the time of Ramanand can be gleaned through the Autobiography of Firoz Tughlaq (as translated in *Elliot and Dowson*, vol. iii, pp. 374–88) the first Indian royal diary before Babur. Add to this the crime, confusion, anarchy and chaos consequent on the invasion of Timur, and it will be found that India fared no better than contemporary England under the later Plantagenets.

Ramanand did away with the caste-distinctions, and laid more emphasis on Bhakti. One of the sayings attributed to him runs:

जाति पांत पूंछे नहिं कोइ
हरि को भजे सो हरिका होइ.

It was in this atmosphere that Kabir was born, and it was before Ramanand that Kabir bent his knee. Kabir's teachings may be divided into two classes: the Unity of God and Brotherhood of Man. We shall give a few extracts to illustrate these qualities.

(१) साहब मेरा एक है दूजा कहा न जाय
दूजा साहब जो कहूं साहब खरा रिसाय.

(२) सोई मेरा एक तू और नहिं दूजा कोई
जो साहब दूजा कहे दूजा कुल का होइ.

reconverted the Buddhists to their former faith, with the result that by the time of Alberuni, there is hardly a mention of Buddhism as a religion in India.'[1]

One result of Shankara's teaching was that the *Gita* came to be introduced into every family. The common folk who could scarcely understand the hair-splitting logic of Shankara, came to be guided by it. It is from the *Gita*, as we shall see, that the Bhakti school took its rise.[2]

Three centuries rolled away. India witnessed the Ghaznavide armies sweep down and across the plains. Indian society was in a bad plight at the moment. Learned Brahmins still adhered to Shankara's philosophy. But it failed to satisfy the craving of the common people, who were divided into many castes and creeds. The sources of sympathy were sapped and, had Islam been presented to them in its original purity, Brahminism would have gone the way of Buddhism. But the vandalism of Mahmud evoked a storm of opposition both political and religious.[3] It was at this critical juncture that the foundation stone was laid of the Bhakti Movement at the hands of one of India's greatest teachers —Sri Ramanujachariya. Ramanuj wrote a commentary on the *Prasthan-trayi* and showed that God is not to be sought in abstract philosophy but in Bhakti and Love. As an English poet says :—

> Devotion wafts the mind above,
> But Heaven itself descends in love.

This conception of God and personal love towards Him, and the Creator's sympathy for His creature filled the minds of the masses. They realised that their God was there to help them in every distress. They loved Him, they lived in Him.

> 'Our little systems have their day,'

[1] See Dr. Sachau's *Alberuni* (translation, in two vols.).

[2] *Vide Kabir Sahib* by Manoharlal Zutshi (Hindustani Academy) ch. II, p. 22. For detail, see Tilak's *Gita-Rahasiya* Bhakti-Marg ch. XIII and the Epilogue Secs. 2 and 5 to 7. The account given by Dr. Yusuf Husain Khan in his article 'Kabirdas and His Poetry' in *Urdu* of Jan. 1930 (pages 25 and foot-notes to pages 26-27) is rather curious, as it tries to bring home that the Bhakti Movement was a result of Islamic influence. Dr. Emile Senart holds that Buddhism 'would not have come to birth at all' but for the *Bhagvat-Gita*, which was composed long before the advent of Gautama Buddha. See the *Indian Interpreter* for January 1910.

[3] See Prof. M. Habib's *Sultan Mahmud*.

themselves as conquerors and would hardly listen to any reconciliation. Kabir says :—

> कित मनाउं पांइ पि
> कित मनाउं रोइ
> हिंदू पूजे देउता
> तुरक न काहू होइ.

The social fusion of these two we owe, then, to Kabir. And how many are there that recognise this, and, after recognition, are ready to admit it?

It may be said in conclusion that if Kabir lacks the melody of Mira, the pathos of Sur, the grandeur of Tulsi, the sublimity of Bihari and the grace of Gang, he has a simplicity and charm of his own. Besides, his services are to be accounted the greater, as he brought peace, unity and strength, and welded the two great communities into one nation. Thus, while the others have only a literary importance, Kabir will attract the attention alike of students of History, Sociology and Literature.

B. N. CHOBE,
Osmania University College.

Then he suddenly bursts out in ecstatic rapture :—

(३) तूं तूं करता तूं भया मुझ में रहो न हूं
बारी तेरे नामपर जित देखूं तित तूं

(४) कर्ता ऐक और सब बाजो
ना कोइ पोर मसायख काजो।

God is one, all else is false; there is no Pir, Shaikh, or Kazi, all are equal.

(५) पाहन पूजे हरि मिलें तो में पूजूं पहार
ताते यह चाकी भली पोस खाय संसार।

(६) लूट सके तो लूट ले संत नाम की लूट
पोछे फिर पछतावगे प्रान जायेंगे छूट।

(७) दुइ जगदोश कहां ते आये कहो कौन भरमाया
अल्लह राम करोम केशव हरि हजरत नाम धराया।
गहना एक कनक ते गहना तामें भाव न दूजा
कहन सुनन को दोइ कर थाते एक नवाज एक पूजा।

(८) चलन चलन सब कोइ कहैं मोहि अंदेसा और
साहब से परिचय नहीं पहुचेंगे केहि ठोर।

Kabir's position in Hindi literature is a unique one. If *feeling* is the essence of *lyric* poetry, then Kabir must be accounted a great lyrist. He says what he feels, and his feelings are so intense that he suddenly bursts forth into song.

But it must not be forgotten that Kabir is a preacher first, second and last. His aim, like that of Guru Nanak, was to fuse the two nations that had lived together for ages and yet looked askance at each other. His teaching was ill-received at first as he himself says :—

जाहि कहूं नित आपना सोइ उठि वैरो होइ।

Both the communities discarded him and would have nothing to do with him. The pathetic prophet goes unheeded. The Hindus were there given to idolatry and class disruption, and were a down-trodden majority. The Muslims regarded

The Bhakti school outlived its utility. It was now warped by superstition, idolatry, and class-distinctions. Islam again entered India. But one greater than Mahmud was now its champion. The year when Khaja Moinuddin Chishti set foot at Ajmere, forms a land-mark in the annals of Hindustan. Islam has had a deeper influence on Indian life than one can realise at the first glance. I would here refer the student to the speech of Justice Ranade delivered before the Indian Social Conference at Lucknow in 1900 and published by Messrs. Ganesh & Co. in the *Indian Nation Builders*. But to return to the subject.

The system of Ramanuj, I have said, required pruning, and the knife was applied by Ramanand, who, according to the author of the *Bhakta-Mala*, was fifth in spiritual descent from Ramanuj. A rough idea of Indian society during the time of Ramanand can be gleaned through the Autobiography of Firoz Tughlaq (as translated in *Elliot and Dowson*, vol. iii, pp. 374–88) the first Indian royal diary before Babur. Add to this the crime, confusion, anarchy and chaos consequent on the invasion of Timur, and it will be found that India fared no better than contemporary England under the later Plantagenets.

Ramanand did away with the caste-distinctions, and laid more emphasis on Bhakti. One of the sayings attributed to him runs:

> जाति पांत पूंछै नहि कोइ
> हरि को भजे सो हरिका होइ.

It was in this atmosphere that Kabir was born, and it was before Ramanand that Kabir bent his knee. Kabir's teachings may be divided into two classes: the Unity of God and Brotherhood of Man. We shall give a few extracts to illustrate these qualities.

> (१) साइब मेरा एक है दूजा कहा न जाय
> दूजा साहब जो कहूं साहब खरा रिसाय.
> (२) सोई मेरा एक तू और नहिं दूजा कोई
> जो साहब दूजा कहे दूजा कुल का होइ.

reconverted the Buddhists to their former faith, with the result that by the time of Alberuni, there is hardly a mention of Buddhism as a religion in India.'[1]

One result of Shankara's teaching was that the *Gita* came to be introduced into every family. The common folk who could scarcely understand the hair-splitting logic of Shankara, came to be guided by it. It is from the *Gita*, as we shall see, that the Bhakti school took its rise.[2]

Three centuries rolled away. India witnessed the Ghaznavide armies sweep down and across the plains. Indian society was in a bad plight at the moment. Learned Brahmins still adhered to Shankara's philosophy. But it failed to satisfy the craving of the common people, who were divided into many castes and creeds. The sources of sympathy were sapped and, had Islam been presented to them in its original purity, Brahminism would have gone the way of Buddhism. But the vandalism of Mahmud evoked a storm of opposition both political and religious.[3] It was at this critical juncture that the foundation stone was laid of the Bhakti Movement at the hands of one of India's greatest teachers —Sri Ramanujachariya. Ramanuj wrote a commentary on the *Prasthan-trayi* and showed that God is not to be sought in abstract philosophy but in Bhakti and Love. As an English poet says :—

> Devotion wafts the mind above,
> But Heaven itself descends in love.

This conception of God and personal love towards Him, and the Creator's sympathy for His creature filled the minds of the masses. They realised that their God was there to help them in every distress. They loved Him, they lived in Him.

> 'Our little systems have their day,'

[1] See Dr. Sachau's *Alberuni* (translation, in two vols.).

[2] *Vide Kabir Sahib* by Manoharlal Zutshi (Hindustani Academy) ch. II, p. 22. For detail, see Tilak's *Gita-Rahasiya* Bhakti-Marg ch. XIII and the Epilogue Secs. 2 and 5 to 7. The account given by Dr. Yusuf Husain Khan in his article ' Kabirdas and His Poetry ' in *Urdu* of Jan. 1930 (pages 25 and foot-notes to pages 26-27) is rather curious, as it tries to bring home that the Bhakti Movement was a result of Islamic influence. Dr. Emile Senart holds that Buddhism ' would not have come to birth at all ' but for the *Bhagvat-Gita*, which was composed long before the advent of Gautama Buddha. See the *Indian Interpreter* for January 1910.

[3] See Prof. M. Habib's *Sultan Mahmud*.

II

Kabir's Poetry

सर्वसत्व कबीर ने कहा सेश रहा सो सूरदा लाहा तुलसीरामनाम पदगाहा.

There are many Muslim poets who left their mark on Hindi literature. But of these three are accounted the greatest: Kabir, Malik Mohammad the author of *Padmavat*, and Rahman or Mirza Abdur Rahim Khan-Khana, to give him his full name. For the present we are concerned only with the first of these, reserving the other two for another occasion.

'Every poet is a product of his age'. So first let us examine the time and the spirit of the fifteenth century in which Kabir flourished. But as the movements in the fifteenth century were the product of the centuries that preceded, it would not be out of place to give a bird's-eye-view of India from the beginning of the Muslim conquest.

'The connection between India and Arabia was established during the life time of the Prophet, one of whose blessed companions sleeps on the Coromandel Coast. Later on, at the time of the second Caliph, Thana was occupied while Harsha was on the throne, and Mohlib, still later, came down from Afghanistan and took Lahore. But these attempts proved futile, and what virtually may be called the first Muslim conquest of India began with the invasion of Mohammad Bin Qasim. It was followed by Muslim colonisation and conversion in Sindh where decaying Buddhism yielded place to Islam. This forcibly brought home to the people the necessity of social and religious reform, Shankarachariya was born in 688. He went back to the *Veda* for help and guidance. Just of age at the time of Mohammad Bin Qasim's attack, he realised the enormity of Indian weakness and began the reform in earnest. He could not free himself completely from Buddhist influence. His *Prasthan-trayi*, comprising the *Brahma-sutra*, *Upanishats* and *Gita*, is modelled on the Buddhist *Tri-Pitak*. Although Shankarachariya propounded the Vedic conception of Brahm, he totally misconstrued its Philosophy of Action as Renunciation of the Buddhists. By the force of his logic, Shankara

Whatever learning he possessed, he attributed it to his teachers:—

मानिकपुर में कबीर बसे रो
मिद्हत सुन सेख तकी के रो.

(Having heard of the greatness of Shaikh Taqi, Kabir spent his days at Manikpur.) And again

काशी में हम परघट भये हैं रामानंद चिताये.

(I was born at Benares and received initiation at the hands of Ramanand.)

Kabir's date of death seems to be conjectural. Two songs give the date as follows. The first

सम्वत पंद्रह सौ पांच मो मगहर कियो गमन
अगहन सुदी एकादसी मिले पवन में पवन.

states that he died in the year 1505 of the Vikram Era at the age of fifty. While the second one says that he died seventy years later:

सम्बत पंद्रह सो औ पछतरा कियो मगहर को गमन
माघ सुदी एकादसी रलौ पवन में पवन.

Long after his death he remained popular with the masses, as is attested by Abul Fazl in his '*Ain*:—

برخے بران کہ کبیر موحد انجا آسودہ ' بسا حقایق از زبان گفت ' و کردار او امروز درمیان است - از فراخئ شرب و بلندئ نظر مسلمانان و ہندو دوست داشتے - و چون خامہ استخوان وا پرداخت ' برہمن بہ سوختن روے آورد مسلمانان بہ گورستان بردن -

ائین جلد دوم صفحہ ۸۲ نولکشور سنہ ۱۸۶۹ ع

(Many pretend that at this place is the tomb of Kabir Mowhid, and to this day they relate many stories of his sayings and actions. He was revered both by Mohamadans and Hindus on account of his wisdom and exemplary virtue. When he died, the Brahmins wanted to carry his body to be burned, and the Mohamadans insisted on burying it.) Gladwin, vol. ii, p. 16, Lond. 1800.

KABIR

I

दुहरा तो नोतन भया
पदहि न चीन्है कोइ
जिन या सबद विवेकिया
चतुर धनी होइ सोइ

कबीर

AMONG the personalities of the fifteenth century in India, Kabir stands out prominently as a poet and preacher. Little is known of his life, and that little has been shrouded by a deep mist of legendary lore. He was born, as the ballad says:—

चोदह सौ पचपन साल गये चंद्रवार एक ठाठ ठये
जेठ सुदी बरसायत को पूर्नमासीतिथि परघट भये.

In the year 1455 of the Vikram Era or as calculated by Rev. G. H. Westcott,[1] in 1398. It is believed that he was a Musalman, but the author of the *Bhakta Mala* does not aver anything about his birth or parentage.

He received his education from Shaikh Taqi and later became a disciple of Ramanand. Kabir did not know reading or writing as he himself says that he never learnt the use of pen and paper. On another occasion he says:—

तू बम्हन मैं कासी का जोलहा बूझो मोरा ज्ञाना

[1] Westcott: *Kabir and the Kabir Panth.*

what we hear, more than what we feel, 'that our whole physical life may be soaking in a spiritual atmosphere' can be gathered from the analogy of our domestic animals. 'My terrier', writes the late William James in his mellifluous style, 'bites a teasing boy, for example, and the father demands damages. The dog may be present at every step of the negotiations, and see the money paid, without an inkling of what it all means, without a suspicion that it has anything to do with him, and he never can know his natural dog's [1] life.' We may be also participating in a higher life without our being aware of it. What, then, is the contribution of Psychical Research? As it is still in its embryonic stage we should not be too harsh in judging it. When it reaches maturity it can safely be predicted that its influence will be felt in all directions of life. It has even now brought home the truth that our life is no 'walking shadow', 'not a tale told by an idiot, full of sound and fury, signifying nothing', but a mysterious force, too subtle for the intellect to grasp, ever manifesting itself in variegated hues, ever creating new forms and new values.

S. VAHID-UD-DIN,
IV YEAR,
Osmania University College.

[1] *The Will to Believe:* Is Life Worth Living?

II

Kabir's Poetry

सर्वसत्व कबीर ने कहा सेश रहा सो सूरदा लाहा तुलसीरामनाम पदगाहा·

There are many Muslim poets who left their mark on Hindi literature. But of these three are accounted the greatest: Kabir, Malik Mohammad the author of *Padmavat*, and Rahman or Mirza Abdur Rahim Khan-Khana, to give him his full name. For the present we are concerned only with the first of these, reserving the other two for another occasion.

'Every poet is a product of his age'. So first let us examine the time and the spirit of the fifteenth century in which Kabir flourished. But as the movements in the fifteenth century were the product of the centuries that preceded, it would not be out of place to give a bird's-eye-view of India from the beginning of the Muslim conquest.

'The connection between India and Arabia was established during the life time of the Prophet, one of whose blessed companions sleeps on the Coromandel Coast. Later on, at the time of the second Caliph, Thana was occupied while Harsha was on the throne, and Mohlib, still later, came down from Afghanistan and took Lahore. But these attempts proved futile, and what virtually may be called the first Muslim conquest of India began with the invasion of Mohammad Bin Qasim. It was followed by Muslim colonisation and conversion in Sindh where decaying Buddhism yielded place to Islam. This forcibly brought home to the people the necessity of social and religious reform, Shankarachariya was born in 688. He went back to the *Veda* for help and guidance. Just of age at the time of Mohammad Bin Qasim's attack, he realised the enormity of Indian weakness and began the reform in earnest. He could not free himself completely from Buddhist influence. His *Prasthan-trayi*, comprising the *Brahma-sutra*, *Upanishats* and *Gita*, is modelled on the Buddhist *Tri-Pitak*. Although Shankarachariya propounded the Vedic conception of Brahm, he totally misconstrued its Philosophy of Action as Renunciation of the Buddhists. By the force of his logic, Shankara

Whatever learning he possessed, he attributed it to his teachers:—

मानिकपुर में कबीर बसै रो
मिद्हत सुन सेख तकी के रो.

(Having heard of the greatness of Shaikh Taqi, Kabir spent his days at Manikpur.) And again

काशी में हम परगट भये हैं रमानंद चिताये.

(I was born at Benares and received initiation at the hands of Ramanand.)

Kabir's date of death seems to be conjectural. Two songs give the date as follows. The first

'सम्वत पंद्रह सौ पांच मो मगहर कियो गमन
अगहन सुदी एकादसी मिले पवन में पवन.

states that he died in the year 1505 of the Vikram Era at the age of fifty. While the second one says that he died seventy years later:

सम्वत पंद्रह सो औं पछतरा कियो मगहर को गमन
माघ सुदी एकादसी रलौ पवन में पवन.

Long after his death he remained popular with the masses, as is attested by Abul Fazl in his '*Ain*:—

برخے بران کہ کبیر موحد انجا آسودہ' بسا حقایق از زبان گفت' و کردار
او امروز درمیان است - از فراخیٔ شرب و بلندیٔ نظر مسلمانان و ہندو دوست
داشتی - و چون خامہ استخوان را پرداخت' برھمن بہ سوختن روے آورد
مسلمانان بہ گورستان بردن -

ائین جلد دوم صفحہ ۸۳ نولکشور سنہ ۱۸۶۹ ع

(Many pretend that at this place is the tomb of Kabir Mowhid, and to this day they relate many stories of his sayings and actions. He was revered both by Mohamadans and Hindus on account of his wisdom and exemplary virtue. When he died, the Brahmins wanted to carry his body to be burned, and the Mohamadans insisted on burying it.) Gladwin, vol. ii, p. 16, Lond. 1800.

KABIR

I

दुहरा तो मोतन भया
पढ़हि न चीन्है कोइ
जिन या सबद विवेकिया
चतुर धनी होइ सोइ

कबीर

AMONG the personalities of the fifteenth century in India, Kabir stands out prominently as a poet and preacher. Little is known of his life, and that little has been shrouded by a deep mist of legendary lore. He was born, as the ballad says :—

चोदह सौ पचपन साल गये चंद्रवार एक ठाठ ठये
जेठ सुदी बरसायत को पूर्नमासीतिथि परघट भये.

In the year 1455 of the Vikram Era or as calculated by Rev. G. H. Westcott,[1] in 1398. It is believed that he was a Musalman, but the author of the *Bhakta Mala* does not aver anything about his birth or parentage.

He received his education from Shaikh Taqi and later became a disciple of Ramanand. Kabir did not know reading or writing as he himself says that he never learnt the use of pen and paper. On another occasion he says :—

तू बम्हन मैं कासी का जोलहा बूझो मोरा ज्ञाना

[1] Westcott : *Kabir and the Kabir Panth.*

what we hear, more than what we feel, 'that our whole physical life may be soaking in a spiritual atmosphere' can be gathered from the analogy of our domestic animals. 'My terrier', writes the late William James in his mellifluous style, 'bites a teasing boy, for example, and the father demands damages. The dog may be present at every step of the negotiations, and see the money paid, without an inkling of what it all means, without a suspicion that it has anything to do with him, and he never can know his natural dog's [1] life.' We may be also participating in a higher life without our being aware of it. What, then, is the contribution of Psychical Research? As it is still in its embryonic stage we should not be too harsh in judging it. When it reaches maturity it can safely be predicted that its influence will be felt in all directions of life. It has even now brought home the truth that our life is no 'walking shadow', 'not a tale told by an idiot, full of sound and fury, signifying nothing', but a mysterious force, too subtle for the intellect to grasp, ever manifesting itself in variegated hues, ever creating new forms and new values.

S. VAHID-UD-DIN,
IV YEAR,
Osmania University College.

[1] *The Will to Believe:* Is Life Worth Living?

psychical processes going on within us, even moulding our conscious behaviour, without having any corresponding physiological processes. A mere reference to the post-hypnotic suggestions should suffice. But the facts adduced by Psychical Research in favour of immortality are not entirely convincing. To assert that we can communicate with our friends and foes who are dead and gone, through the agency of the so-called mediums, is open to grave objections. With the remarkable exception of the late Mrs. Piper whose integrity of character was vouched for by men of sound and sober judgment, almost all the mediums were caught in the very act of cheating. The system of cross-correspondence, though given much prominence by Sir Oliver Lodge, is not wholly immune from hostile criticism. For a proof of the immortality of the soul we should not search without, but look within. Our condition, perhaps, is akin to that of the children in Maeterlinck's *Blue Bird* who sought the desired object in every nook and corner while it was with them all the while. There are some mystical moments in our life when it dawns upon us all of a sudden that we are no accidents, no intruders in a world that is hostile and strange to us, but some mysterious beings who *were* before they were born and who will go on to exist after they seem to cease. All the trouble is due to our exclusive confidence in the validity of scientific methods. That there may be other methods of approach to the problems of reality we do not care to think of. It is a happy augury, indeed, that in our day, Dr. C.G. Jung has boldly defied the arbitrary role of scientific methods —methods that were primarily evolved to deal with the facts of the inorganic world. 'It (i.e. Jung's work) expresses a revolt,' says Dr. Bernard Hart, 'against the view that the method of science must be the paramount arbiter of human knowledge and attempts to substitute for this principle that, while human life and thought cannot be explained by concepts belonging to science, they can be explained by other modes of attack. The question at issue is no longer whether Psychology is capable of achieving the necessary status of science, but whether science is capable of fulfilling the requirements of Psychology.' Through such methods as are other than scientific we come to know the infinite that is within us. That there may be more than what we see, more than

to take into account the purposive nature of Life, their theory is no better than undiluted mechanism. How are we going to explain man from whom flow such wonderful streams of creative activity, the Elizabethan dramas, the Greek Tragedies, the Divine Comedy on purely mechanical lines, in terms of stimulus and response, reflexes and conditioned reflexes or the 'emergence' of new qualities through the help of a *Deus ex machina*? 'We look before and after'. Man's mind is no *tabula rasa*, but something in which the whole racial past and future possibilities are condensed, as it were. Says Bergson, 'We lean on the past, we bend forward on the future. Leaning and bending forward is the characteristic attitude of mind'. Sir J. A. Thomson has eloquently brought out the differences that exist between a machine and a living organism. He says: [1] 'Yet the living organism differs from any machine in its greater efficiency and—in being a self-stoking, self-repairing, self-preservative, self-adjusting, self-reproductive engine'. Mr. J. S. Haldane, emphatic as he is in his rejection of vitalism, declares nevertheless: 'The idea of life is nearer to reality than the idea of matter and energy, and therefore the presupposition of ideal biology is that the inorganic can ultimately be resolved into organic phenomena, and that the physical world is thus only the appearance of a deeper reality which is as yet hidden from our distinct vision, and can only be dimly seen with the eyes of scientific faith'.[2]

Hence recognising man at least provisionally as more than a robot, we can proceed to discuss the problem of immortality, the most important of all the problems that the Psychical Research has to encounter. The doctrine of psycho-physical parallelism which is the greatest block to the acceptance of the Immortality of Soul is, so Bergson contends, quite untenable in the light of modern Physiological researches.[3] Memory is independent of brain. He holds, like Freud, that we never forget anything. Brain lesions do not affect memory as such but only the mechanism is put out of gear. Mind, he goes on arguing, is not exhausted by the body, but overflows it. Bergson, so it seems to us, is thoroughly justified in his main line of arguments. There are unconscious

[1] *Introduction to Science*, p. 146.
[2] *Mechanism, Life and Personality*, p. 105.
For a discussion of the views of Haldane, Driesch, see *Matter, Life, Mind, God.*
[3] See his *Mind Energy* translated by Wildon Carr.

Mr. Bertrand Russell,[1] 'two children in a school, both of whom are asked what is six times nine?' One says fifty-four, the other says fifty-six. The one, we say, knows what six times nine is, the other does not. But all that we can observe is a certain language habit. The one child has acquired the habit of saying 'six times nine is fifty-four; the other has not.' There is no more need of 'thought' in this than there is when a horse turns into his accustomed stable: these are merely more complicated habits.[2]

Behaviourism takes as its basis the famous experiments of the Russian Physiologist Pavlov. It thus tries to explain the behaviour of man, his educational equipment as 'conditioning' and 'unconditioning' of reflexes. A criminal is a badly-conditioned individual. With the help of the experiments that Watson carried out on children, he has rejected outright the heredity character of such complex re-actions as instincts reducing the instructive re-actions of the traditional psychology into some simple reflexes that only are inborn.[3] Such a view of life which is mechanistic through and through, fully represents the civilization wherein it prevails. But even there all the behaviourists do not share Watson's pre-suppositions. The split that is daily growing in their ranks can be seen from McDougall's criticism, who distinguishes at least three kinds of behaviourism: the extreme, the near, and the purposive behaviourism. Outside of America, the Gestalt School explains human and animal behaviour on quite novel lines. But as the school has largely concentrated its attention on the problem of sense-perception and has not worked out all the concepts, it is difficult to see what its attitude would be to the problems of psycho-pathology and the Psychical Research. However, on the present knowledge of Psychology we can by no means explain vital and psychical phenomenon on purely mechanical lines. Nor is this a truth completely screened from the mechanists themselves. The exponents of the Emergent Evolution, notably S. Alexander and L. Morgan, take their stand between crude materialism on the one hand and vitalism on the other. But in so far as they refuse

[1] *The Analysis of Mind*, p. 28. [2] *The Analysis of Mind*, p. 153.
[3] For his views and for the criticism thereon, see a symposium published by Clark University: *Psychologies of 1925*.

they have been personally witnessed by men of much scientific ability as Sir W. Crookes, the physiologist Richet and others, they have not gained the general hearing. It is better to be sceptical about them in the present state of our knowledge.

5. The problem of the immortality of the soul. The problem has been hotly debated for hundreds and hundreds of years. Immanuel Kant (1724–1804), after making a searching criticism of 'Pure Reason' came to the conclusion that it could not solve the problem of immortality, of Free Will, and of the 'subsistence' of God. But, he later on contended, we can and must accept them on 'practical reason'. And posterity refused to follow the advice of the sage of Königsberg. The problems have so great a bearing on our practical life, on our ethical principles, on our metaphysical convictions, that we cannot hand them over to the mercy of a blind faith, to the superstition of the ignorant, to the prejudices of the priests.

Now this problem hangs on another: the perennial problem of Body and Mind. Is consciousness a mere 'epi-phenomenon' of the brain? Does brain secrete consciousness as kidney secretes urine? Is there such a perfect parallelism between body and mind that the extinction of one is the extinction of the other? As Prof. McDougall says, all questions of Psychical Research may be reduced to one: Does mind transcend consciousness? If it can be demonstrated that human organism is a mere automatum, a machine to be explained on purely physical terms, the doctrine of Immortality falls but not vice versa. It was René Descartes (1596–1650) who regarded animals as mere machines whose behaviour can be interpreted mechanically. It was only a step to apply it to man as well. The conflict is fiercely raging between mechanism on the one hand and vitalism and animism on the other. Vitalism has its most able and learned representative in the person of Dr. Hans Driesch. He does not think the mechanistic explanation to be all-sufficing but recognises a vital principle, 'an entelechy' to account for life-process. In the realm of Psychology this conflict has its counterpart in Behaviourism and Purposivism. The most notable feature of mechanical theory is that it lays an over-emphasis on habit. 'Suppose', says

suggestion, consciously or unconsciously conveyed, may serve to shape the child's body as well as its mind in accordance with the maternal or the parental hopes and desires'.[1] The explanation, though plausible, completely breaks down on many points. First of all, many children are born who completely disappoint the expectations of their parents.

Were the pious Jewish-parents of Spinoza thinking of a son who would reject their old notions, their whole outlook on life? This theory entirely fails when we apply it to geniuses. They are novelties and cannot be explained by 'a concentrated suggestions of parents'.

3. Pre-cognition. It is a problem which is, as Dr. Driesch has well shown of highest import for philosophy. If the actions of the individuals can be predicted beforehand, the doctrine of Free Will is shaken to the roots. An ingenious theory is suggested by the highly imaginative mind of Mr. H. G. Wells. He thinks, if I understand him rightly, that our 'mental now' becomes narrow in proportion to the intensity of our attention. Whenever it slackens our 'mental now' begins to expand, and in certain cases comprehends not only our past but our future as well. So far so good. But it is only a pure guess which cannot take account of all the phenomena. If it can be demonstrated that the individual who can foretell events or the future of others, does not fall into a reverie, in a dream, in a hypnotic trance, his theory collapses. Pre-cognition can also be interpreted in the light of the famous theory of the late F. W. H. Myer's 'subliminal self.' By this conception he tried to draw our attention to the processes going on beneath the threshold of consciousness. Unfortunately, it can explain pre-cognition only, if we grant an almost incredible omniscience to 'the subliminal self'. Is it not too dear a price to pay? The issue is by no means settled and invites the careful attention of investigators.

4. There are other phenomena still more obscure. They are, for instance, Tele-kinesis,[2] ectoplasm,[3] psychometry,[4] etc. Though

[1] *Apollonius* or *The Present and Future of Psychical Research* by Bennett, p. 80.
[2] Movements of material objects without any known cause.
[3] A strange kind of material is exuded from the medium's body and takes form.
[4] Through the contact of an object the medium relates the history of the person connected with it.

of any flower which they will name subsequently. Ninety per cent of the individuals, to be sure, think of no other flower than the rose and thus become their dupes. Various explanations have been given accounting for telepathic phenomena. 'And Von Hartmann', says Podmore, 'boldly accepting the facts wholesale, ascribes them to a communication between finite minds effected through the intermediation of the Absolute.' This is, no doubt, a highly metaphysical explanation and as such cannot be verified. The distinguished French astronomer Flammarion[1] explains it in quite a different way. 'Without doubt', says he 'our psychic force gives birth to an ethereal movement which is projected to a distance like all the vibrations of ether and is felt by all brains in harmony with our own. The transformation of a psychic action into an ethereal movement and back, may be similar to that which we observe in the telephone.' But an explanation with the help of ether will not carry us very far. The next question that can be relevantly raised is whether our telepathic powers are merely 'dying embers of a once more active force' and whether Psychical Research has 'discovered this force in the evening of its existence'. But facts are badly needed to show that this power exists in an unusual degree in savages and uncivilised strata of mankind. Mr. Bennett [2] indeed, has overshot the mark. He finds telepathic powers in their full bloom in animals and thus thinks them capable of explaining the 'homing instinct' of the pigeons, nay, even the problem of heredity. 'Can it be', he asks, 'that this same mysterious and powerful force may come to be accepted as, at any rate, a partial solution of the vexed question of heredity? A body is born with marked physical characteristics of its father or mother. During its prenatal existence you have two main factors: the minds of the parent on the one side, on the other the mind of the unborn child. The future of the little being lying under her heart forms the thought of the expectant mother. She thinks of it as reproducing certain characteristics of herself or of the husband she loves; the husband applies his thought in the same direction and such concentrated

[1] Cited by Joseph Jastrow for hostile criticism in his article. See *The Case For and Against Psychical Belief*.

[2] See *Apollonius* or *The Present and Future of Psychical Research*, p. 53.

The principal monad is *I* and the other monads are subjected to its domination. In a few cases the subordinate monads rebel against the authority of the principal monad and hence the disintegration of personality.[1]

2. In the very beginning of its career Psychical Research brought all its energies to bear on the problem of telepathy. If it has succeeded in demonstrating the truth of any super-normal faculty it is this by which one mind influences or is influenced by another mind without any physical means.

Numerous cases are reported where a mother sees the apparition of her son breathing his last on a battle-field far away. Such events even coincide in time. Recently the subject of telepathy has come to the fore through the manifestation of some kind of telepathic power in the person of Prof. Gilbert Murray.[2] How can we adopt such an uncomprising attitude of denying to give validity to the experience of a majority of mankind and like a solipsist, regarding our own experience as true? Indeed, to regard all the reported cases as no more than a tissue of lies will be tantamount to evading the question at issue. Those who do not accept it because it seems to be impossible and improbable, should be constantly reminded of the pregnant dictum of Sir John Herschel, 'The natural philosopher should believe all things not improbable, hope all things not impossible.' If the alleged cases are true they can by no means be attributed to chance. As Bergson quite pertinently points out, if only a solitary example is firmly established that a certain person, dying with his comrades was 'seen' by another person far away, the reality of telepathic phenomena is proved once for all. It is simply ridiculous to invoke blind chance for the explanation of all these details. Before accepting telepathy it is necessary to see whether the phenomena in question can be explained, as Podmore[3] has so well insisted, by fraud, hyperesthesia, muscle-reading and thought forms. One often comes across so-called astrologers who live on the credulity of the masses. Before proceeding further they ask us, as a proof of their honesty, to think

[1] The Problems of Personality. Studies in Honour of Morton Prince.
[2] See Lodge's Article in the latest edition of the *Encyclopædia Britannica.*
[3] See his *Thought Transference and Apparitions*, pp. 121, 383.

the ego. Co-conscious, therefore, does not necessarily imply that the personal consciousness is unaware of the processes in question. Thus in the dissociation of a personality, one personality knows all the thoughts and actions of a second, but regards them as those of another being.' As an illustration of the case of multiple personality we may quote the case of a certain Mary Barnes recorded by Dr. Albert Wilson.[1] The abnormal states occurred in this case, and Dr. Wilson considered each of them to be a 'a separate personality, continuous with itself throughout its different appearances, and originally ignorant of every other'.

In his description of the case, Dr. Wilson calls the normal states A and the abnormal states B. The different abnormal states are referred to as B_1, B_2, B_3 and so on. B_1 was a condition of acute mania. B_2 was a child-like state. B_3 was a phase which the parents named 'old nick,' because she was very passionate and bit her clothing. B_4 was a deaf-mute. B_5 which appeared only once, had attacks of paralysis in the legs and deaf-mutism, and had no memory for anything which had occurred more than three days before. B_6 had the character of a sweet amiable child. B_7 could not stand or walk. B_8 was very like B_5 but with different memories. B_{10} was a blind imbecile who could draw well notwithstanding the blindness.

The normal state A, which appeared for short periods as an alternating personality, was totally ignorant of all the B stages, but the abnormal states sometimes showed a dimmer knowledge of the normal A. B appeared for the first time about a year after the illness began and after this the normal personality A 'became a very rare visitor, putting in an appearance perhaps only once a week, while B became more prominent until finally, after two years, it remained constant and all other personalities disappeared'. To account for such cases many hypotheses have been put forward and some of them we have suggested elsewhere. But the most interesting and fertile is the suggestion of Prof. McDougall. According to him our organism has a group of egoes or, to use the phraseology of Leibnitz, a group of monads.

[1] We have quoted this case from Dr. T. W. Mitchell's *Medical Psychology and Psychical Research*. A very great part of the book is devoted to the question at issue, p. 125.

man-child conceived".' Can Psychical Research help us in boldly facing this 'sorry scheme of things entire?' They ask this question and are drawn to it.

What are the problems of Psychical Research and what is the contribution that it has made so far for their solution?

1. Let us take first and foremost the problem of the dissociation of personality which has a charm of its own. Sometimes it so happens that the patient is 'divided' in a primary personality and secondary personality, and alternates between the two. At one time he is sober and pious, dedicated to lofty and sublime ideals, at another he is a desperate rogue leading a life of a debauchee. A picture somewhat like this is given to us in a fantastic garb by R. L. Stevenson in his famous *Dr. Jekyll and Mr. Hyde*.[1] The causes of such a division of personality are too numerous to relate. They may be due to an emotional shock of exceptional intensity or to a lack of integration of our conflicting impulses and tendencies that cannot be harmonised by any means. It may be that our primitive impulses and the brute in us that awakes in dreams, are so strong and revolting as not to form any co-ordination with those tendencies of our waking life that conform with the society without us and 'the censor'[2] and the Moral Law within us. This may also be the explanation of the many cases of the so-called 'possessed individuals'. Some pioneer work was done in this field by Morton Prince in America and Pierre Janet in France. Prince has asserted the view, which is beset with great and insuperable difficulties, that the two streams of consciousness may flow at one and the same time. This is his famous conception of the 'co-conscious' which is almost identical with Janet's conception of 'the subconscious.' 'Prince considers' says Dr. Bernard Hart,[3] 'that the essential character of a co-conscious process consists in the fact that it leads an autonomous existence and is not dependent upon

[1] Plato, curiously enough, recognises the existence of a Mr. Hyde that lurks in all of us and who, according to the sage of Athens, awakes in dreams. Says Plato through the mouth of Socrates (Republic Book IX), 'But the point which I desire to note is that in all of us, even in good men, there is a wild beast in nature, which peers out in sleep.' Plato's conception of 'the wild beast nature' seems to me to be the same as that of 'the repressed self' of Freud.

[2] I refer here to the Freudian 'censor'.

[3] *Psycho-Pathology* by Dr. Hart, p. 62.

empty shell—a form of symbols. It is knowledge of structural form, not knowledge of content. All through the physical world runs that unknown content which must surely be the stuff of our consciousness. Here is a hint of aspects, deep within a world of physics and yet unattained by the methods of Physics. And, moreover, we have found that where science has progressed farthest, the mind has regained from Nature that which the mind has put into Nature. We have found a strange foot-print on the shores of the unknown. We have devised profound theories one after another to account for its origin. At last, we have succeeded in reconstructing the creature that made the foot-print. And lo! it is our own!' Jeans has consistently carried this idealistic view to its logical conclusions and has regarded the world as no more than an idea in the Mind of The Almighty Mathematician.[1] What a chaos! Where are the fundamental dogmas of physical science? All conceptions are gone by the board. Do you wonder, then, if such a havoc, such a terrible change has revived a ray of hope in some minds that it *may be* possible for them to discover a world that is 'wholly other', that will satisfy their yearning for immortality through Psychical Research?

Nor should we ignore another factor, no less important, that is contributing in its favour. This is the factor which brings even the sceptical mind willy-nilly into its influence. This may be called social, political and religious chaos. The family is in process of disintegration. The age-long ties that gave solidarity to society are being cut off. The dogmatic religions, through their inflexibility, through their lack of adaptability, through their emphasis on the unessential, have no charm, nay, are a nausea to young men of to-day. The world is so tired of political feuds, of aggressive nationalism, of militant imperialism, of belligerent capitalism, so distracted by the after-effects of the Great War that it wants to know whether extra-mundane influence can be of any help to it in its hour of travail. Sheer pessimism and a desire for suicide are the key-notes of the masses. There are many who would say with Hardy's Jude, 'Let the day perish wherein I was born and the night in which it was said, "There is a

[1] Jeans has boldly expressed such a view in his Rede Lectures: *The Mysterious Universe.*

conception of the world. The witty remark 'We know too much of matter to be any longer materialists' is much in vogue. Physicists have reminded us of the highly aesthetical simile of Plato wherein he asks us to visualise the spectacle of men chained in a den and thus unable to turn themselves. There is a light glowing behind them. Many people are passing by, some talking and others silent. Their own shadows and the shadows of the people behind are reflected over the wall that is in front of them. If there is any echo in the den, the poor men will naturally think the shadows to be speaking and will not hesitate a moment to ascribe all the reality to them. [1] But when being brought before the sun, the source of all light, they are disillusioned, how sceptical they will be, how perplexed, how dazzled by the light! Is not our knowledge, then, a knowledge of shadows? They have also boldly intimated the possibility that after all our world may be 'a dream and we the brain cells in the mind of the dreamer'. Though[2] Einstein himself[3] has not deduced such far-reaching conclusions, his greatest English exponent, Sir Arthur Stanley Eddington and the distinguished English mathematician Sir James Jeans have made a strange rapprochement to the idealism of the type of Berkeley. This idealistic trend of modern physics, disconcerting as it may be to the mechanists of the school of Loeb or to the school of Watson who explain more or less all behaviour in terms of reflexes, conditioned reflexes or tropisms has none the less taken the field.[4] 'The theory of relativity,' says Eddington, 'has passed in review the whole subject-matter of Physics. It has formulated the great laws which by the precision of their formulation and the exactness of their application, have won the proud place in human knowledge which physical science holds to-day. And yet, in regard to the nature of things, this knowledge is an

[1] See Eos or The Wider Aspects of Cosmogony by Sir James Jeans. This famous simile occurs in Book VII of The Republic and is referred by Jeans in his now famous Rede Lectures.

[2] This possibility of the world being a dream is stated by none so beautifully as a Chinese mystic of yore. He once dreamt that he was a butterfly fluttering hither and thither without any consciousness that he ever was a man. He woke and behold! he was man. Now, he asks, whether he is a man dreaming of becoming a butterfly or a butterfly dreaming of being a man!

[3] Einstein does not seem to be an out-and-out idealist. See his conversations with Tagore, *Modern Review* and *Asia*, March.

[4] *Time, Space and Gravitation* cited by W. McDougall in *Outline of Psychology*.

when they produce their evidence to convince me that this queer extra existence does go on, I am bound to confess I find it unconvincing '.[1] If Mr. Wells is bent upon rejecting everything *a priori* no reason will be convincing for him. If it is true that Lodge, Driesch, Richet and all these savants have become a prey to a ' will to believe ',[2] here is a case of ' will to disbelieve '. Scepticism is well and good to a certain limit but becomes ridiculous whenever it steps over the limit. Was it not Lord Kelvin [3] of revered memory who refused to believe in Hypnotism? But in spite of some notable exceptions the matters are different to-day. The sheer dogmatism of the scientist is a thing of the past—such a ' change of heart ' on the part of the scientist is a phenomenon which calls for an explanation. No one wonders to-day if a Physicist of the greatness of Lodge believes in the communication of the dead, if a psychologist of the standing Llyod Morgan in the ' subsistence [4] of Deity ', or a thinker of the rank of Driesch in a Vital Principle or Entelechy. What, then, are the causes that have contributed to such a change? The answer may be summed up in a few words: the chaos in physical sciences. This chaos reached its culmination when Einstein with his theory of Relativity, with his strange conceptions of the finitude and curvature of space, by regarding time as one more dimension of space and by taking exceptions even to many of Euclid's generalisations shattered all our old conceptions and shook the very foundations of Newtonian physics. Certainties of the old have only become prohibitives. Even the Law of Causality is seriously questioned. The world of matter, [5] is evaporated and the world of ' events ' has taken its place. Physicists are drifting towards a purely spiritualistic and idealistic

[1] The way the World is going; *Belief in a Spirit World* p. 295. Drs. Yodl and Henning are at one with Munsterberg, see *Apollonius* by Bennett, p. 52.

[2] It has become proverbial through the classical essay of W. James on the same subject.

[3] See Walter Franklin Prince's essay in *The Case For and Against Psychical Belief.*

[4] It is of paramount importance in the understanding of Philosophy to distinguish clearly between ' existence ' and ' subsistence '. Existence is limited by space and time whereas subsistence is not. Individuals exist, universals subsist. Hence Bradley's pungent remark, ' A God who exists is not God at all.'

[5] Prof. A. N. Whitehead is regarded to be the most thorough-going critic of ' Matter ' and ' Materialism '. His Gifford Lectures on *Process and Reality* have made a great impression all over Europe and since then, his obscurity is much talked of. For an outline of his views see R. F. A. Hoernle's *Matter, Life, Mind and God.* See his chapter on the present-day Revolt against Matter.

just as before Galileo no one could have imagined what our Physics would be—a Psychology which probably would have been to our present Psychology what our Physics is to that of Aristotle '.[1] But it is gratifying to note the gigantic strides that Psychology is making both in its normal and abnormal aspects. We have now Behaviorism with Watson at its head, Gestalt[2] Psychology with Köhler, Koffka and Wertheimier as its representatives, psycho-analysis with Freud as its protagonist, its two great schisms expounded, one by Dr. Jung and the other by Dr. Adler, Prince with his epoch-making researches on the dissociation of personality, and Janet with his researches on hysteria forming a land-mark of first magnitude in the history of abnormal psychology.

Psychical Research is fortunate in having such an excellent and varied amount of material at its disposal. But unfortunately it has encountered strong resistance at the very outset of its career and is still maintaining itself in the teeth of opposition. Though the time is fast passing when Psychical Research was stigmatised as a ' recrudescence of superstition ', there are still men of great talent and erudition who refuse to say *yes* or *no* to its conclusions and still others who flatly refuse to give ear to what it says. Was it not Hugo Munsterberg[3] who refused to believe in telepathy because it would adversely affect his whole system of beliefs? He is now dead and gone but the type he represented still persists. We have in the person of Mr. H. G. Wells a typical representative of this school of thought. '*A priori* I find ', says he, ' their ghosts and their ghosts world incredible. And

[1] See his address in *Mind Energy* translated by Prof. Wildon Carr.

[2] It is a German word meaning form. It is technically translated in English as configuration. All the chief representatives of the Gestalt School are Germans. They give great prominence to what they call ' insight '. Professor Köhler's observations on Chimpanzees have won admiration from one and all. Prof. McDougall thus describes their doctrines : A configuration is a system of energies in which every part co-operates in determining the whole, and the whole in determining every part. The whole system so considered is other than and more than a mere resultant or some of its parts ; it is, as another school would say, an emergent exhibiting properties that are not to be found in any of the parts.

Any field of perception, they say, is such a configuration ; ' it is not merely so many distinguishable sensation qualities juxtaposed in time or space ; every part is what it is only in and as a working part of the total configuration. Thus within a heard melody, each tone plays its part in constituting the whole, and it takes from the whole something of its peculiar quality as a tone in that melody, something that makes it other than the same note heard in isolation.'

[3] McDougall's *Outline of Psychology*.

continental writers as 'para-psychology' or 'meta-psychology'. It has no creed, no cult. Though in the popular mind it is identical with spiritualism, spiritualism does not exhaust it, for 'spiritualism', says Dr. Hans Driesch,[1] 'is not the same as para-psychology, but is a particular hypothesis within its realm, in exactly the same way as the theory of Natural Selection is a particular hypothesis in the realm of the general theory of Evolution'. The official statement of the Psychical Research Society entirely bears out the truth of our remarks. The statement runs—'An inquiry into various alleged phenomena apparently inexplicable by known laws of Nature and commonly referred by Spiritualism to the agency of extra-terrene intelligence, and by others to some unknown physical force'.[2]

The founders of the Psychical Research Society started their work with no presupposed spiritualistic hypothesis, with no bias, with an open mind to be convinced either way. 'The Society, as such', said Andrew Lang, 'has no views, no beliefs, no hypothesis, except perhaps, the opinion that there is an open field of inquiry; that not all the faculties and potentialities of man have been studied and explained up to date, in terms of nerve and brain'.[3] True, it has not advanced much. How can it advance when Psychology proper is itself as yet in its infancy? Before the last century, all our energies were mainly directed to physical sciences and no wonder if the world has seen such an upheaval in them. Though Psychology is as old as Aristotle, it is since Herbart (1776–1841), perhaps, that it has gained the status of a science. 'I have sometimes asked myself,' says Bergson in his most illuminating Presidential Address to the Psychical Research Society, 'What would have happened if modern Science, instead of setting out from Mathematics to turn its directions to Physics, Mechanics and Chemistry, instead of bringing all its forces to converge on the study of matter, had begun by the consideration of mind—if Kepler, Galileo, and Newton, for example, had been psychologists, they would have produced a psychology of which to-day we can form no idea,

[1] *The Case For and Against Psychical Belief*, p. 174.
[2] *Psychical Research* by Sir W. Barrett—Home University Library Series.
[3] *Ibid.*, p. 247.

penetrating the inner depths of Reality. Should we wonder, then, if the whole life of our youths is wasted in seeking bread and butter, in following the easy ways of pleasure, in ignoring the eternal questions of the 'why' and 'wherefore' of things? They are all suffused with that indolent spirit which raises no questions and answers none, the spirit that cherishes no 'Divine Discontent' sublimating life but is quite content with 'a loaf of bread beneath the bough'. But enough of this! Let Mother India wake! Let her sons be roused from the age-long thraldom which is daily sapping their life-blood. Does it not befit the sons of a land where Kabir and Tulsi poured out their unpremeditated art, which gave birth to the illustrious figures of Buddha and Krishna, in whose bosom sleep mystics and seers who saw reality in all its nakedness, to give a helping hand to their brothers working far away in the West? The time has come, indeed, when the best brains of humanity should collaborate in tackling the riddles that have baffled us till now. Aye, we should stand shoulder to shoulder and give a united front to the riddles of the universe.

It is a matter for great regret that a vast number of phenomena so firmly trusted in by the masses and which, if verified, would revolutionize our whole outlook on life, our metaphysical notions, our 'Weltanschaung', have been merely sneered at by the scientist and were not thought worthy of investigation. Thanks to the initiative of Myers, Sidgwick and others, this blot on the fair name of Science was partly removed. It was in the year 1882 that a Society for Psychical Research was founded for bringing to light the so-called supernatural phenomena, for giving scientific explanations, if possible, for discovering any new faculties that lie dormant in human mind. It is to its credit that it has brought these problems from the realm of pure speculation to the realm of experience and experiment. It has evolved a special science and a special technique for the puzzles that have defied solutions for hundreds and hundreds of years. Though the Science is young, its adherents include some of the world's most sober minds who have already distinguished themselves in different walks of life. Psychical Research stands midway between Psychology and Metaphysics. That is why it is pertinently designated by the

PSYCHICAL RESEARCH AND SOME OF ITS PROBLEMS

THE uncanny and the mysterious have always had a strange hold on the imagination of man. They are the source of his mythology and superstition, the fountain-head of his knowledge and illumination. But to form a clear idea of the impression that they create in man's mind, one will have to see him in historical perspective. There, there in the dim and dark recesses of the past you will find our ancestors living in groups, dreading even the rustle of leaves, the blowing of wind, propitiating and deifying the rival forces of nature and bowing before them in times of trouble. In Nature they saw their own[1] image and applied their categories to it. But as they gained experience, extorted many of her secrets and exploited her resources, the sense of awe and wonder gradually began to wane. It was only when they felt quite at home in their newly-inhabited planet that they, instead of attributing every event to a particular deity, classified it under some general laws and concepts. But man in spite of his best efforts has not yet succeeded in unravelling the mystery of life and death, of origin and decay, and thus the sense of the uncanny and the mysterious still haunts him. His life is a perpetual fighting, an incessant struggle, an ever-increasing striving to understand this mystery of mysteries, to solve this question of questions. This passion, indeed, for tearing the veil of the unknown, for diving deep in the mystery of life, is in the very nature of man. The essentially conative characteristic of life as it is manifested in man does not exclusively imply a brute struggle for existence; nor does it solely connote a struggle for physical power, but rather a striving to see what is unseen, to know what is unknown. Alas! our educational system, based as it is on the most irrational and unreliable foundations does not help us, nay, even hinders us from satisfying our craving for going beyond what is before us, for

[1] It reminds one of the remark of the French Wit, Voltaire :—Man made God in his own image.

'There are no big temples but there are lofty hills instead. You may think God to be in a temple but really you will find him in Nature. In places where there stand lofty hills with deep valleys from which great streams of water are flowing and which are surrounded by dense forests, can be seen the greatness of God. There the streams are unceasingly singing hymns in His praise, there the wind raises its tune to their accompaniment, and there the trees are dancing joyfully. In such places (of devotion) God exists.' What he wanted was to worship *Nirguna Brahm*, God without attributes. झपूझी, रांगोळो, म्हतारी are some of his best creations.

Our readers may think that Keshava Suta must have lived happily. But it was not so with him. His whole life was one of poverty and neglect. It was his misfortune that not even one came to write something in his praise. Keshava Suta was disheartened at this and often regretted the lack of good critics in the society. The world gave him nothing that he wanted, therefore he requested God at last—

नाम तुझें मुखीं, ध्यानतुझें डोळा । वृत्ती या चंचळास्थिरावल्या ।
चिंताभयदु:खें अवघीं दूर झालीं । अनाथांचा वालीजवळीं केला ।
भिकार या जगीं, इच्छित न मिळे काही । म्हणुनितुझें पायी भिक्षांदेहो ॥
केशव सुत म्हणे देवा दीनानाथा । तुझें पायी माथा वाहियेला ।

'O Lord, now Thy name is on my lips, Thy sight in my eyes and my keen senses are concentrated upon Thee only. Now all my mundane cares and anxieties are gone and I have come for shelter to Thee the Lord of the poor and rich alike. In this troubled world no desire can be attained and hence, I spread my hands before Thee, Lord, I humbly bow my head at Thy feet!'

As an influence of English poetry, Keshava Suta became fond of blank verse. Most of his poems are written in irregular metre. His style is a new one. He did not care so much for words. He used such words as he thought to be fit to carry the right sense of his idea. A strange mixture of common and archaic words is met with in his poems. He popularised sonnets in Marathi. The metre he used for sonnets was शार्दूलविक्रीडित *Shardul Vikridit.*

of actual life, all happiness vanished. Whenever she went to some garden or river, she felt a little relief, because some of the eternal pleasure remained there. The soul always thinks माझें मज लाधेल कधीं (when shall I get what is mine?)

Keshava Suta was an optimist and this can be seen in his *Satariche Boal.* Once the poet was walking in a dejected mood. He was so submerged in his thoughts that even a tempest or a gang of devils could not have disturbed him. Once as he was walking he heard someone playing upon a *sitar.* At first the dejected poet got angry at the jolly nature of the player. But after sometime, he was attracted by the sweet instrument. He sat there. When he cast a glance at the sky, he saw many stars and he thought: 'It was all darkness here up to this time, but now there is light. So also in this life, happiness will come when the trouble is over.'

Patriotic thoughts are also scattered here and there in his poems. For instance, in his *Bhartiyanche Udgār* he solicits God humbly for the liberty of his country.

देवा केव्हां परवशपणाची निशाहो सरून स्वातंत्र्याचा द्युमणि उदया यावयाचा फिरून केव्हां आम्हीं सुटुनि सहसा पंजरांतुनि देवा राष्ट्रत्वाला फिरुनि अमुचा देश येईल केव्हां.

'When will this dark night of dependence end? And when will the day of liberty dawn? When shall we be free of the trammels of slavery and when will our country revive her nationality?'

It is often alleged against Keshava Suta that he was an atheist. But this is a wrong statement. The following lines clearly show that he believed in some superior power—superior to all powers. In his *Eka Khede* the poet, after giving a delightful description of the village surroundings, comes to say—

उंच नाहित देवळें मुळीं तेथें । परी डोंगर ओहत मोठमोठे ।
देवळीं त्यादेवास बळें आणा । परीराहो तो सृष्टिमधी राणा ।
उंच डोंगर ते उंच कडे भारी । पडे धोधो ज्याचियावरुनि वारी ।
भोंवतालें रानतें दाटआहे । अशाठायीं देवतो स्वयें राहे ।
स्तोत्र ओढे थांबल्याविण गाती । सूरवारे आपुला नित्यदेती ।
वृक्षगणतोनाचुनी डुल्लताहे । अशा भक्तीच्य स्थलीं देव आहे ॥

again asks the people if it was proper on their part to enjoy themselves while society was in such a plight.

There was a general tendency in society to believe that what is new is untrue अलिकडलें तें सगलें खोटें. But the poet says that it is a wrong notion. We get new pearls from the seas but they are as precious as others, so also, the gems of new thoughts are not useless. The poet further goes on to say that—

नियमन मनुजासाठी, मानव नसे नियमनासाठी जाणा.

(*Translation*:—' Rules are for men, not men for rules ') and if they cause any hindrance in our way we must do away with them.

The condition of the so-called untouchables is pitifully described in his '*Antyajachya Mulacha Pahila Prashna*.' While some untouchable boys were playing on a road, a Brahmin came by and saw them. He angrily commanded them to go away, lest their shadow should spoil the purity of the Brahmin's body. The boys ran away and put to themselves the questions : ' What is bad with us? Why do we not deserve to be touched?'

His *Tutari*, *Nava Shipai* and *Sphurti* are written with the idea that the younger generation should know the defects of the society of the time and thus should cultivate independence of thought and action. These poems are the essence of the great movement for social reform of that time.

Keshava Suta was not only a social reformer but also a poet in the right sense of the word. His *Harpale Shraya* is an excellent poem. Man comes into this world but he is not happy here. He is not satisfied by the artificial happiness that he gets here. Man's soul tries to attain eternal pleasure. Its condition is just like that of a man who leaves his home and goes to some new place. There he does not feel so free as he was at home. So the human soul as it leaves its home and comes here, feels new to this place. What does it strive for? It is the intense happiness, where there is no room for misery, that the soul is after. This poem is given as a life-story of a woman. While she was a girl, she engaged in household life and was glad to do it. But with her first experience

editor of the *Kavyaratnavali* called him by the name of 'Keshava Suta'—a name that Kehava Suta also liked very much.

Keshava Suta was very simple in his dress as well as character. He never cared for others' help. He did not speak much. He was very sincere with his friends. He could not bear insult from others. Someone has said of him that he lived simply, that his thoughts were poetic and that his speech was attractive. He was always engaged in reading or writing poetry. He was an ardent lover of poetry, so much so that he always dreamt poetic thoughts, he always spoke of poetry, he always read poetry. It may be said of him that 'he wrote poetry and lived poetry.'

With him, ideas were important, however uncouth the form might be. He saw nothing fascinating in words. A poem full of noble and serious ideas was a good poem for him. With him, musical words and figures of speech were but minor parts of poetry. He was always careless about words and figures of speech.

Among Marathi poets, he liked Tukaram most. He had also studied much English poetry. Shakespeare, Browning and Wordsworth were his favourites, and they exercised a great influence on him.

He was impressed by Agarkar's movement for social reform, as is clearly seen in many of his poems. He was mortified to see the bad condition that society was in. Untouchability, the miseries that a Hindu widow has to undergo and the indifference of men towards women were what troubled the poet very much. He thought it to be his duty to rouse his fellows. People were sticking to tradition and thereby harming themselves. The poet wants a big trumpet in order to remove the ignorance of the sleeping masses. He wanted to inform all that—

रूढि, जुलूम यांचीं भेसुर, संतानें राक्षसी हंतहा खादाड तुम्हां खातात पहा.

(*Translation* :—They were falling a prey to the horrible consequences and tyrannies caused by *Rudhi*, i.e., tradition.) He

a love for poetry. He was only sixteen at this time, so it is clear that he began to write poetry while he was quite young.

After the death of his brother Shridharpant, Keshava Suta was sent to Nagpur. But there he could not keep good health. So he went to Poona and joined the New English School then conducted by Tilak and Agarkar. Keshava Suta had a great liking for painting also. He had a great respect for his teachers. Instead of listening to their lectures in the class, Keshava Suta spent his time in drawing their portraits. The art of painting and that of poetry were thus combined in him.

In 1889, he passed his Matriculation Examination. His circumstances compelled him to leave his studies and seek some service. From 1890 to 1896 he worked as a teacher in Bombay.

In 1897, he left Bombay and went to Bhadgaon as assistant teacher in a school. In the history of his poetic career, his stay at Bhadgaon is very important.

Bhadgaon is a very beautiful place, lying on the bank of the river Girna. Keshava Suta spent his evenings on the bank of this river. His mind was absorbed in meditation while he saw the beautiful river flowing, the lowing cattle, the beautiful clusters of trees, full of birds and the stars glittering in the sky. With his feet in the water, he used to sit there for hours and hours. In the company of Nature, his song broke out spontaneously. He imagined poetic thoughts, he spoke poetic words. Thus he spent his time at Bhadgaon enjoying perfect mental peace. After some years, he became headmaster of the same school and got an increment of ten rupees in his pay. He died at Hubli on the 2nd of November 1905.

It has already been stated that after his brother's death at Baroda, Keshava Suta went to Nagpur. It was at Nagpur that he became acquainted with the great poet Tilak. Keshava Suta had a great respect for him. Conversations on poetic subjects often took place between them and their friendship lasted to the very end of their lives.

Keshava Suta published his poems firstly in the *Karamanuka*, the *Gyan-odaya*, etc., under some assumed name. But the

KESHAVA SUTA

KESHAVA SUTA is considered by one and all to be the greatest of the modern Marathi poets. According to the rule that the true value of a great man is generally known to the world after his death, Keshava Suta also was not appreciated by the people in his lifetime. Great men come, preach, do their duty and pass away and too often none comes to encourage or help them. They pass away in misery and trouble. But when they are out of sight, men who showed indifference towards them while they were living, come and try to learn the secret of their greatness. This was exactly the case with Keshava Suta. His works were not generally made known until 1917, when Hari Nayan Apte collected his poems and published them in the form of a book. This book is defective in so far as it does not contain any sort of appreciation of the poet.

The full name of the poet is Krishnaji Keshava Damale. He was born in 1866 at a village in Ratnagiri District. There, his father was headmaster of a Maratha School. Kesopant (the father of the poet) was a very strict man and performed his duty ably. He died in 1893. He had twelve children. Shridharpant, one of the poet's brothers, was a professor of Mathematics and Sanskrit at Baroda. His younger brother M. K. Damale became a professor of Moral and Mental Philosophy at Ujjain.

Keshava Suta received his primary education in a Village School in Ratnagiri District. In 1882, he went to Baroda to his brother. There he studied English for one year, but unfortunately his brother suddenly died and Keshava Suta had to leave Baroda.

It was at Baroda that he first began to write poetry. What inspired him is not known. He was very fond of reading mythological books. His brother Shridharpant was a great lover of poetry. Perhaps this might have created in the poet's mind

CONTENTS

Vol. V, Nos. 1 and 2

The
Osmania Magazine

Being the Journal of the Students

of

The Osmania University College,

Hyderabad - Deccan.

Editor

B. N. CHOBE, B. A.

Vol. V. June & September 1931. Nos. 1 & 2.

TITLE PAGE PRINTED AT
THE HYDERABAD PRINTING WORKS
HYDERABAD
DECCAN
1932

طلبۂ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیرین

سید محمد مرتضی رضا حسین خان رشید

مطبوعہ حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

ش
شرح

جلد پنجم شمارہ ۳، ۴ بابتہ سنہ ۱۳۴۰ـ۴۱ف

ملنے کا پتہ :- منتظم اعزازی مجلہ عثمانیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اطلاع

۱- طلبه کلیه جامعه عثمانیه کا یه سه ماهی علمی رساله حسب ذیل مهینوں کے آخری هفتوں میں شایع هوا کریگا :- امرداد (جون) آبان (ستمبر) بهمن (ڈسمبر) اردی بهشت (مارچ) -
۲- سال تعلیمی اور مجله کا سال ایک هوگا -
۳- رساله انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل هوگا - حصه اردو کے لئے تقریباً ۸ جزو اور حصه انگریزی کے لئے تقریباً ۴ جزو مختص کئے جائیں گے - رساله سالانه حجم کم از کم (۸۰۰) صفحات هوگا -
۴- مجلس مشاورت اشاعت کے متعلق ردو بدل کی مجاز هوگی -
۵- مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی -
۶- تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقه کے نام دفتر مجله عثمانیه کے پته پر روانه کئے جائیں - خریداری اور دیگر امور کے لئے اعزازی منتظم مجله عثمانیه کے نام دفتر کے پته پر روانه کئے جائیں -
۷- چنده کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجله عثمانیه کے نام دفتر کے پته پر روانه کیجائیں -

چنده

۱- سرکار آصفیه و برطانیه سے	باره روپیه سالانه پیشگی
۲- ارباب جامعه ، اصحاب اقتدار اور اداروں سے	آٹھ " "
۳- عام خریداروں سے	چھے " "
۴- طلباء قدیم ، رفاهیه انجمنوں اور مطالعه خانوں سے	پانچ " "
۵- طلبه کلیه جامعه عثمانیه سے	چار " "
۶- ممالک بیرون هند سے	۱۵ شلنگ " "
۷- بلاد یورپ کے طلباء قدیم سے	۱۰ " "
۸- فی رساله	دو روپیه "

سالانه اخراجات ڈاک حسب ذیل هوں کے اور بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی هوگی -

(۱) بذریه رجسٹری ایک روپیه (۸) آنے کلدار ، (۱۳) آنے سکه عثمانیه (۲) بذریعه سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی پی کے اخراجات (۱۴) آنے کلدار ، (۶) آنے سکه عثمانیه (۳) بذریعه بک پوسٹ، (۹) آنے کلدار ، (۶) آنے سکه عثمانیه

فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد پنجم شمارہ ۳، ۴

علم اصول قانون کے طریق کار

از

جناب مولوی فاضل میر سیادت علی خانصاحب ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی (عثمانیہ)
بی ۔ سی ۔ ال ۔ ڈی ۔ فل (اکسفورڈ) بیرسٹر اٹ لا ۔ پروفیسر قانون

چند ماخذ ۔ کرکوناف تھیوری آف لا ۔ برایس لکچرس ۔ ھالینڈ جورسپروڈنس ۔ وغیرہ

تمام عمرانی علوم کی خصوصیت ان کا اپنا طریق کار (Method) ہوتا ھے ۔ ھمیں بھی سونچنا چاھئے کہ علم اصول قانون کا کیا طریق کار ھے؟ اگر اسکے ایک سے زیادہ طریق کار ھیں تو ان مین کونسا صحیح ھے ۔ چونکہ قانون پر ھمیشہ عمل ھوتا رھتا ھے ۔ اس کے علم کے طریق کار کی صحت کا معیار ایک ایسے نظام قانون کا پیدا کرنا ھوگا جو باھم متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق ھو ۔

جب ھم انگلستان ، یورپ اور امریکہ کے مختلف اساتذہ کی تصانیف پر غور کرتے ھین تو ان مین چار طریق کار کو رائج پاتے ھین ۔ اور وہ یہہ ھین :-

(۱) مابعد الطبیعاتی یا حضوری طریقہ

(۲) تحلیلی طریقہ

(۳) تاریخی طریقہ

(۴) متقابلہ طریقہ

The methods of legal science

۱۔ مابعد الطبیعاتی یا حضوری طریقہ

یہہ اکثر جرمن، فرنچ اور اطالوی مصنفوں کا طریقہ ہے۔ اسکا قدم اول حق اور قانون کے مجرد تصورات کی تحقیق اور انکا اخلاقیات قانون قدرت۔ آزادی اور ارادۂ انسانی سے تعلق کی تشریح ہوتا ہے۔ اس طرح پر اس میں پہلے مابعد الطبیعاتی نفسیاتی اور اخلاقیاتی بحثیں آجاتی ہیں۔ بعد ازان اس میں چند بنیادی قانونی تصورات مثلاً اقتدار اعلی۔ اطاعت ذمہ داری فرض اور حق سے بحث ہوتی ہے۔ خصوصاً حق کے تصور کی اس طریق کار مین خوب تدقیق ہوتی ہے۔ پھر چند عالمی قانونی ادارون مثلاً خاندان۔ جائداد۔ وراثت۔ ازدواج اور معاہدے سے بحث کی جاتی ہے اور پھر ان کے متعلق وہ اصول بنائے جاتے ہین جو فطرتاً ان ادارون کی صحت مزاجی کیلئے مناسب ہوں۔

اس طریق کار کے بعض مصنفین تو محض مجردات ہی میں رہتے ہیں۔ اور ان کی تصانیف ان کے بنیادی مفروضہ تصورات پر کلیتہً بینی اور انہین سے مستخرج ہوتے ہیں۔ اور باقی مجردات کو چھوڑ کر بہت جلد واقعی قانون تک اتر آتے ہین اور اسکے اصولوں سے بحث کرنے لگتے ہیں۔ جب اس طریق کار کے پابند کانٹ اور ہیگل جیسی قابل شخصیتیں ہوں تو ان کی تصانیف کو گھٹانا بے ادبی ہو گی۔ لیکن بلاشبہ ان کی کتابیں بہت ادق ہین۔ ان کے مطالعہ سے بہت کم قانونی نقطہ نظر سے مفید باتین معلوم ہوتی ہین۔ اور یہہ تعداد میں اتنی زائد ہیں کہ انسان کی کم عمر بھی ان کے پڑھنے مین حائل ہے۔ الحاصل یہہ قانون اور قانونی اصولون سے دور محض مجردات کے کھیتون میں بڑی تعداد میں بڑے تناور پودے ہیں لیکن ان کے پھل بہت کم ہین۔ اور جیسا کہ آپ نے پالیا ہو گا ان کا طریق کار بھی سائنٹیفک نہین کیونکہ سائنٹیفک طریقہ تو استقرائی یا حصولی ہے۔ جو قانونی حقیقتون کو مد نظر رکھتے

ہونے اصولوں کا استنباط کرتا ہے اور ان کا طریقہ استخراجی۔ قیاس یا حضوری ہے۔ جو مجردات سے نکل کر مجردات ہی میں گم ہو جاتا ہے یا اگر قانونی حقیقتوں تک آتا بھی ہے تو ناکافی حد تک۔ ان تمام عیوب کے گنوانے کے بعد ان کے ایک ھنر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئیے اور وہ انکی قوت یا نعمت تفکر ہے (Gift of Speculation) اگر کوئی ایسا استاد پیدا ہو جائے جسمین ان اساتذہ کی سی خداداد قوت تفکر ہو اور وہ مجردات کو سلام کر کے قانونی حقیقتوں پر حاوی ہو کر اپنی خداداد قوت تفکر سے کام لے تو پھر علم اصول قانون مین ایک اہم اضافہ ہو گا۔

۲ - تحلیلی طریقہ | انگریزی طریقہ ما بعد الطبیعیاتی طریقہ کا بالکل ضد ہے۔ اس کے اساتذہ ما بعد الطبیعات اور اخلاقیات کو دور ہی سے سلام کر کے واقعی - حقیقی اور موجودہ انسانی وضع کردہ قانون سے ابتدا کرتے ہیں - اور جیسا کہ اس طریقہ کے نام سے ظاہر ہے اس کے اساتذہ قانونی الفاظ یا حدود (Terms) کو لیتے ہیں ان کی تعریف کر کے ان کے صحیح معنی مشخص کرتے ہین۔ اور ان کے باھمی تعلقات بتاتے ہیں ۔ خصوصاً قانون کی تعریف جو ان اساتذہ کی ہے مشہور اور معرکہ الارا ہے۔ جب اس طرح پر قانونی تصورات کے صحیح معنی ذہن نشین ہو جاتے ہیں تو وہ پھر قانون کے عام اصول استقراری طریقہ پر مستنبط کرتے ہیں۔ اور قانون کے کل اصولوں کو ایک نظام میں مرتب کرتے ہیں۔

اس طریق کار کے سب سے بڑے استاد جرمی نبتھم گذرے ہیں انہوں نے انگریزی قانون کی بڑی خدمت اس کی لغویات خرافات اور تصنیفات کو بیرحمانہ تنقید کے ذریعہ ظاھر کرنے سے اور اسکے موجودہ ضرورتوں کے لئے ناکافی ہونے کو ثابت کرنے سے کی۔ ان کی عمر اصلاح کے مد نظر بیرحمانہ نکتہ چینی مین

گذری - جسکا اثر یہ ہوا کہ صدیوں کا جمود ٹوٹ گیا : انگریزی قانون اب بے مثال نہیں سمجھا جانے لگا - بلاکسٹن کی کمنٹریس (شرحین) جسکی انہوں نے اچھی طرح خبر لی اب انگریزی قانون کی صحیح تصویر نہیں سمجھی جانے لگیں اور قانونی نظریوں پر بحث کا میلان عام ہو گیا ہے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وفات سے تیس سال کے اندر انگریزی قانون مین بہت سی اصلاحین ہو کر اسکی موجودہ شکل کی ابتدا ہوئی - بنتہم کی وفات کے بعد ان کے سب سے مشہور شاگرد جان آسٹن نے اسی طریق کار پر عمل کیا - اور انگریزی قانونی الفاظ کے معنی مشخص کرنے مین بڑی دقت اٹھائی - لیکن شاید انگریزی قانون کی اس وقت بہت کچھ اصلاح طلب ہونیکی وجہ سے بہی ان اساتذہ نے ایک طرف تو تاریخ یعنی ماضی سے سخت بے اعتنائی کی - اور ظاہر ہے کہ علم اصول قانون کے بنیادی اصول بغیر تاریخ کی مدد کے سمجھنا دشوار ہے - لیکن بنہتم نے اپنی ساری عمر نہ جانتے ہوئے یہ غلطی کی - اور دوسری طرف دیگر نظامات قانونی سے کوئی قابل لحاظ مدد نہ لی - یہ سچ ہے کہ جان آسٹن نے بہت کچھ رومن لا کو پیش نظر رکھا ہے - جہاں جہاں اسکی دانست میں انگریزی قانون میں کمی پائی گئی ہے اسکو رومن لا سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے - لیکن افسوس کہ وہ رومن لا پر اچھی طرح حاوی نہین تھے - اور انہوں نے اسکے متعلق بعض قانونی نظریوں کی دشواریوں تک نظر نہ پہنچنے کی وجہ سخت غلطیاں کی ہین - اسی لئے ان کے بہت سے نتائج غلط ہین -

۳- تاریخی طریقہ - اس طریقہ مین بر خلاف مذکورۂ بالا دو طریقون کے قانون کو بطور ایک معطیہ (Datum) کے نہیں تسلیم کر لیا جاتا ہے - بلکہ اسکے نشو نما پر غور کیا جاتا ہے ، کہ اسکی ابتدا کیسے ہوئی اور موجودہ حالت تک وہ کس طرح پہونچا - اس طریقہ مین قانون وقت کی ایک پیداوار ہے قانون بہی مثل مملکت

کے انسانی فطرت کی اس اقتضا کا نتیجہ ہے کہ انسان مل جل کر ایك معاشرہ (Society) بنا کر رہتے ہیں۔ اور گو اس معاشرہ کے اہم اور بنیادی اصول اور ادارے سارے متمدن ممالك میں ایك ہی ہوں لیکن ہر نظام قانون ہر وقت متغیر الحال ہے، تصورات میں بھی اور تیز اشکال (forms) کی حد تك بھی۔

اس طریقے کے فائدے دو ہیں:— اس سے بہت سے قانونی تصورات نظریوں اور قواعد کی تشریح ہوتی ہے، جو تشریح محض تحلیل یا مجرد نظریوں سے نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ تصورات وغیرہ محض عقل انسانی یا فطرت اشیا ہی کے پیدا کردہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان پر اس ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے جہاں ان قوانین کی نشو نما ہوتی ہے۔ ہر قانون ماضی اور حال۔ روایت اور سہولیت کے درمیان ایك میزان ہوتی ہے۔ اور محض تحلیل میں چونکہ صرف حال سے بحث ہوتی ہے، کسی بھی نظام قانونی کی پوری تشریح نہیں ہوتی۔ دوسری خوبی اس طریقے کی اس واقعہ کا ثابت کرنا ہے کہ قواعد اور قوانین چاہے آج ہمیں کتنے ہی مفید اور معقول نظر آئیں، اگلی نسلوں کو اتنے ہی مفید اور معقول نظر نہیں آئینگے۔ اسی لئے ماضی کو برا نہیں کہنا چاہئے کیونکہ حال بھی ماضی ہونیوالا ہے۔ اس واقعہ کو اگرچہ یہ قانون کے عام اصول سے نہیں بلکہ تفصیلات سے متعلق ہے قانون سازوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس طریقہ میں خطرہ یہ ہے کہ بہت آسانی سے وہ ایك طرف قدامت پرستی میں اور دوسری طرف عام سیاسی اور معاشری تاریخ میں متبدل ہو جاسکتا ہے۔ بعض نقاد اس پر الزام دیتے ہیں کہ یہ ماضی کی پرستش اور اسکو جائز سمجھنے سے اصلاح اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ یہ طریقہ کسی ایك خاص نظام قانون پر بہ نسبت تمام نظامہائے قانون کے زیادہ قابل اطلاق ہے۔ کیونکہ مختلف ممالك کی قانونی تاریخ کی تفصیلیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان تمام کے نتائج کسی جامع قانونی نظام میں شامل کرنے غیر معمولی معلومات اور

قوت تعمیر کی ضرورت ہے ۔ اور شاید باستثنائے روڈ اف خان اهیرنگ کے کوئی دوسرا شخص اس طریقه پر عمل کرکے کوئی علم اصول قانون کی کتاب نہیں لکھه سکا ہے ۔ .... آخری اور چوتھا طریقه ۔

۴۔متقابله طریقه ہے جو جدید ترین ہے ۔ اس کو مکان سے وهی تعلق ہے جو تاریخی طریقه کو زمان سے ۔ اس میں قانونی تصورات ۔ تخیلات ۔ نظریات اور اداروں کی جو مختلف ممالك اور نظام هائے قانون پائے جاتے هیں ۔ متقابله تحصیل اور تحقیق کی جاتی ہے ۔ اور اس طرح سے اس طریق کار کا مقصد ایك ایسے نظام کی تعمیر هوتا ہے جو فطری هو کیونکه مختلف ممالك کے انسانوں میں مشترك هوتا ہے ۔ فلسفیانه هو کیونکه مختلف اقوام هائے قوانین کا مغز لیا جاتا ہے ۔ اور کارآمد هو کر کیونکه اس سے یه ظاهر هوتا ہے که کن ذرایعۂ سے ایك هی مقصد مختلف نظام هائے قوانین میں حاصل کیا گیا ہے ۔ اوران میں سے کونسا طریقه بہترین ہے ۔ متقابله علم اصول قانون کی دو قسمیں هیں ایك وه جس میں تاریخ کی مدد لیجاتی ہے، کیونکه کسی دو مختلف نظام قانون کے درمیانی اختلافات کا مطالعه کہیں زیاده مفید هو جاتا ہے اگر تاریخ سے مدد لیکر یه کہا جائے که ان اختلافات کی ابتدا کیسے هوئی ۔ اس طرح پر متقابله علم اصول قانون کی اس قسم میں معاشری اور سیاسی تاریخ کا مطالعه بھی ضروری هو جاتا ہے اور اسی لئے اس قسم کو تاریخی طریقه کی ایك توسیع شده شکل سمجھا جاتا ہے ۔ دوسری قسم میں گو مختلف نظام قانون کے درمیانی اختلافات سمجھنے تاریخ سے بھی مدد لیجاتی ہے ۔ لیکن چونکه توجه زیاده تر حال کے قانونی مسائل پر هوتی ہے اس لئے دور تك تاریخی میدان میں مسافت طے نہیں کیجاتی ہے ۔ اس طریقه کی اس قسم میں ابتدا مختلف ممالك کے موجوده قوانین سے کیجاتی ہے اور پھر دیکھا جاتا ہے که ایك هی قسم کے مسائل کو ان

مختلف قوانین میں کس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً آج کل قانون ٹارٹس میں ایک شکل اور متنازعہ فی مسئلہ مالک کی نوکر کے افعال کیلئے ذمہ داری کا ہے۔ اس کے متعلق اس طریقہ میں مختلف ممالک مثلاً فرانس۔ جرمنی۔ انگلستان۔ ممالک متحدہ امریکہ اور برطانوی نوآبادیوں کے قوانین کا مطالعہ کیاجاتا ہے پھر یہ طے کرنیکی کوشش کی جاتی ہے کہ اس مسئلہ کی مشکلات کو حل کرنیکا کونسا طریقہ آسان ترین اور عملاً بہترین ہے۔

متقابلہ علم اصول قانون کی طرف آجکل عام رجحان ہے۔ دو سال پہلے کیمبرج کے پروفیسر ونفیلڈ نے ایک بسیط خطبہ اسکی ضرورت اور فائدوں پر دیکر اس کی تحصیل کی ترغیب دی ہے اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ مین کے بعد سے کسی نے قابل لحاظ طور پر اس پر توجہ نہیں کی ہے۔ اصولاً علم اصول قانون کے اس طریقہ پر اعتراض کرنا مشکل نظر آتا ہے، سوائے اس کے کہ باوجود اصولاً اسکے ٹھیک ہونے کے اس پر کام اتنا کم ہوا ہے کہ ہم کچھ نہیں سکتے کہ عمل میں اسکی کیا حالت رہیگی؟ مین نے بیشک قابل قدر کام کیا ہے لیکن ہم ادب سے کہنا چاھتے ھیں کہ انہوں نے تاریخ پر اتنی زیادہ توجہ کی ہے کہ ان کے کام کو قانون کا تاریخی مطالعہ کہہ سکتے ھیں۔ اور اسی لئے علم اصول قانون کی عملی ضرورتوں کیلئے کم مفید۔

آخر میں یہ سوال کرنے سے پہلے کہ ھمیں ایک علم اصول قانون کیلئے ان چار طریقوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کرنا چاھئے ھمیں یہ بھی پوچھنا چاھئے کہ آخر علم اصول قانون کس کیلئے مفید ہوگا اور کس کیلئے اسکو بنانا چاھئے۔ اس علم سے فائدہ یا تو قانون سازوں کو ھوسکتا ہے یا وکلاء اور ججوں کو یا طلبا کو۔دنیا کے متمدن ممالک کے مقننہ جات میں آجکل بہت کم قانون داں اشخاص ہوتے ھیں۔ اسلئے زیادہ تر ہمارا روئےسخن

وکلا - ججوں اور طلبا کی طرف ھوگا - کہ قانون کے اصول پر مکمل طور پر جاری ھوے
اپنی کو صحت - روشن دماغی - ھوشیاری ذھانت اور سرعت سے استعمال کرنے میں
علم اصول قانون کہاں تک مفید ھو سکتا ھے ؟

اس مطلب کیلئے - چاروں طریق کار مفید ھیں - لیکن نسبتاً شاید تاریخی طریقہ
سب سے بہتر ھے - کیونکہ ما بعد الطبعیاتی طریقہ کے متعلق ھم کہہ چکے ھیں کہ اس کی خوبی
قوت تفکر ھے لیکن اس کا نقص یہ ھے کہ اسکی کتابیں بہت ادق ھیں - اور وہ
مجردات ھی میں بہت زیادہ گم ھے - تحلیلی طریقہ سے ھمارے قانونی تصورات اور خیالات
متعین اور مشخص ھوتے ھیں - لیکن تاریخ سے بے اعتنائی کی وجہ سے اس میں وسیع النظری
نہیں - استقرا کیلئے بہت سے مواد سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا - اسی لئے اس کے بعض اساتذہ
کے بعض نتائج غلط ھوتے ھیں - متقابلہ طریقہ اصولاً ٹھیک ھے لیکن ابھی اسکو عمل کی
کسوٹی پر اترنا ھے - تاریخی طریقہ سے قانونی تصورات اچھی طرح سمجھ میں آتے ھیں -
استقراء کیلئے اگر احتیاط کیجائے تو حسب ضرورت مواد مل جاتا ھے - اور نتائج غلط ھونیکا
احتمال نہیں رھتا ھے -

لہذا اگر اب ھم سے سوال کیا جائے کہ قانون کی تعلیم اور قانونی ذھنیت کے
پیدا کرنیکے لئے ان چار طریقوں کو کس طرح استعمال کیا جائے ؟ تو کیا اسکا جواب حسب
ذیل نہیں ؟ کہ ھمیں ابتدا اس تحقیق سے کرنی چاھئے کہ قانون کی عمرانی علوم میں جگہ
کہاں ھے - باالفاظ دیگر ھمیں قانون کا تعلق اخلاقیات - نفسیات - سیاسیات اور معاشیات سے
دریافت کرنا چاھئے چونکہ یہ تحقیق فطرت انسان اور اسکے عام تصورات پر مبنی ھوگی
اسی لئے ما بعد الطبعیاتی طریقہ کے تحت آئیگی - اس کے بعد ان تصورات کی تحقیق چاھئے
جو تمام نظامہائے قانون میں بنیادی ھیں یعنی حق - فرض - وجوب ، ذمہ داری ، قانون اور

رواج ۔ بعض اساتذہ ان تصورات کو ما بعد الطبعیاتی یا حضوری طریقہ پر فطرت انسان سے مستخرج کرنا پسند کرینگے ۔ اور بعض ان تصورات کو موجودہ اور مروج معنوں سے ابتدا کرکے تحلیل کے ذریعہ ان کے معنوں کو معین اور مشخص کر دینا ۔ ان تصورات کی تحقیق میں چاھے ان دونوں میں سے کوئی بھی طریقہ استعمال کیا جائے اور در اصل ان دونوں میں حقیقی فرق کم ھے (کیونکہ اگر ایک فطرت انسان کی حضوری معنوں سے ابتدا کرتا ھے تو دوسرا اسکے مظاھر سے) لیکن دونوں طریقوں میں تاریخی طریقہ کار کی مدد ضروری ہوگی ۔ کیونکہ ھمارا مقصد قانون کے عام اصولوں کا مدون کرنا ھے ۔ ان کی تدوین میں تاریخ سے بے اعتنائی نہیں ہوسکتی ۔ اور اسکی مدد ضروری ہوتی ھے تاکہ ھم ان اصولوں کے ضروری اور مستقل عناصر میں سے کسی کو فروگذاشت نہ کردیں اور ھماری تعریفیں ان عام اصولونکے ضروری عناصر پر مشتمل ہوں ۔ مثلاً کچھہ عرصہ قبل قانون کی جو مشہور ترین تعریف تھی اسکو لیجئے ۔ اسکی رو سے قانون حکم مملکت (Command of the State) ھوتا ھے ۔ لیکن جیسا کہ میں نے ثابت کر دکھایا ھے یہ تعریف ھر سیاسی معاشرہ یا مملکت پر صحیح نہیں آتر تی ۔ پس اس واقعہ سے کہ وہ سیاسی ترقی کے بعض مدارج پر اطلاق نہیں پاسکتی ظاھر ھے کہ وہ کافی عام اساس پر مبنی نہیں ھے ان عام تصورات کی تحقیق کے بعد ھم ایک دوسرے مجموعہ تصورات کی جو خالصاً قانونی ھیں تحقیق کرینگے ۔ مثلاً ذیل کے تصورات کی ۔ یعنی ملکیت ۔ قبضہ ۔ معاھدہ ۔ ٹارٹس ، فعل خلاف قانون ۔ ازدواج ۔ ولایت ۔ غلامی ۔ انتقال جائداد ۔ رھن حقوق آسائش ۔ بیع ۔ شراکت ۔ تحویل اماناتی ۔ جرم ۔ فریب اور غفلت کی اس وقت ھم موجودہ نظام ھائے قوانین کے قواعد سے اور زیادہ قریب ھوجاوینگے ۔ گو ایک جرمن مابعد الطبعیاتی ان تصورات کو مثلاً ملکیت اور معاھدہ کے تصور کو ان عام حضوری اصولوں سے مستنبط کریگا جنکو وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں اصول موصوفہ کے طور پر قرار

دیگا۔ اور ایک سقراطی یا بتاھمی تحلیلی طریقہ کا استاد ان تصورات کے معنوں کی تحلیل اور تجزیہ سے ان کی تعریفات وضع کریگا۔ لیکن ضرور ھے کہ ان تصورات کی تحقیق اور ان کی تعریف ان معنی کے مطالعہ پر مبنی ہوں جو ایک یا زاید نظام قانون میں ان تصورات کے ھیں۔ یہاں تاریخی طریقہ سے پھر بڑی مدد ملیگی. کیونکہ کسی بھی نظام قانون کے وہ قواعد جو انسانوں کے ان تعلقات کو منضبط کرتے ھیں جو ان کے معنے سے نکلتے ھیں، کچھہ نہ کچھہ حد تک بے ضابطہ اور ایک نہ ایک حد تک ایسی خصوصیات کے حامل ھوتے ھیں، جو محض عقل کے پیدا کردہ یا محض عقل پر مبنی نہیں ھوتے ھیں۔ بلکہ تاریخی اسباب اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ ھوتے ھیں۔ مثلاً قبضہ۔ وراثت اور رهن کے رومی اور انگریزی قواعد میں بہت سی ایسی خصوصیات ھیں جن کی توضیح محض تاریخی مطالعہ ھی سے ھوسکتی ھے۔ ھم عام اصول بناتے وقت ایسی خصوصیات کو نظر انداز کردینگے۔ لیکن ھم کو یہ جاننا ضروری ھے کہ ان کی ابتدا کیونکر ھوئی ورنہ ان تصورات کے بعض اھم پہلو سے ھم غافل رھینگے۔ اور ھماری تعریفوں میں وہ ضروری اور مستقل عناصر نہیں ھونگے جو ایک عام علم اصول قانون کیلئے ضروری ھیں. اس طرح پر ایک عام علم اصول قانون کی تدوین میں گو تاریخ کا درجہ ثانوی ھے لیکن بہت ضروری بھی ھے کیونکہ تاریخی مطالعہ ھی سے یہ امر واضح ھوتا ھے کہ اشیا یا تصورات جن کے نام مختلف ھیں در اصل حقیقت میں ایک ھی ھیں۔ اور اشیا یا تصورات جن کے نام ایک ھی ھیں در اصل حقیقت میں جدا ھیں ۔ اس طرح پر علم اصول قانون کے استاد کو تاریخ سے قانونی تصورات کی وہ کامل توضیح اور تشریح ملتی ھے جو بغیر اس کے ممکن نہیں۔ متقابلہ طریقہ سے بھی آسے اسی قسم کی مدد ملتی ھے کہ بہت زیادہ زور کسی نظریہ یا ادارہ کی اس خاص شکل پر جو وہ کسی ایک نظام قانون میں اختیار کیا ھے نہیں دینا چاھئے بلکہ مغز کو دیکھنا اور مختلف پردوں میں جو ایک ھی تصور کار فرما ھے اس کو

گرفت کرنا چاهئے۔

مذکورۂ بالا تمام تصورات علم اصول قانون کے موضوع هیں۔ کیونکه یه هر ترقی یافته نظام قانون میں پائےجاتےهیں اور قانون کے مفاد پر مستقله هیں۔ لیکن اگر هم آگے اور تفصیلات میں جائیں توعام اصولوں کو مستنبط کرنا زیاده مشکل هوجاتا هے۔ کیونکه تفصیلات میں هر قوم کے خاص طریقوں اور رواجات کوبھی دخل هوتا هے اور یہاں جو طریقه یا رسم ایک قوم کے لئے مناسب هوتا هے دوسرے کیلئے مناسب نہیں هوتا، تویہاں علم اصول قانون طالب علم کو الوداع کہیگا ، اور اسکو ان اساتذه کے سپرد کردیگا ، جو مثلاً انگلستان ، اسکاٹلینڈ ، فرانس یا روس کاقانون پڑهاتےهیں۔ اور رخصتانه نصیحت یه کریگا که ان قوانین کی تفصیلات میں اور ان پر تنقید کرتےوقت آن عام اصولوں کو اطلاق دے جو علم اصول قانون میں اس نے سیکھے هیں۔

اس طرح علم اصول قانون کے اصول موضوعه کچھه بہت زیاده نہیں هیں اور ایک مختصر سے پیمانه میں بیان کردئے جاسکتے هیں۔ سوائے اسکے که اساتذه ایک طرف اخلاقیات میں اور دوسری طرف تاریخی مواد میں بہت زیاده دور تک جائیں اور اس علم کے مطالعه کا فائده ان معلومات کے بہم پہچانے پر جو اس علم کے مطالعه سے حاصل هوتےهیں موقوف نہیں هے۔ بلکه اس تربیت دینے پر که تفصیلات پر همیشه صحیح اصولوں کا اطلاق دیا جاسکے ۔ اسی لئے هر طالب علم کو تفصیلات میں پڑھنے سے پہلے اصولوں پر حاوی اور ان کے صحت روشن دماغی ذهانت اور سرعت سے اطلاق دینے میں ملکه حاصل کرنا چاهئے۔ اور نه اس کو اور نه جج اور وکلا کو کبھی فراموش کرنا چاهئے که قانون کی ترقی میں وه قابل قدرمدد دیسکتے هیں پس اس طرح پر اگر مذکورۂ بالا امور کو ملحوظ رکھیں تو عام علم اصول قانون کے اصولوں کی تدوین سے هم ایک ایسا نظام قانون پیدا کرسکتے هیں

جو باهم متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق هوگا۔

اوراوپر کی ساری بحث کا خلاصه یه هوگا که، علمِ اصول قانون ایك علم ہے۔ اور وہ عام ہے۔ اس کی تحصیل کیلئے چار طریقے رائج هیں۔ چاروں مفید هیں۔ لیکن هر ایك کی خوبیوں کو لیکر علمِ قانون کے وہ اصول مرتب هوسکتے هیں جن کے مطالعه سے قانونی ذهنیت پیدا هوتی ہے اور جو نظام قانون کو متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق کردیتا ہے۔

ماهیت قانون

قانون کیا ھے ؟ اس حصه میں ھمارے سامنے اسی کی تحقیق ھے ۔ مختلف اساتذه کی قانون کی ماھیت کے متعلق مختلف رائیں ھیں ۔ چنانچه قانون کی ماھیت کے متعلق تحلیلی اور تاریخی اسکولس میں معرکته الارا اختلاف ھیں ۔ اور یون توڈین پونڈ نے قانون کی ماھیت کے متعلق (۱۲) مختلف تصورات گناد ئے ھیں ۔ لیکن به لحاظ شهرت اورا ھمیت کے ھم حسب ذیل چار اھم تصورات پر تفصیل سے غور کرینگے ۔ چنانچه قانون کی ماھیت کے متعلق پہلا اور بہت قدیم تصور یه ھے که :—

(۱) قانون ایک مطلق ۔ عالمی اور اخلاقی اصول کا مظهر ھے یعنے قانون قدرت (Jus Natural or Law of Nature) ھے ۔ یه تصور بہت ھی قدیم ھے اسکو برک نے بدیں الفاظ بخوبی ادا کیا ھے که صحیح معنی میں تمام انسانی وضع کرده قوانین علانی ھیں یعنی ایک الهی قانون کا اعلان کرتے ھیں ۔

(۲) قانون ایک مقتدر اعلی کی مرضی یا اسکا مظهر ھے قانون کے اس تصور کو تحکمی تصور (Imperative conception) کہتے ھیں ۔ اسکا اب بھی بڑا اثر ھے ۔ اور اسکی خوبی بھی کچه تھوڑی نهیں ھے ۔ انگریزی علم اصول قانون کا یه خصوصی تصور ھے گو ھمیں ماننا ڑیگا که یه یک رخی اور غیر مکمل تصور ھے ۔

(۳) تیسرے تصور میں قانون تاریخی قوتوں اور حالات کا پیدا کرده (قاعده عمل) ھے ۔ وه نه تو شعوری تخلیق ایک فوق البشر عالمی حکمت ان اصول کی ھے اور نه مقتدر اعلی کی مرضی کی ۔ بلکه قانون ایک ارتقا ھے ایک نشو نما ھے جو حالات کا پیدا کرده ھے ایسی حالات کا جو بڑی

حد تک اتفاقی ہیں اور تقریباً کلیۃً زمان مکان اور قوم کے اختیار سے باہر ہیں۔ اور اسی لئے قانون کا یہ تصور انیسویں صدی کے تاریخی اسکول کا تصور یا ہمارے الفاظ میں اسکی تعبیر ہے۔ اسکا اثر روز افزوں ہے اور اسکی خوبی بہت زیادہ۔ لیکن یہ بھی یک رخی اور غیر مکمل ہے۔

(۴) چوتھے تصور میں قانون ایک خاص مقصد کیلئے ایک خاص ذریعہ ہے یعنی وہ ایک آلہ ہے مقصود بالذات نہیں۔ مقصد تو کوئی اخلاقی یا معاشری ہوتا ہے مثلاً انصاف آزادی۔ افادیت۔ عوام یا افراد کا مادی مفاد۔ اس تصور کے حامی اساتذہ کا دعوی ہے کہ بغیر ان اخلاقی یا معاشری مقصدوں کو پیش نظر رکھے کہ قانون کا سمجھنا دشوار ہے۔

قانون قدرت

مین کی Ancient Law - کارلایل کی - Medival Pol. Theories in the west. - برایس کا گیارھواں مقالہ - پالک کی Essays on the Law. اور پالک کی The expansion of the common Law آسٹن کا اکتیسواں لکچر - وینوگراڈاف کی Common sense in Law کا آخری باب - کرکوناف - تھیوری آف لا جلد (۱) باب (۳)

قبل اسکے ہم قانون کے اس تصور کے ان چار دور کا ذکر کریں جو اس پر گذری ہیں۔ ہم یہ کہدینا چاہتے ہیں کہ آجکل اکثر اساتذہ قانون کے اس تصور کو بہت ہی شبہہ سے دیکھتے ہیں۔ اساتذہ کی ساری توجہ قانون صریح (Positive Law) یعنے انسانی وضع کردہ قانون کی ماہیت سمجھنے اور اسکے مطالعہ میں صرف ہوتی ہے۔ بہت ہی کم اساتذہ اس انسانی قانون کو (Idealise) یعنے تمثالی بنا کر اسکا مطالعہ کرتے ہیں۔

گویا آجکل نقطہ نظر معروضی ہے موضوعی نہیں - بہرحال اب ہمیں مختصر طور پر یہ جاننا چاہئیے کہ قانون کے اس تصور پر کہ قانون ایک مطلق ، عالمی ، اور اخلاقی اصول ہے یعنی اسکا مظہر ہے حسب ذیل چار دور گذرے ہیں۔

الف - پہلا فلسفیانہ دور

ب - دوسرا قانونی دور

ج - تیسرا مذہبی دور

د - اور چوتھا جدید دور

الف - پہلا فلسفیانہ دور

جب انسان قدرت کے مختلف مظاہر سے واقف ہو گیا اور ان پر غور کرنے لگا تو پہلے تو اس نے عالم حیوانات اور نباتات اور انکے مختلف اقسام میں دیکھا کہ گونا گوں اختلافات کے باوجود یہاں چند مشابہتیں اور یکسانیتیں پائی جاتی ہیں اور تمام حیوانوں نباتاتوں میں جو سب سے زیادہ مشترک امر ہے وہ ان کے نشوونما کے طریقہ ہیں یعنی تمام حیوان ایک ہی طرح پر پیدا ہوتے ہیں - پہلے چھوٹے اور کمزور رہتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ بڑے اور قوی ہوتے ہیں - اور اسکے بعد وہ کمزور ہو کر مر جاتے ہیں - اسی طرح تمام پودے زمین سے اگتے ہیں - کونپلیں اور پھر پتے نکلتے ہیں انہیں پھول لگتے ہیں اور بڑے ہونیکے بعد ان میں بیج پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی مر جاتے ہیں - ان مظاہر کو نوٹ کرنے سے اس کے ذہن میں چند تصور پیدا ہوئے - مثلاً یہ کہ یہ مشترک خصوصیات پیدائشی ہیں - حیات اور ممات نشو و نما (کے قانون سے) کسی کو مفر نہیں ہے - اور یہ بھی کہ ان مظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نیچے کوئی قوت ہے جو ان مخلوقات پر کارفرما ہے - ان سے کلیۃً ماسوا

ہے اور ان کے اختیار سے باہر ہے اور اسی نے انکی زندگی کے طریقوں کو مقرر کیا ہے۔

قدرت کے مظاہر سے واقف ہونیکے بعد غور کرنے والے انسان کا دوسرا مشاہدہ یہ ہوا کہ انسانوں میں بھی مثل حیوانات و نباتات کے با وجود گونا گون اختلافات کو بہت سی اہم خصوصیات مشترک ہیں۔ ان کی خواہشات تمنائیں اور جذبات ایک ہی ہیں۔ یہی خواہشات اور جذبات با وجود شخصی اختلافات کے تمام انسانوں کے افعال کے محرک ہوتے ہیں اور ایسے اصولوں اور طریقوں پر محرک ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ اس طرح پر یہ تصور پیدا ہوا کہ با وجود شخصی اختلافات کے تمام انسانوں کی ساخت ایک ہی ہے۔ یہ ساخت ان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، بلکہ اسکا بیج ان کی فطرت میں مضمر ہے جو جسمانی اور ذہنی ترقی کیساتھ نشو و نما پاتا ہے۔ اس طرح پر کل انسانوں کی مشترک خصوصیتوں کا اہم تر جز ان کی پیدایش بہ حیثیت انسان اور ان کے نشو نما اور زوال ہوئے۔ سو یہاں بھی حیات نشو نما اور ممات کے مظاہر ایسے مظاہر ہوئے جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں۔

اور جب انسان غور کرنے سے بھی آگے بڑھکر فلسفانے لگا یعنی جب اس میں فلسفی پیدا ہوئے تو انہیں ایک ایسی علت کی تلاش ہوئی جو جاندار اور بے جان عالم کی قوتوں کے پیچھے ہے اور نیز جسکی وجہ سے ایک نظام سا دنیا میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی طبیعاتی قوتیں۔ ہوا۔ بارش۔ پانی۔ چاند سورج وغیرہ بھی ایک منتظم قاعدہ کے تحت عمل کرتے ہیں۔ تو جاندار اشیا بھی مقررہ طریقوں اور اصولوں پر پیدا ہوتے نشو نما پاتے اور فنا ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے فلسفی اس نتیجہ تک پہنچے کہ کارخانہ قدرت میں ایک ایسی قوت کا ہونا ضروری ہے جس نے اپنی مرضی سے دنیا

میں نظام قائم کیا ھے - چاھے یہ قوت ایک خدا ھو - یا اشیا ھی میں کوئی فطری اور ان روك طاقت - اس قوت کو انہوں نے جو نام دیا وہ پیدایش (Birth) کے مشتقات سے ھے یعنی (Nature) بالفاظ دیگر فطرت یا قدرت -

اسی طرح جب فلسفی حضرات انسان کے متعلق سوچنے لگے تو پہلے تو انہیں تمام انسانوں میں چند مشترك خصوصیات دریافت ھوئیں - اور مزید برآں انہوں نے دریافت کیا کہ جسطرح تمام حیوانوں کی تمام قوتیں ملکر ان کی جسمانی ترقی اور تحفظ کی طرف کام کرتے ھیں - اسی طرح انسانوں کی تمام قابلیتیں - ذھنی اور جذباتی قابلیتیں ان کے ایک ذی عقل ارادے کے ماتحت ھیں - پس وہ مرکزی اور بالاترین قوت جنھیں انہوں نے مادی دنیا میں فطرت یا قدرت کے نام سے موسوم کیا تھا - انسانی دنیا میں اسے انہوں نے (Reason) عقل سمجھا - اور جب انسانی دنیا میں اس قوت سے عاقلانہ کام سرزد ھوتے ھیں تو کیا یہ خود لازماً ذوالعقل (Rational) نہیں - اس طرح پر فطرت اور عقل مرادف ھوگئے - یا فطرت خود عقلمند سمجھی گئی - یا کم از کم فطرت میں عقل کا بھی ایک پہلو مانا گیا -

پس جب فطرت یا قدرت کا تصور انسانی سوسائٹی کے متعلق اطلاق دینے سونچا جانے لگا تو اسکے دو اجزاء پائے گئے - یکسانیت اور قوت - یکسانیت اس لئے کہ تمام انسانوں کی ایک ھی قسم ھونے کی وجہ سے ھے - ان کے جذبات خواھشات مقاصد اور انکا مبدا ایک سے ھوتے ھیں اور قوت اسلئے کہ یہ یکسانیت ایک ذوالعقل طاقت کی وجہ سے ھے اور یہ ذوالعقل طاقت چاھے مادی دنیا میں شعوری ھو یا نہو (اور یہاں فلسفیوں میں اختلاف تھا اور ھے) لیکن یہ انسانی دنیا میں شعوری اور شخصی ھے -

قوانین قدرت کا لفظ بہت بعد میں وضع ھوا - لیکن اسکے یہی دو اجزا تھے - یعنے تمام دنیا میں قدرت کے مظاھر میں یکسانیت پائی جاتی ھے - اور یہ یکسانیت ایک

ذوالعقل طاقت کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے مادی دنیا کے طبعیاتی مظاہر میں یکسانیت ہے اور یہ یکساں مظاہر قوانین قدرت ہیں۔ اسی طرح انسانی دنیا میں انسانی امور میں اخلاقی، معاشری، سیاسی اور قانونی امور میں باوجود گوناگوں اختلافات کے یکسانیت ہے اور یہی یکساں امور قانون قدرت ہیں۔

قانونی امور ھی کو لیجئے۔ مختلف قبایل میں کچھ تو انکے ماحول کی وجہ سے مثلاً ملک کے زرعی ہونے یا ریگستانی ہونے یا ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے قانون کی تفصیلات میں فرق ہوگا اور ایک دیہی آبادی کے قوانین ایک بدویانہ خانہ بدوش شکاری قبیلہ کے یا ایک مچھلی خوار بستی کے آبادی کے قوانین سے تفصیلات میں جدا ہونگے۔ اسی طرح نہ صرف ماحول کے اثر کی وجہ سے بلکہ کسی تاریخی حادثہ کی وجہ سے بھی قوانین کی تفصیلات میں فرق ہوجائیگا۔ مثلاً کسی زبردست قبیلہ سے جنگ میں ہارنے کی وجہ سے زبردست قبیلے میں قوانین کی بہت سی تفصیلات مختلف ہوجائینگی۔ یا کسی زبردست پادشاہ کی بدمزاجیوں اور اوھام کا بھی قوانین کی تفصیلات پر اثر ہوجائیگا۔ لیکن تمام قبایل اور اقوام میں باوجود ماحول۔ تاریخی حادثوں یا شخصی شاھی اوھام کے بہت سے رسم و رواج و قوانین ایک سے ملینگے۔ ہر جگہ ایک ھی قسم کے افعال کو برا سمجھا اور ایک دوسرے قسم کے افعال کو اچھا سمجھا جائیگا۔ مثلاً سرقہ۔ قتل وغیرہ کو برا۔ بہادری شجاعت وغیرہ کو اچھا سمجھا جائیگا۔ ہر جگہ خاندانی تعلقات ہونگے۔ ان کے متعلق اصول باوجود گوناگوں تفصیلی اختلافات کے ایک ھی ہونگے۔ کسی نہ کسی قسم کی عدالتی مشنری ہوگی۔ کوئی نہ کوئی مذھبی پیشوا اور خدا ہونگے۔ یہ مشابہتیں اور یکسانیتیں اتنی یقینی اور عام طور پر پائی جائینگیں کہ اگر کوئی مسافر ایک بالکل ھی نئے قبیلہ میں جاسکے تو ان مظاہر کے وجود کا اس کو یقین کرلینا چاھئے۔ اور کو ترقی یافتہ اقوام اور وحشی اقوام کے قوانین

اور رسم و رواج میں فرق ہوگا۔ لیکن یہ فرق صرف درجہ کا ہوگا۔ اور وحشی اقوام میں بھی انہیں قوانین و رواجات کے تخم پائے جائینگے جو مہذب اقوام میں بار آور پودوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ غرض ہر مکان اور زمان میں قوانین اور رسم و رواج کا یہ فرق کہ کچھ ان میں فطری عالمی اور مستقل اور کچھ مصنوعی مقامی یا عارضی ہوتے ہیں پایا جائیگا۔ قوانین اور رواجات کا وہ حصہ جو فطری۔ مستقل اور عالمی ہو وہ تمام انسان کی ساخت۔ قسم۔ فطرت کے ایک ہونے کی وجہ سے ہے۔ با الفاظ دیگر فطرت نے انہیں ان قوانین کو سکھایا ہے اور یہی قوانین فطری یا قدرتی ہیں۔

ان فطری یا قدرتی قوانین کی جانب ادب میں جگہ جگہ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سفوکلس کی (Antiyone) میں جب بادشاہ نے آنٹیون پر شہر کے قوانین کی خلاف ورزی کا الزام دیا تو اس بہادر عورت نے جواب دیا کہ ان قوانین کو (Zeus) یا انصاف نے یا عالم علوی کے دوسرے خداؤں نے نہیں بنایا ہے۔ آخرالذکر قوانین ایسے ہیں جو آج یا کل کے نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہینگے۔ سقراط کو بھی زہر کا پیالہ یونان کے قوانین کے خلاف ورزی میں انہیں قوانین کی طرف ہدایت کرنے کی وجہ سے پینا پڑا۔ سینٹ پال نے بھی ان قوانین کی تعریف یوں کی کہ یہ وہ قوانین ہیں جو انسانوں کے دلوں پر منقوش ہیں (Heraclitis) نے ان کو الہی قانون کہا جس سے تمام دنیوی قانون کو غذا ملتی ہے۔ سقراط نے کہا یہ قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی خلاف ورزی میں ان کی سزا مضمر ہوتی ہے۔ افلاطون نے مجرد نظری انصاف کو واقعی انصاف کے مخالف بتایا ہے۔ ارسطو نے اس خیال کو اور بھی صراحت کیساتھ بیان کیا ہے کہ قوانین اور رسم و رواج اگرچہ انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن ہر وقت ان کا اصلی انصاف پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ اصلی، یا فطری انصاف بہت سی صورتوں میں قوانین کے واقعی انصاف سے ورے رہتا ہے

یہی قانون قدرت ہے۔ واقعی قوانین کو اسی کی تلاش رہتی ہے۔ رواقئین پر ارسطو کی تصنیفات کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے اسکو عقل (Reason) یا الٰہی عقل کے مرادف سمجھا۔ اور قرار دیا کہ چونکہ یہ عقل فطری ہے اس لئے اگر انسان اسکی تتبع یا فطرت کے موافق زندگی بسر کرے تو اپنے فرض سے سبکدوش ہوکر خوشی حاصل کریگا۔

(ب) دوسرا قانونی دور

قانون قدرت کا دوسرا قانونی دور رومی دنیا میں رومی تجربہ کی وجہ سے شروع ہوا۔ روما جزیرہ نما اطالیہ میں ایسی جگہ واقع تھا کہ وہاں بہت سے اجنبی تجارت کی خاطر آتے تھے ان اجنبی قبائل کے قوانین اور رسم و رواج رومی قوم کے قوانین وغیرہ سے جدا تھے۔ اور یہہ قانون روما کا ایک اصول تھا کہ اس کے قوانین سے فائدہ اٹھانے رومن شہری ہونا ضروری تھا۔ اور ظاہر تھا کہ یہہ اجنبی رومن شہری نہ تھا۔ اور یہہ بھی ظاہر تھا کہ ان اجنبیوں اور رومن شہریوں کے تجارت وغیرہ کے تعلقات منضبط کرنے کسی قانون کی ضروت تھی۔ اس طرح پر رومن مجسٹریٹوں کو ایک قانون بنانے کی ضرورت ہوئی جو بعد میں چلکر (Jus gentium) قانون اجانب کے نام سے مشہور رہوا۔

اس کی ابتدا اور طریق کار کے متعلق مختلف نظریہ ہیں۔ چنانچہ سر ھنری مین کا نظریہ ہے کہ ایک خاص رومن پریٹر Pregrinus اجانب کیلئے مقرر کیا گیا اس نے مختلف قبائل کے قوانین کو دیکھا اور ان کا مقابلہ کر کے ان میں سے سب سے بہتر قانون کو منتخب کیا اور اس کو نفاذ دیا۔ لیکن صحیح بات یہہ ہے کہ کوئی ایک رائے قائم کرنا کمی معطیات کی وجہ سے مشکل ہے۔ مین کی رائے اب

زیادہ وقیع نہیں سمجھی جاتی۔ کیونکہ یہہ محض انکا خیال ہے اور معطیات پر مبنی نہیں ہے (اور اسلئے بھی کہ رومن لا میں بہت کم اجنبی عناصر ہیں۔ غالبا یہہ خیال صحیح ہے کہ خود رومن لا کے اصولوں کو انکی (technicalities) مصطلحات سے صاف کر کے ترقی دیگئی)۔ برائیس کا خیال ہے کہ غالبا رومن مجسٹریٹوں نے تجار کے ان رواجات کو جس پر مختلف قبائل کے تاجروں کو عمل کرتے دیکھا ، لے لیا۔ اسی طرح جس طرح بہت بعد انگریزی ججوں نے لارڈ مانسفیلڈ کی سر کردگی میں انگریزی تجارتی قانون میں تاجروں کے رواجات کو تسلیم کر لیا۔

چاہے طریق کار کچھ بھی ہو لیکن یاد رکھنے کی بات یہہ ہے کہ رومنیوں نے عملی ضرورت کی وجہ سے آہستہ آہستہ قواعد اور ضوابط کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جو گو عام خصوصیتوں میں ان کے قانون (jus civile) سے مشابہ تھا لیکن جو کم اصطلاحی زیادہ عملی اور عام انسانوں کی سمجھ کے موافق تھا۔ اس کو انہوں نے (jus gentium) کہا ، یعنی ایسا قانون جو مختلف قبائل اور اقوام میں عام ہو ، جس کو تمام اقوام استعمال کرتے اور سمجھتے ہوں۔ ہر قبیلہ یا قوم کے بہت سے قوانین ہر دوسرے قبیلہ یا قوم سے مختلف ہیں لیکن ان تمام مختلف قوانین کے پیچھے نصفت اور سمجھ عقل کے عام اصول مضمر ہیں۔ اس لئے اگر ان کے مطابق قوانین بنائے جائیں تو تمام اقوام ان پر عمل کرنا اور ان سے اپنے تعلقات کو منضبط کرنا پسند کرینگے۔ اس طرح پر (jus gentium) بنی نوع انسان کا مشترک قانون ہوا اور (jus gentium) کا یہہ تصور جس تک رومن اپنی عملی اور حکمرانی ضرورتوں کی وجہ سے پہونچے یونانیوں کے " بنی نوع انسان کے مشترک قوانین " کے مشابہ ہوا۔ جس تک یونانی مجرد طور پر اپنے فلسفہ قوانین کے وجہ سے پہونچے تھے۔ ان دونوں میں فرق یہہ تھا

کہ رومی تصور تجربہ پر مبنی اور استقرائی تھا۔ اور اسی لئے کلیتۃً مجرد انصاف یا مجرد عقل پر مبنی نہیں تھا۔

اس نوبت کے بعد رومی سلطنت یا شاہنشاہیت اور رومی دنیا میں دو یا تین اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی وجہ سے (jus gentium) اور قانون قدرت عام طور پر ایک ہی سمجھے جانے لگے۔ پہلے تو رومن شخصی شاہنشاہی کے قیام سے اکثر بہترین نوجوان دماغوں پر سنیات میں عوام میں اور قانونی پیشہ میں تقرر کے ذریعہ امتیاز حاصل کرنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ ان ایسے بہترین دماغوں میں (Cicero) بھی تھا۔ اس نے سیاسی سرد بازاری کی وجہ سے عملی میدان کی طرف توجہ کی رواقئین کے فلسفہ کو جو پہلے سے رائج ہو چلا تھا اپنی قابلیت اور عمدہ زبان اور طرز ادا کی وجہ سے ہر دلعزیز بنا دیا۔ خصوصاً "قانون قدرت" کی رواقئین کے فلسفہ میں خاص جگہ تھی۔ سیسرو نے بھی اس پر خاص توجہ کی۔ اور تقریروں اور تحریروں میں فطرت کو اخلاق اور قانون کا اعلیٰ ترین ماخذ ثابت کیا۔ اس کے نزدیک قانون فطرت (Nature) فطرت سے ماخذ ہے۔ انسان کیلئے طبعی ہے۔ یاد سے با ہر قدیم ہے ہر جگہ ایک ہی ہے۔ نہ تغیر و ترمیم پذیر ہے اور نہ تنسیخ پذیر۔ اخلاق کی بنیاد یہی ہے۔ اور قانونی صریحی کے قواعد میں اسکو موجودہ سے زیادہ دخل ہونا چاہئے۔ اس طرح پر رواقئین کا فلسفہ اور اس فلسفہ میں قانون قدرت کے متعلق خاص حصہ اس وقت رومن شاہنشاہیت میں بہت ہر دلعزیز ہو گیا۔ سیاسی میدان کی تنگی کے علاوہ اسکی دوسری وجہ مذہب کا تعلیم یافتہ اشخاص میں نابود ہوجانا بھی تھا۔ غرض یہہ ایقان کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہیں۔ قانون قدرت اخلاق اور قانون کی بنیاد ہے بدیہی تصور مانے گئے اور جب پھر رومن شاہنشاہیت تمام متمدن ممالک میں قائم ہو گئی۔ دنیا کے اکثر حصوں پر رومن پرچم لہرانے لگے تو اس

خیال میں اور تقویت ہوئی۔ کیونکہ ایک سلطنت کیلئے ایک قانون بھی ہونا چاہئیے اور یہہ قانون (jus gentium) ہی ہو سکتا تہا۔ اور گو واقعتہ اس کو رومن عدالتوں نے بنایا تہا۔ لیکن وہ تمام بنی نوع انسان میں مشترک اور انکے قوانین کے مغز پر مشمول ہے۔ اور اسی لئیے وہ عقل انسانی کا تیار ہوا ہے گویا وہ قانون قدرت ہے۔ جسٹینین کے (Institutes) میں قانون قدرت اور (jus getium) کا یہہ انطباق تقریباً مکمل ہو گیا۔

رواقی فلسفہ کے رواج عام اور رومن شاہنشاہیت کی عالمی وسعت کے علاوہ ایک تیسرے سبب سے بہی اس انطباق میں مدد ملی۔ اور وہ تصور نصفت کا تہا۔ رومنوں کے نزدیک نصفت سے مراد (fairness) الفاظ اور اصطلاحات کے ورے انصاف۔ اس قسم کے جذبات جو ایک شریف اور ذی عزت شخص کو دوسروں کیساتھہ معاملات میں ہونے چاهئیں تہے۔ اس طرح پر نصفت کے تصور سے ایک اعلیٰ قانون کا تصور مکمل ہوا۔ اسلئے قانون قدرت مابعد الطبعیاتی اور فلسفہ کے نقطہ نظر سے وہ قانون ہوا جسے فطرت یا خدا نے بنایا ہے۔ تاریخ اور سیاسیات کے نقطہ نظر سے وہ وہ قانون ہوا جسکی بنی نوع انسان نے مختلف اقوام میں منتظم ہو کر اپنے ارادے سے رواج کے ذریعہ بنایا۔ اور اخلاق اور نفسیات کے نقطہ نظر سے وہ وہ قانون ہوا جو اعلیٰ (Typical) انسان کے ان شریفانہ رجحانات اور جذبات کا مظہر ہوا جنکی وجہ سے وہ اپنے همسایہ سے ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہتا ہے جیسے کہ خود اپنے ساتھ۔ ان تین تصورات اجماع سے قانون قدرت کا تصور مکمل۔ متوافق اور متوازن ہو گیا۔

(ج) تیسرا مذہبی دور

از منہ وسطی کا ہے۔ اس میں عیسائی پادریوں نے بڑی آسانی سے فطرت کو خدا سمجھا چنانچہ سینٹ کریسٹم نے کہا کہ جب مین فطرت کہتا ہوں میرا مطلب خدا ہوتا ہے کیونکہ یہہ

خدائے تعالیٰ ہی ہے جس نے دنیا کو بنایا ہے، اور اسی طرح قانون قدرت کو الہی قانون سمجھا گیا۔ ہم سینٹ پال کا قول لکھ چکے ہیں کہ کس طرح انہوں نے قانون قدرت کو وہ قانون کہا جو خدائے تعالی نے انسانوں کے دلوں پر کندہ کیا ہے۔ اسی طرح سینٹ آگسٹائن نے قانون قدرت کو وہ ابدی اور سرمدی قانون سمجھا جو خدا کے شہر کا قانون ہے۔ غرض یہہ کہ عیسائی پادریوں نے قانون قدرت کو خدا کا بنایا ہوا الہی قانون سمجھا اور اس سے ان کی جو مراد تھی وہ سینٹ تھامس اکوئنس کے الفاظ میں یوں ظاہر کی جاتی ہے کہ ابدی اور الہی قانون جو تمام چیزوں پر حکمران ہے خدا کی جو سب سے بڑا قانون ساز ہے عقل کا مظہر ہے اس کا وہ حصہ جو وحی کے ذریعہ نازل نہیں کیا گیا بلکہ خود انسان کو اس کی عقل کے ذریعہ سکھایا گیا مناسب طور پر قانون قدرت کہا جاسکتا ہے۔ اور قانون انسانی عقل کا پیدا کردہ سہی لیکن خود انسانی عقل خدا کی عقل کی پیدا کردہ ہے۔ اس طرح پر قانون قدرت بھی الٰہی قانون ہوا۔ غرض عیسائیوں کے نزدیک قانون قدرت وہ مطلق عالمی قانون ہوا، جو انسان کو بحثیت انسان کی اس کی عقل کے ذریعہ خدا نے سکھایا ہے اور اس طرح پر وفیسر آلن کے الفاظ میں تیرھویں صدی کے آخر میں قانون قدرت کا مکمل عیسائی تصور جو ہوا وہ رواقئیں کے قانون قدرت کا تصور ھی تھا گو دوسرے الفاظ میں تھا۔ اس کی تعبیر وحی کے الفاظ میں کیگئی تھی اس کو مذھبی اقتدار حاصل تھا۔ اور کلیسائی قانون کی اس پر مہر تھی۔

ظاھر ہے کہ اس دور میں اس تصور کا استعمال زیادہ تر اخلاقی اور مذھبی دائروں میں ہوا کیونکہ اس دور میں قانون کی تحصیل کم ہوتی تھی، اور اس تصور کا ایک مصرف ھمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاھئیے کہ پوپ اور شاھنشاہ کے حامی ایک دوسرے کو اس کے خلاف ورزی کا مرتکب گردانتے اور بعض وقت رعایا

نے بھی ان کے قوانین کی خلاف ورزی کو اس وجہ سے جائز سمجھا تھا کہ یہہ قوانین اس قانون قدرت کے خلاف تھے۔ اس طرح پر اس تصور کے ذریعہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی برتری کا اعلان کیا جاتا تھا مابعد انسانوں کا یہہ فرض بتایا جاتا تھا کہ وہ ان کی پابندی کریں۔ شہریوں کے اس حق کو کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کریں علانیہ طلب کیا جاتا تھا۔ چاھے یہ حفاظت بغاوت اور ظالم بادشاہوں کی معزولی اور قتل کے ذریعہ ھی ہو۔ بالفاظ دیگر الٰہی انصاف میں تمام قوانین کے ماخذ کو قرار دیکر اس تصور نے قانون صریح کے اقتدار پر روك لگائی اور ان قوانین صریح کے جواعز کو قانون قدرت کی مطابقت پر موقوف رکھا۔

چوتھا۔جدید دور

یہ ازمنہ وسطیٰ کے اختتام اور نشاۃ جدیدہ اور عہد اصلاح سے شروع ہوتا ھے۔ اس دور میں قانون قدرت کا تصور کا استعمال ذیل کے تصورات کے سمجھنے اور حل کرنے میں کیا گیا۔ مثلاً قانون کا ماخذ کیا ھے ؟ سیاسی معاشرہ کی ابتدا اور سیاسی اقتدار کی ابتدا کیونکر ہوئی ؟ اس دور میں یہ سوالات اس لئے پیدا ہوے کہ ازمنہ وسطیٰ کے سیاسی نظام جن میں پوپ کے اقتدار کو حضرت عیسیٰ کے سینٹ پٹر کے ارشاد سے اور شہنشاہ کے اقتدار کو یا تو پوپ کے اقتدار سے یا راست خدا کے اقتدار سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا ختم ہوگئے تھے، اور ضرورت تھی کہ پادشاھت اور مملکت کو کسی دوسرے نظریہ کی بنیاد پر قائم کیا جائے تاکہ ان کی اطاعت کا مسئلہ حل یعنے ان کی اطاعت کا جواز ثابت ہو۔ اس فضا میں اوراس ضرورت کو پورا کرنے فطرت کے تصور کا ایك نیا استعمال کیا گیا۔ ھابس نے ایك حالت فطری (State of Nature) فرض کیا جس میں ہر شخص دوسرے کے ساتھہ مصروف پیکار تھا۔ اس جنگ و جدل کے ختم کرنے انہوں نے اپنے سارے قدرتی حقوق ایك شخص کے سپرد کردئے جسکی اطاعت اسی قانون قدرت

کی وجه سے واجب هوگئی۔ بر خلاف هابس کے لاك نے بھی ایك حالت فطری کو فرض کیا لیکن باهمی جنگ و پیکار نهیں تھی۔ گو ایك شخص کو اختیارات دئے گئے لیکن بغاوت کا حق باقی رکھا گیا۔ اس طرح پر قانون قدرت لاك کے نزدیك آزادی کا حلیف هوا۔ اور سنه ۱۷۷۶ع کے امریکه کے اعلان آزادی میں قانون قدرت فطری حق کے نام سے بصور استناد پکارا گیا۔ اسی اثنا میں روسو نے بھی اپنے ,, معاهده معاشری ،، کے نظریوں کے ذریعه فطرت اور قانون قدرت کے نئے نئے استعمال کو هر دلعزیز بنا تا رها جو بهت جلد سنه ۱۷۸۹ع میں فرینچ کنونشن کے ذریعه ,, اعلان حقوق انسان ،، کے نام سے دنیا کے قانون کو کھڑ کھڑا دیا۔

اس طرح پر اب قانون قدرت ایك نئی اور متحراك سیاسی قوت هوگیا۔ اورگو آزادی ۔ مساوات اور اخوت کے تصور پہلے بھی یعنے یونانی اور رومنی قانون قدرت کے تصور میں شامل تھے لیکن خاموش اور سکون کی حالت میں تھے۔ اس دور میں زیادہ تر سیاسی حالات کی وجه سے یه سکون ختم هوگیا اور ان نعروں کے تحت قانون قدرت ایك محرك سیاسی قوت هوگیا۔

مذکورۂ بالا خصوص کے علاوه تین اور خصوص میں دور جدید میں قانون قدرت کے اثرات پائے جاتے هیں۔ (۱) انگریزی قانون میں نصفت کا تصور اس قانون قدرت کے تصور کا رهین منت هے۔ اور نیز انگریزی قانون میں قانون قدرت سے استناد بھی جا بجا پایا جاتا هے۔ چنانچه بلوائن جو ایڈ ورڈ چهارم کے زمانه میں گذرے هیں کہتے هیں که نظائر اور احکام کی عدم موجودگی میں ججوں کو قانون کی پابندی کرنی چاهئے۔ کیونکه یه قانون تمام قوانین کی اساس هے ۔ بلاکسٹن نے یہاں تك کہدیا هے که قانون قدرت تمام کرۂ ارض پر قابل پابندی هے اور کوئی قانون جو اسکے خلاف هو قانون هی نهیں۔ اور بلاکسٹن معاهدات معنوی کو جو لارڈ ماسفیلڈ نے جائز رکھا اسی قانون قدرت پر عمل کرنیکی

مطابقت کی وجہ بتاتے ھیں۔ انگریزی قانون میں قانون قدرت پر مبنی قوانین کی چند دوسری مثالیں Writ of mandamus ، انگریزی مرکنٹایل لا، اور قانون ٹارٹس میں معقول آدمی کا معیار احتیاط ھیں. باوجود اتنے اثر کے یہ یاد رکھنا چاھئے کہ انگریزی قانون زیادہ تر تجربہ سے بنا ھے اور تجربہ پر مبنی ھے۔ مجرد اصولوں کا اس پر نسبتاً کم رھا ھے۔ نظائر اور احکام کی موجودگی میں مجرد اصولوں پر عمل کم ھوتا تھا۔

۲ قانون بین الاقوام کے اساتذہ مثلاً گروشیس۔ جنٹی لس۔ ایبنیز ، اور پوفن ڈرف نے قانون قدرت ھی کو اس قانون کا سنگ بنیاد بنایا ۔ کیونکہ قانون قدرت جب بنی نوع انسان کا مشترك قانون ھوا تو اس پر مملکتوں کے درمیان بھی عمل ھونا چاھئے غرض اس قانون کے بہت سے اصول رومن Jus gentium سے لئے گئے اسی لئے پہلے پہل اس کا نام بھی Jus gentium رکھا گیا۔ جہاں Jus gentium سے مراد اجانب یا اجنبی قبائل میں مشترك قانون نہیں تھی ۔ بلکہ مختلف مملکتوں کے درمیانی تعلقات کو منضبط کرنیوالا قانون۔ اور حال حال ھی میں قانون بین الاقوام کا نام اس قانون کو دیا گیا۔

۳ آجکل جرمنی فرانس اور اطالیہ میں قانون قدرت سے مراد قانونی تصورات اور عام قانونی نظریوں کی ما بعد الطبعیاتی اساس سمجھی جارھی ھے۔ ان ممالك کے اساتذہ نے جن کو جیسا کہ ھم دیکھ چکے ھیں مابعد الطبعیاتی اسکول کے اساتذہ کہتے ھیں ، اور جن کے علم اصول قانون کا طریق کار ما بعد الطبعیاتی ھے اس اصول پر عمل کرکے تمام انسانوں کی ساخت ایك ھی ھے ، ان کے تمام افعال عقل سے (اور اسی لئے انصاف) سے منضبط ھوتے ھیں ، قانون کا ایك نظریہ بنایا ھے جسمیں تمام قوانین کی اساس کو مجرد عقل ٹھیرایا ھے ۔ کانٹ کی تصانیف میں یہ نظریہ منتھیٰ کو پہنچا ھے اس میں واقعی قوانین کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی ھے ۔ اور اسی لئے یہ نظریہ قانون موجودہ حقیقتوں سے دور ھوگیا ھے ۔

آخر میں ہمکو اچھی طرح ذہن نشیں کرلینا چاہئے کہ مجرد عقل انسانی یا فطرت انسان پر مبنی حق و انصاف کے مجرد تصورات اور اسی لئے قانون قدرت کسی بھی مجموعہ قانون کی اساس نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ بقول (Spinozo) ,, عقل پارہ کا ایک ایسا صندوق ہے جس پر کوئی کھڑے نہیں ہوسکتا ،،۔ مثلاً دیکھئے کہ ازواج ہی کے متعلق کوئی قانون محض عقل یا فطرت پر مبنی نہیں ہوسکتا مثلاً کہئے کہ عقل پر مبنی قانون کی رو سے تعدد ازدواج اچھا ہے یا صرف ایک بیوی سے مذہبی نکاح کرنا یا صرف ایک بیوی سے معاہدہ کی رو سے نکاح کرنا ، یا ہر شخص کا اپنے لئے نر اور مادہ کا آزادی کیساتھ انتخاب کرکے اس وقت تک اسکے ساتھ رہنا جب تک کہ جی چاہے۔ یا موزوں نر اور مادے کا انتخاب سرکاری عہدہ داروں کے ذریعہ ہونا ؟ اسی طرح جرائم کی سزا کو لیجئے کہ محض عقل پر مبنی قانون کی رو سے سزا کس بنیاد پر دی جانی چاہئے کیا جرائم کو دبانے کیلئے اور اسی لئے قطع ید وغیرہ ہونا چاہئے جیسا کہ افلاطون کہتا ہے۔؟ کیا تعلیم کیلئے؟ (ارسطو) کیا بقول بنتھم ڈرانے کیلئے ؟ یا کیا بقول کانٹ محض اخلاقی کفارہ کیلئے ؟ یا بقول (Lonbross) اور امریکہ کے بعض اساتذہ کے مجرموں کو سزا دینی ہی نہیں چاہئے بلکہ انکے علاج کیلئے انہیں دواخانہ بھیجنا چاہئے۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ عقلوں میں کیسا اختلاف ہوسکتا ہے۔ اور یہ کہ مجرد عقل پر کسی قانون کو مبنی کرنا کتنا دشوار ہے اور نیز یہ بھی کہ محض قانون قدرت ہی کسی قوانین کی اساس نہیں ہوسکتا کیونکہ اسکی تعریف ہی یہی ہے کہ وہ عقل انسانی کا بتایا یا سکھا یا ہوا عالمی مطلق یا اخلاقی قانون ہے۔

مگر قانون قدرت کے تصور کو بے سود اور لغو سمجھنا بھی غلطی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ قوانین کی بھی مثل انسانوں اور قوموں کے عمر ہوتی ہے۔ نہ صرف اسکے منفرد قواعد اور نظریہ پرانے اور دور از کار ہوجاتے ہیں بلکہ وہ قومی اور تاریخی حالات جن میں کسی قوانین کا نشو نما ہوتا ہے کلیۃً بدل جاتے ہیں ۔ اسی وجہ سے بسا اوقات کل نظام

قانون کا بدلنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان انسانی وضع کردہ قوانین سے حالات کے بدل جانیکی وجہ سے انصاف نہیں ظلم ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ مثلاً اٹھا ئیسویں صدی کے آخر میں فرانس میں ہوا۔ ایسے زمانوں میں قوموں کو حقیقی موجودہ قوانین سے بد ظنی ہوکر ایڈیل قوانین کی تلاش ہوتی ہے اسوقت قانون کا یہ تصور کہ قانون ایک عالمی مطلق اور اخلاقی قانون کا مظہر ہے کام آتا ہے ۔ باالفاظ دیگر قانون قدرت ایک قیصر سے دوسرے قیصر کو اپیل کرنیکا مفید اور ضروری کام دیتا ہے ۔ گو آجکل جماعات مقننہ کے ذریعہ قانون میں اکثر ترمیمیں ہوجاتی ہیں ۔ مگر پھر بھی کون کہ سکتا ہے کہ یہ تصور جو ماضی میں اتنا کام آیا ہے اور جس کے ذریعہ مذکورۂ بالا ضروری کام انجام پاسکتا ہے بلکہ بے ضروری اور لغو ہوگیا ہے ؟

خلاصہ یہ ہوا کہ قانون کا یہ تصور کہ وہ ایک مطلق عالمی اور اخلاقی اصول کا مظہر ہے مابعد الطبعیاتی نقطۂ نظر سے ٹھیک ہے ۔ لیکن قانونی نقطہ نظر سے گو بے سود نہیں لیکن چنداں مفید اور صحیح بھی نہیں ۔ وہ کسی صحیح نظریہ قانون میں کسی مجموعہ قوانین کی اساس نہیں بن سکتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر وہ تجربہ سے موجودہ حقیقی قوانین کے تجربہ سے دور ہے ۔ بلا شبہ روما کا قانون اجانب (J. G.) ایسے قوانین کے تجربہ پر مبنی تھا لیکن اب جب کہ زمین کی طنابیں کٹ گئی ہیں اور کل روئے زمین کے قوانین کے تجربہ کی تحصیل ہوسکتی ہے اور رومنی دنیا کے مقابلہ کرتے آج کل دنیا کے حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ کایا پلٹ ہوگئی ہے ، ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ جن عام اصولوں پر یہ قانون اجانب مشمول تھا اب بھی کلیۃً صحیح ہیں ۔ مزید متقابلہ تحصیل ضروری ہے ۔ ایسی متقابلہ تحصیل آجکل جرمنی اور فرانس میں بڑے پیمانوں پر جاری ہے ۔ اسکی تکمیل کے بعد ہمیں علم اصول قانون کے عام اصولوں کے لئے موجودہ واقعی قوانین کے تجربوں پر مبنی اب سے زیادہ اچھا مواد مل جائیگا ۔ لیکن پھر بھی اگر ہم

قانون کی یہ تعریف کریں کے کہ وہ مطلق عالمی اور اسی لئے اخلاق آصول کا مظہر ہے تو یہ تعریف یك رخی ہوگی۔ کیونکہ ماحول اور قومی ضروریات کے اختلاف کی وجہ سے تفصیلات اور جزئیات میں فرق ہوگا اور پھر ہمیں یہ حقیقت نہیں فراموش کرنی چاہئیے کہ دنیا کی کوئی حکومت اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی پر کسی دوسرے آصول کی پابندی کو چاہے وہ مطلق اور عالمی اور اخلاق کیوں نہو ترجیح دیگی۔ بالفاظ دیگر جب تك ان مطلق عالمی اور اخلاق اصولوں کے پیچھے حکومت کی قوت نافذہ نہ ہو وہ صحیح معنی میں قانون نہیں بن سکتے۔ آجکل جب کہ ہمارے قوانین نسبتہ زیادہ ترقی یافتہ ہیں، ججوں کی قانون قدرت کے استناد کے ذریعہ خود اختیاری رایوں کو روکنے میں حکومت زیادہ صحیح ہے کیونکہ وگرنہ قوانین کی Certainty جاتی رہتی ہے ۔

*

غم

از

جوش ملیح آبادی

رخ پہ ڈالے ہوئے سیاہ نقاب

غم نے آکر کیا یہ مجھ سے خطاب

مجھ کو بھیجا ہے لالہ زاروں نے

تیری گذری ہوی بہاروں نے

شمعیں ماضی کی خوابگاہوں کی

تجھ سے طالب ہیں سرد آہوں کی

خواب پیشیں نے تیرے دی ہے یہ رائے

اب نہ تیری پلک جھپکنے پائے

اس تبسم میں تھا جو وجہ نمو

تجھ سے مانگے ہیں خون کے آنسو

جوش سن کر یہ داستان ستم

میں یہ کہتا ہوا بڑھا سوئے غم

اہل دل جز تیرے کسے چاہیں

آکے گردن میں ڈالدوں باہیں

جب ملا غم کو یہ لطیف جواب

مسکرانے لگا الٹ کے نقاب

عکاسی

از

جناب محمود علی صاحب متعلم سال دوم (حیاتیات)

عکسالہ کی تشریح

یہ آلہ ایک قائمہ دار صندوق پر مشتمل ہے جسکے دو مقابل کے پہلو انتصابی اوراستوار ہوتے ہیں۔ ان پہلؤوں کے درمیانی فاصلہ کو کم وبیش کرنے کے لئے دوسرے دو پہلو چمڑے کے بنائے جاتے ہیں۔ اور پیچوں کے ذریعہ ایسا انتظام کردیا گیا ہے کہ آن کو حسب ضرورت گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ عکسالہ کی اندرونی سطح کامل طور پر سیاہ ہوتی ہے۔
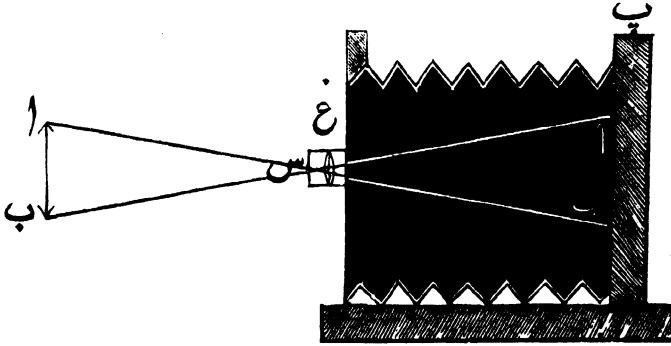
اسکے ایک استوار پہلو کے وسط میں ایک آستوانہ نما نلی لگی ہوتی ہے۔ جسکے وسط میں ایک سوراخ س ہوتا ہے۔ اسپر ایک ٹوپی ہوتی ہے جسکو بوقت ضرورت سوراخ پر سے علحدہ کرسکتے ہیں اسے "lens cap" کہتے ہیں۔ اس استوانہ نما نلی کے اختتام پر ایک محدب الطرفین عدسہ لگا رہتا ہے اور اسکے مقابل عکسالہ کے دوسرے پہلو پر اندھے شیشہ کا نیم شفاف پردہ پ لگا رہتا ہے۔ اسے Focussing screen کہتے ہیں عکس لیتے وقت اسے جدا کرلیتے ہیں اور اسکی جگہ عکاسی کی تختی رکھدیتے ہیں۔

عکسا له کسی شخص الف ـ ب کے سامنے اسطرح رکھا جا تا ھے کہ جب اسکی شعائیں عدسے میں سے گزریں تو عدسہ کے پیچھے اس شخص کا حقیقی معکوس خیال بن جائے ۔ عکسا له کا حصہ جو پردہ پ کے بعد ھوتا ھے کھل سکتا ھے اور یہاں سے عکاس (Photographer) شخص کے معکوس خیال کو پردہ پ پر دیکھ سکتا ھے اور اسطرح اندازہ لگاتا ھے کہ آیا عکس ٹھیک آیا یا نہیں اور یہ کہ کسی طرف مدھم تو نہیں ھے ۔ ان تمام آمور کا لحاظ کرتے پردہ پ کو پیچوں کے ذریعہ اسطرح حرکت دیتا ھے کہ اسکا محل خیال کے محل پر پہنچ جائے اور اسپر خیال بوضاحت نظر آنے لگے ۔ اب عکاس Focussing screen کو جدا کرلیتا ھے اور اسکی جگہ Dark slide جو عکسا له میں ھوتی ھے خود بخود پھسل کر آجاتی ھے ۔ اس میں ایك یا دو عکاسی کے حساس تختیاں ھوتی ھیں جو ایك پتلی پرت کے اٹھانے پر جو آنکے سامنے ھوتا ھے خیال کے محل پر آجاتی ھیں ۔ اب lens cap کو سوراخ پر سے ھٹاتے ھیں اور ایك معین وقفہ کے بعد پھر بند کردیتے ھیں ۔ اسطرح تختی کے شعاعوں کے زیر اثر رھنے کے بعد اسپر خیال کی تصویر بنجاتی ھے جس سے پھر سیدھی اور مستقل تصویر بنا لیتے ھیں ۔

عدسے | عدسہ کو ھم یوں تصور کرسکتے ھیں کہ وہ گویا منشور کے ٹکڑوں کا اجتماع ھے جو ایکدوسرے کیساتھ جوڑکر رکھدئے گئے ھیں اور اب چونکہ شعاع ھوا سے شیشہ میں یعنی لطیف واسطہ سے کثیف واسطہ میں داخل ھورھی ھے اسلئے ھر منشور کے اندر اسکی یہ کیفیت ھوگی کہ اپنا اصلی راستہ چھوڑکر نقطۂ وقوع سے کھنچے ھوئے فصل پر کے عمود کی طرف مڑجائیگی ،،
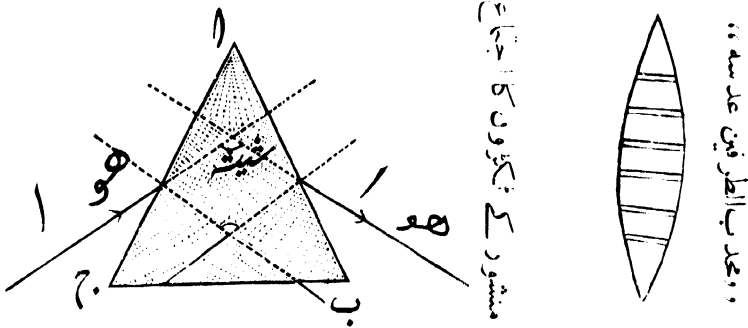
پھر جب منشور سے خارج ہوگی تو آسکا داخلہ کثیف واسطہ سے لطیف واسطہ میں ہوگا ایسی صورتوں میں شعاع سطح فصل پر کے عمود سے پرے ہٹ جائیگی اگر عدسہ پتلا ہو تو آسکی ساخت میں جو مفروضہ منشور ہیں آن میں سے ہر ایک کا انعطاف انگیز زاویہ اپنے فصل محور کا متناسب ہوگا اسلئے ان تمام شعاعوں کا عدسے میں سے گزر کر ایک نقطہ کی طرف رجوع کرنا ایک امر مستلزم ہے۔ بعض شعاعوں کا راستہ حسب ذیل ہوگا

(۱) وہ شعاعیں جو عدسہ کے مرکز میں سے گزرتی ہیں آنکی سمت حرکت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

(۲) وہ شعاعیں جو عدسہ کی سطح سے محور اصلی کے متوازی ٹکراتی ہیں وہ اسطرح منعطف ہوجاتی ہیں کہ سب کی سب عدسہ کے ماسکۂ اصلی میں سے گزرتی ہیں۔

(۳) وہ شعاعیں جو عدسہ کے ماسکۂ اصلی میں سے گزرکر عدسہ کی سطح سے ٹکراتی ہیں وہ سب انعطاف کے بعد محور اصلی کے متوازی ہوجاتی ہیں۔
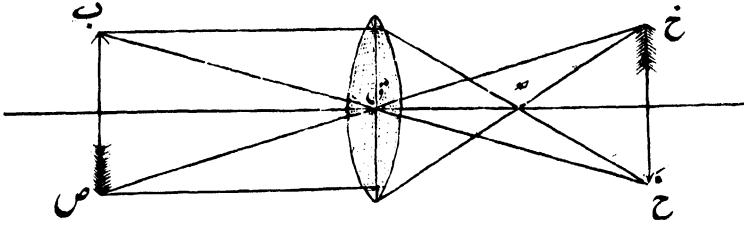
شکل میں ص-ب ایک منور شخص عدسہ کے محور اصلی پر ماسکۂ اصلی سے پرے رکھا ہے۔ شعاعوں کے راستوں کی جو تعین ہوئی تھی اس سے ظاہر ہے کہ ب کا خیال خ پر ہوگا۔ اسیطرح ص کا خیال خ پر ہوگا۔ پھر شکل سے ظاہر ہیکہ خیال حقیقی اور معکوس ہے اور عکاسی کی تختی میں اسی بناء پر خیال معکوس آتا ہے اور شخص کی ہر طرح ضد ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ حصے جو شخص میں سفید ہوتے ہیں سیاہ نظر آتے ہیں ور سیاہ سفید ، سایہ دار حصہ روشن نظر آتا ہے اور روشن احصہ سایہ دار۔ لیکن یہ خیال exposure -کے بعد محسوس نہیں ہوتا بلکہ Development کے بعد نظر آتا ہے

عکسالہ میں منظر کے موقع ومحل کا لحاظ کرتے مختلف قسم کے عدسہ ستعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند کا حال درج ذیل ہے۔

(۱) Single lens :- یہ ایکطرف محدب ہوتا ہے اور دوسری طرف مسطح۔ اسکا قطر اسکے طول ماسکہ کا ۱/۱۰ ہوتا ہے اور یہ تین ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۱)۔

(۲) Rapid symmetrical lens اسمیں دو عدسے اسطرح مرتب ہوتے ہیں کہ انکی مقعر سطحیں بالمقابل ہوتی ہیں۔ انکا قطر اپنے فعل ماسکہ کا ۱/۸ ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ج)

(۳) Wide angle rectilinear and wide angle symmetrical lens اسکا قطر طول ماسکہ کا ۱/۱۸ ہوتا ہے اور یہ بالخصوص اسوقت کام آتا ہے جبکہ عکاس قریب کے شخص کا عکس لینا چاہتا ہے اور دور نہیں جا سکتا -

(۴) Portrait lens :- اسکا قطر فعل ماسکہ کا ۱/۴ ہوتا ہے - اسمیں ٹکڑا ب (ملاحظہ ہو شکل نمبر ب)
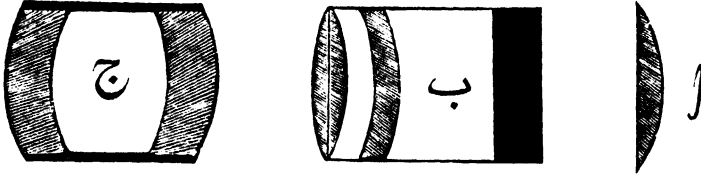
کچھ زیادہ کار آمد نہیں ہوتا - اگر چاہیں تو اسے جدا بھی کر سکتے ہیں -

(۵) Group lens :- اسکا قطر فعل ماسکہ کا ۱/۲ ہوتا ہے اور اسکی ساخت portrait lens کی سی ہوتی ہے -

ان مختلف عدسوں کے استعمال سے یہ بھی لازم ہوجاتا ہے کہ ٹوپی (lens cap) کو عدسوں پر سے مختلف اور معین اوقات کے لئے اٹھایا جائے - یہ امر مثالوں سے بخوبی واضح ہوجائیگا -

اوقات جو عکس لینے کے لئے درکار ہوتے ہیں وہ عدسوں کے قطر اور فعل ماسکہ کے باہمی تناسب پر منحصر ہوتے ہیں مثلاً فرض کیا کہ ایک عدسہ کا قطر فعل ماسکہ کا ۱/۸ ہے اور دوسرے کا اسکے اپنے فعل ماسکہ کا ۱/۱۰ تو مطاوبہ اوقات ان کسروں کے نسب نماؤں کے مربعوں کے متناسب ہونگے چنانچہ ان میں ۶۴ اور ۱۰۰ کا تناسب ہوگا - یہ امر بھی قابل یادداشت ہے کہ مطلوبہ وقت بہ حکم عمومی ثانیہ کی کسر ہوتا ہے

طریقئہ عمل

یہ عمل فی الحقیقت چار مرحلوں پر منحصر ہے

(۱) تختی کی تیاری (۲) Exposure (۳) Development (۴) Fixing

(۱) تختی کی تیاری :— پہلے جو عکاسی کی تختیاں بنائی جاتی تھیں وہ تانبے یا کاغذ کی چھوٹی سی تختیاں ہوتی تھیں جن پر چاندی کا ایک موٹا سا ورق چڑھا دیا جاتا تھا پھر جب ان پر سے آئیوڈین کے بخارات گزارے جاتے تھے تو سلور آئیوڈائڈ A gi بن جاتا تھا اور اسطرح تختی حساس ہو جاتی تھی بعد ازاں۔ سنہ ۱۸۵۰ ع میں Scott Archer نے Wet colloidon استعمال کرنے کی تجویز کی۔ کچھ عرصہ بعد Dry gelatin والا طریقہ استعمال ہونے لگا جو آجکل بھی مروج ہے اور مفصلہ ذیل ہے

اسکی تیاری میں gelatin کا لسونت جسمیں سلور نائیریٹ Ag No 3 اور کچھ زیادہ مقدار میں امونئم برومائد No 4 Br ملا کر تیار کرلیا جاتا ہے۔ اب لسونت کو یہانتک گرم کرتے ہیں کہ سلور برماوئد Ag Br کے رسوب کی چھوٹے چھوٹے دانوں میں ترتیب ہوجاتی ہے اس عمل کو Ripening کہتے ہیں۔ اسکے ٹھوس ہونے کے بعد کاٹتے ہیں اور امونئم برومائڈ کو دھو کر جدا کردیتے ہیں۔ اب لسونت کو celliloid کی تختیوں پر لگا دیتے ہیں۔ Nhy Br کی زیادتی اور ripening دونوں اس عمل کو تیز کردیتے ہیں

(۲) Exposure :— عکاسی میں اس اصطلاح سے مراد وہ وقفہ ہے جسمیں ضیاء آفتاب کو عکاسی کی تختی پر عمل کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے یہ عدسوں کی ساخت پر منحصر ہے اور اسکا انحصار شخص کے محل اور عکسالہ کے مقام پر بھی ہے۔ مندرجہ ذیل جدول سے مختلف عدسوں کے لئے مختلف مقامات پر مطاوبہ وقت کا اندازہ بآسانی ہوسکیگا

عدسوں کے قطر اور فصل ماسکہ کا باہمی تناسب	سمندر اور آسمانی فضاء	کھلا ہوا میدان یا قدرتی سیر گاہ	درختوں کے سایہ میں	جبکہ اندرونی حصہ روشن ہو	معمولی کمروں میں
۲/۱	۲۴۰/۱ ثانیہ	۲۵۶/۱ ثانیہ	۲۰۵ ثانیہ	۳۰ ثانیہ	۰۷۵ ثانیہ
۴/۱	۲۲/۱ ،،	۱۲۸/۱ ،،	۵ ،،	۱ دقیقہ	۵ ۱۰ ثانیہ
۸/۱	۴۰/۱ ،،	۱۶/۱ ،،	۴۰ ،،	۸ دقیقہ	۱۲ ثانیہ
۲۲۰۶۲۷/۱	۵/۱ ،،	۲/۱ ،،	۵ دقیقہ ۲۰ ثانیہ	۱ ساعت ۴ دقیقہ	۱ دقیقہ ۳۶ ثانیہ
۳۲/۱	۵/۶ ،،	۱ ،،	۱۰ دقیقہ ۴ ثانیہ	۲ ساعت ۸ دقیقہ	۳ دقیقہ ۱۲ ثانیہ
۴۴۰۲۵۵/۱	۵/۴ ،،	۲ ،،	۲۱ دقیقہ	۲ ساعت ۱۶ دقیقہ	۶ دقیقہ ۲۴ ثانیہ

بعض عکسالوں میں مذکورہ وقت کے اندازہ کے لئے عکس پیما یا (photometer) لگا ہوتا ھے - ایسے عکسالے مبتدیوں کے لئے بیحد مفید ہوتے ھیں لیکن تجربہ اور مشق کے بعد جو کام عکس و سما سے متعلق ھے آسے عکاس خود بخوبی انجام دیسکتا ھے

کیمیائی نقطۂ نظر سے یہ عمل محولانہ عاملوں کے ذریعہ سلور برومائیڈ Ag Br کو دھاتی چاندی میں تحویل کرنا ھے - تختی پر کا پورا اونجن (halide) قابل تحویل ھے - وہ حصص جن تک نور پہنچتا ھے پہلے متاثر ہوتے ھیں اور یہ تاثر ضیاء کی حدت کا متناسب ہوتا ھے - جب متاثرہ حصص پر کافی ،، تفاد ،، پیدا ہوجاتا ھے تو ضیاء ہٹالی جاتی ھے

(ج) Development :— اسے سنہ ۱۸۳۷ ء میں Talbot نے اور جو سچ پوچھو تو ،، بلی ،، نے دریافت کیا - کیونکہ آسنے Nut galls کے extract جو چند Halfexposed کاغذوں پر جنپر سوڈیم کلورائیڈ پڑا ہوا تھا اوندھا دیا - یہ عمل

اس امر پر منحصر ھے کہ کوئی اتنی کمزور عاملیت کا محولا نہ عامل استعمال کیا جائے ضیاء سے غیر متاثرہ حصوں پر اسکا اثر عملاً صفر ھو

یہ عمل Darkroom یا تاریک کمرہ میں کرنا چاھئے باھر ضیاء کے عمل سے مزید ملورہر ومائڈ تحلیل ھو جائیگا جو خیال کو غیر ممتاز کردیگا - چھوٹی طول موج کی شعاعوں (نیلی اور بنفشئی) کا عمل چاندی کے لونجوں پر سب سے زیادہ ھوتا ھے برابر برابر تاثیر کے لئے وقت جو مختلف الالون شعاعوں کے لئے درکار ھے ثانیوں میں حسب ذیل ھے

بنفشئی	=	۱۵	ثانیہ
سبز	=	۳۷	"
نیلا	=	۲۹	"
زرد	=	۳۳۰	"
سرخ	=	۶۰۰	"

بناء برین Dark Room یا تاریک کمرہ میں ایسے لمپ سے کام لیا جاتا ھے جس سے سرخ روشنی حاصل ھوتی ھو

Exposure کے بعد جب تختی پر معکوس خیال بنجاتا ھے تو اسے با احتیاط تاریک کمرہ مین لاکر Develop کرتے ھیں - اسکا طریقہ یہ ھے کہ تختی پر پہلے Developer اسطرح ڈالتے ھیں کہ آبال نہ پیدا ھو - ۵ سے ۲۰ ثانیوں کے عرصہ میں خیال جہاں سفید تھا سیاہ ھوجاتا ھے اور سیاہ حصے سفید پڑ جاتے ھیں اور نیم شفاف حصے حسب حال بر قرار رھتے ھین - اب اسے کشید کئے ھوئے پانی سے دھو کر پہلے پھٹکڑی کے محلول میں ڈالتے ھیں اور پھر ۵ یا ۶ دقیقوں کے بعد پانی سے دھو

کر Fixing solution میں ڈال دیتے ہیں۔ اس عمل سے تختی کے پشت کی سیاہی دور ہو جاتی ہے۔ اب اسے ضیاء سے کوئی ہرج نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تختی اب Negative کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اب اسے بخوبی دھو کر سکھا لیا جاتا ہے

Developing Solutions :— مختلف ممالک میں مختلف اغراض کے مدنظر حسب ذیل developers استعمال کئے جاتے ہیں

Pyrogallol کا قلوی محلول

(الف) اسکا ملک انگلستان میں زیادہ رواج ہے اور اسکے استعمال سے exposure کے خرابیونکی چارہ جوئی آسانی سے ہوسکتی ہے

Developer نمبر ۱

محلول نمبر ۱ :—

پائیروگیلک ترشہ	ایک اونس
امونئم بروما ئٹڈ	۶۰۰ گرین
نائٹرک ترشہ	۲۰ قطرے
پانی	۶ اونس

محاول نمبر ۲ :—

امونیا کا مرتکز محاول (کثافت اضافی ۸۸۰ء)	۳ ڈرام
پانی	ایک پائنٹ

محلول نمبر ۳

محلول نمبر ۱	ایک اونس
پانی	۱۹ اونس

اسکی تیاری میں پہلے نائٹرک ترشہ کو ھلکا یا جاتا ھے پھر پائیرو گیلک ترشہ اور
امونیم بروما ئڈ ملاے جاتے ھیں بعد ازیں تینوں محلول ملادے جاتے ھیں

Developer نمبر ۲ فیرس آگزیلیٹ

اسکی تیاری میں آئرن پلروٹوسلفیٹ کے ایک پونڈ کو ہم وزن پانی میں حل کرتے میں بعد ازاین ایک پونڈ

پوٹاسیم آگزیلیٹ کو بھی پہلے کی طرح ایک پونڈ پانی میں حل کرتے ھیں۔ پھر
آئرن پروٹوسلفیٹ کا آبی محلول وزنا ۲ اونس پوٹاسیم آگزیلیٹ کے محاول کے ۲/۱ ۱۱ اونس
میں ملادیتے ھیں، آمیزہ سرخ مرجانی رنگ کا ھوتا ھے۔ زان بعد امونیم بروما ئڈ کی
ایک اونس قلموں کو ۹ اونس پانی میں حل کر کے تیار شدہ آمیزہ میں ڈال دیتے
ھیں اسمیں فائدہ یہ ھے کہ ھاتھوں پر دھبے نہیں آتے۔ اس کو فیرس آگزیلیٹ
Developer کہتے ھیں

Developer نمبر ۳

جب عکاسی کی تختی gelatin کی ھوتی ھے تو ایسے نمبر ۱
Developer سے دھونے میں اسکی سطح پر بھورا یا زردی مائل رنگ باقی رھجاتا ھے
یہ اس developer کے استعمال سے دور ھوجاتا ھے۔ اس سے گو development
آھستہ آھستہ ھوتا ھے لیکن Negative نہایت نفیس سیاہ رنگ کا ھوتا ھے

محلول نمبر ۱

پائیرو گیلک ترشہ	ایک اونس
امونیم بروما ئڈ	۶۰۰ گرین
سوڈیم سلفائٹ	۴ اونس
سٹیرک ترشہ	۶۰ گرین
پانی	۱۲ اونس

محلول نمبر ۲

امونیا کا مرتکز محلول (کثافت اضافی ۸۸ء)	۳ ڈرام
پانی	ایک پائنٹ

محلول نمبر ۲

محلول نمبر ۱	۲ اونس
پانی	۲۸ اونس

اسکی تیاری کے لئے سوڈئیم سلفائٹ کو ۸ اونس پانی میں حل کرتے ہیں پھر مزید پانی کی مقدار ملاکر سٹیرک ترشہ ملاتے ہیں پھر محلول کو پائیروگیلک ترشہ اور امونئیم برومائیڈ کیساتھ ملاکر اسکی مجموعی مقدار ۱۳ اونس کی بنالیتے ہیں پھر تینوں محلولوں کو ملادیتے ہیں

Developer نمبر ۴

جب exposure کم ہوتا ہے تو درج ذیل developer استعمال کیا جاتا ہے

محلول نمبر ۱

پائیروگیلک ترشہ	ایک اونس
نائٹرک ترشہ	۲۰ قطرے
پانی	۶ اونس

محلول نمبر ۲

سجی	۶ ڈرام
پانی	ایک پائنٹ

محلول نمبر ۳

محلول نمبر ۲	ایک اونس
پانی	۱۹ اونس

یا اس developer کو یوں بھی تیار کرتے ھیں

محلول نمبر ۱

پائرو گیلک ترشه	ایک اونس
امونئیم بروما ئڈ	۶۰۰ گرین
نائٹرک ترشه	۲۰ قطرے
پانی	۶ اونس

محلول نمبر ۲

کاسٹک پوٹاش	۳ ڈرام
پانی	ایک پائنٹ

محلول نمبر ۳

محلول نمبر ۱	ایک اونس
پانی	۱۹ اونس

یه معمولی محلول کے مطابق کام میں لائے جاتے ھیں

Developer نمبر ۵ | Hydroquinone.

محلول نمبر ۱

Hydroquinone.	۳/ ۲ اونس
نائٹرک ترشه	۲۰ قطرے
پانی	۶ اونس

محلول نمبر ۲

امونیا کا مرتکز محلول (کثافت اضافی ۸۸۰ ء)	۸۰ منم

پانی	ایک پائنٹ
محلول نمبر ۳	
محلول نمبر ۱	ایک اونس
پانی	۱۹ اونس
محلول نمبر ۴	
امونئم برومائڈ	ایک اونس
پانی	۱۰ اونس

جب exposure باضابطه هوتا هے تو محلول نمبر ۲ و نمبر ۳ معمولی developer کیساتهه استعمال کئے جاتے هیں لیکن جب exposure حد سے زیاده هوجاتا هے تو نمبر ۴ استعمال کیا جاتا هے لیکن اسوقت بهی چند قطرات کافی هوتے هیں -

انتباه ان تمام مذکورهٔ بالا احتیاطوں کے باوجود Negative میں چند خرابیاں رهجاتی هیں مثلاً:—

کبهی اسپر جهریاں یا جهالر کیطرح سلوٹیں نظر آتی هیں - اسکی وجه یه هے جب هلکا پانی استعمال کیا جاتا هے تو اس قسم کی جهریاں پڑ جاتی هیں - اسکے دفعیه کے لئے پانی چند گرین (میگنیسئم سلفیٹ) Mg So 40 7w20 ملا دیا جائے تو بهتر هے -

یا تختی پر کبهی کثیف اور شفاف داغ بهی پڑ جاتے هیں یه اگر بالکل مدور اور شفاف هوں تو سمجهه لینا چاهئے که developer میں بلبلے پڑ جانےکی وجه سے هے اسلئے عکاس کو چاهئے که آونٹ کے بالوں کا ایک برش تختی پر پهیر دیا کرے یا تختی پر بعض اوقات لکیریں پڑ جاتی هیں اور یه اسطرح هوتا هے که developer استعمال کرتے وقت جب تختی کا ایک حصه تو تر هوجاتا هے اور دوسرا خشک رهتا هے تو اس تر حصه کے دامن

پر خود بخود خط پڑ جاتا ھے اسلئے عکاس کو چاھئے developer کو بہ یک وقت پوری تختی پر ڈالے۔ جب تختی develop ھو جاتی ھے تو اسے پھٹکڑی کے محلول میں ڈالدیا جاتا ھے پھٹکڑی کے محلول کی تیاری کے لئے ۲ اونس پھٹکڑی کو گرم پانی کی ایک پائنٹ مقدار میں حل کرتے ھیں۔

Fixing اس عمل سے غیر متاثرہ سلور برومائڈ کو سوڈئم تھائیو سلفینٹ میں حل کر کے تختی پر سے جدا کرتے ھیں کیونکہ اگر تختی بغیر اس عمل کے بغیر ضیاء میں لائی جائیگی تو غیر متاثر سلور برومائڈ بھی تحلیل ھو جائیگا۔ اور اسطرح خیال خراب ھو جائیگا۔ اسے سب سے پہلے سنہ ۱۸۴۰ع میں Sir Johnson Hershell نےدریافت کیا اس محلول کی تیاری کے لئے ۵ اونس "Hypo" یا Hyposulphite of Soda یا Sodium thiosulphate کو ایک پائنٹ گرم پانی میں حل کرتے ھیں۔

Printing اس عمل سے عکس یا خیال پھر سیدھا ھو جاتا ھے۔ تختی کے اس رخ پر جسپر عکس ھو Printing paper رکھدیا جاتا ھے۔ پھر اسکو چوکھٹے میں کس کر خشك ھونے کے لئے چھوڑ دیتے ھیں۔ سوکھنے کے بعد اسے نکال لیتے ھیں اور یونہی جسقدر تصویریں درکار ھوتی ھیں چھاپ لیتے ھیں اب tonning کے ذریعہ اسکے رنگ کو واضح اور دیر پا کیا جاتا ھے Printing paper یا تو Velox کی قسم کے ھوتے ھیں جنکو Baekeland نے ایجاد کیا یا Albumenized ھوتے ھیں۔ Velox کی مثل کے کاغذ بالکل عکاسی کی تختیوں کی طرح ھوتے ھیں کیونکہ ان میں بھی حساس شئے سلور برومائڈ AgBr ھوتی ھے جو gelatin میں معلق رھتی ھے۔ اور انکو بھی آن تختیوں کی طرح develop, expose اور Fix کرتے ھیں Albumenized paper ھیں حساس شئے سلور کلورائڈ ھے جو انڈے کی

سفیدی (Albumen) میں تعلیق کی حالت میں ہوتی ہے اور اس سے چاندی گلابی رنگ میں لسوتی حالت میں آزاد ہوتی ہے

جب Printing paper پر عکس آجاتا ہے جو سیدھا ہوتا ہے تو پھر tonning کا عمل شروع ہوتا ہے۔

Tonning اس عمل میں سوڈیم کلورو آریٹ چاندی کیساتھ عمل کرتا ہے اور اسکی جگہہ سونے کی پتلی سی تہ جم جاتی ہے

Na Aucl 4 + 3 Ag – Nacl + 3 Agcl – Au
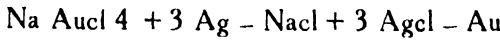
اس مطلب کے لئے مختلف Tonning Baths مستعمل ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں

(۱) Auric chloride	ایک اونس
پانی	۱۴ اونس
سوڈیم ایسٹیٹ	۲۰ گرین

یہ ارغوانی رنگ پیدا کرنے کے لئے بہت موزوں ہے

(۲) Auric chloride	ایک اونس
پانی	۱۴ اونس
سوڈیم پانی کاربونیٹ	۳ گرین

یہ نیز بھورا رنگ حاصل کرنے کے لئے بہت مفید ہے

(۳) Platinum Bath :— یہ مثل Acetate Bath کے ہوتا ہے لیکن اسمیں بجائے Auric chloride کے Platinic chloride استعمال کیا جاتا ہے

طریقہ عمل Prints کو ایک تشت میں جسمیں صاف پانی رکھا ہوتا ہے

اسطرح اوپر تلے رکھتے ھیں کہ تصویر کے رخ نیچے ھوں۔ اسکے بعد انپر یکے بعد دیگرے
Tonning Solution ڈالتے ھیں۔ اسطرح لورن کرنے سے انکا رنگ بتدریج بدلتا جاتا ھے
اور سیپی کا سا ھونے لگتا ھے۔ اب یہ عکاس کے اختیار میں ھے انکا رنگ جہاں تک
ھوسکے tonning کے ذریعہ گہرا یا ھلکا رکھے۔ پندرہ سے بیس دقیقوں میں یہ عمل اختتام
کو پہنچ جاتا ھے اسکے بعد Fixing شروع ھوتی ھے ۔ اس مطلب کے لئے محاول اسطرح
تیار کیا جاتا ھے کہ 2½ اونس سوڈئم ھائپو سلفائٹ کو ایک پائنٹ پانی میں حل کرتے ھیں ،
tonning کے بعد prints کو اس fixing محاول میں ایک ربع ساعت تک پڑا رھنے دیتے ھیں
پھر اسے پانی سے بخوبی دھو لیتے ھیں اور اب نکالکر کسی صاف تولیہ سے خشک کر لیتے
ھیں ۔ اب ان prints کو عمدگی اور زیبائش سے کاٹ کر عام پسند اور مرغوب خاطر
بنا لیا جا سکتا ھے۔

نظم

از

جناب علی حسنین صاحب زیبا (جو کابینہ جدیدہ کی کرسی نشینی کے موقع پر پڑھی گئی تھی)

خدا ھی جانے سحر کیا بہار آب و گل میں ھے | نیا خیال ذھن میں نئی اُمنگ دل میں ھے

جمود حسن کا ابھی فنا ھوا خزاں کے ساتھ | سکوت نئے نواز بھی ھوا ھوا خزاں کے ساتھ

دل سکوں پسند آتھ کہ یہ عمل کا دور ھے | بہار سال نو ہے آج رنگ ھی کچھ اور ھے

بہار رفتہ کرکے یاد کچھ ھوا جو انفعال | ھوا جو بلبلوں کو بھی چمن کے حسن کا خیال

چمن تھا جسکی جاں اُسے چمن کی جاں بنا دیا | خود اپنے میں سے چن کے ایک باغباں بنا دیا

عجب ھی کیا بنادے گر اسی کو گلستان نیا | چمن وھی سہی مگر ملا ھے باغباں نیا

عجب ھی کیا جو باغباں چمن کی رت ھی پھیر دے | یہ بلبلوں کو حسن انتخاب کا صلہ ملے

ھوا بدل دے یوں چمن کی یہ ھوا بہار کی | گلوں پہ اسطرح اثر کرے ھوا بہار کی

یہ عارضی بہار ھی بہار جاوداں بنے | یہ موسمی شباب بھی شباب جاوداں بنے

گلوں کی عطر بیزیوں کا ھے چمن میں انحصار | چمن کے رنگ صحن میں ابھی ھے منحصر بہار

عجب ھی کیا بہار یہ چمن میں یوں مقیم ھو | جہاں جہاں نسیم ھے وھاں وھاں شمیم ھو

چمن کے بلبلوں کو عشق صرف گلستاں سے ھے | بدلدے یوں انہیں ھمیں امید باغباں سے ھے

فسانۂ وطن پڑھیں فسانۂ چمن کے ساتھ | ترانۂ وطن پڑھیں ترانہ چمن کے ساتھ

لفظ خلجی کی اصلیت

از

جناب سید سراج الدین احمد صاحب - متعلم ایم - اے آخری (تاریخ)

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ خلجی ترکی النسل نہیں ہیں (۱) - اگر وہ ترکی النسل ہوتے تو کیقباد کے عہد میں ترکی امرا جلال الدین خلجی کا ساتھ دیتے - جلال الدین کا نسبی تعلق ایسی نسل سے تھا جو ترکی نہیں تھی - اسی وجہ سے ترکوں پر اسے اعتماد نہ تھا اور نہ ترک اسے اپنی نسل سے سمجھتے تھے - چنانچہ انہوں نے اسی بناء پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے اپنی علحدہ جماعت بنا لی اور خلجیوں کا جو جلال الدین کے ساتھ تھے ممکنہ قوت کے ساتھ مقابلہ کیا -

خلجیوں کی نسبت یہ قصہ مشہور ہے کہ اغوث خاں نے بہت سے قبائل آباد کئے تھے - ایک دفعہ وہ فوج لیکر جا رہا تھا راستہ میں چند سپاہی پیچھے رہ گئے - ان میں سے ایک سپاہی کی بیوی کی زچگی ہوئی - جب یہ اغوث خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اغوث خاں نے دیری کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کیا - اس وقت سے وہ گاؤں جہاں زچگی ہوئی تھی خل اج (۲) کے نام سے مشہور ہوا ، اور اس بچہ کی اولاد خلجی کہلانے لگی جو پہاڑے سیستان اور غور کے قریب آباد ہوئے -

---

۱ - تاریخ فیروز شاہی مصنفۂ ضیاء الدین برنی صفحہ (۱۷۱) - آخری سطر - ,, و چون اصلی دیگر داشت نہ او را با ترکان استواری بود و نہ ترکان او را از بطانۂ خود میدانستند ،، الیٹ جلد سوم صفحہ (۱۳۴) سطر (۱۰)

۲ - خل - چھوڑنا اور اج - بھوکا -

فرشتہ نے لکھا ھے کہ تاریخ سلجوقیاں کے مصنف کے قول کے مطابق ترک بن یافث اور بعض تواریخ میں لکھا ھے کہ نوح کے فرزند یافث، کے گیارہ فرزند تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خاج تھا۔ اسی کی اولاد کو خاجی کہتے ھیں (۱)۔ فرشتہ کے نزدیک یہ قول اس لئے صحیح ھے کہ تواریخ غزنویہ میں لکھا ھوا ھیکہ سلطان ناصر الدین سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی غازی کے بہت سے امرا قوم خاج سے تھے۔ ان کا عہد چنگیز خان کے عہد سے پہلے کا ھے۔ لہذا قالج خان قوم خلج سے تھا اور بادشاہ جلال الدین فیروز شاہ دھلوی اور سلطان محمود مالوی (۲) اس کی اولاد سے ھیں۔ طبقات اکبری میں لکھا ھے کہ محمد خلجی مانڈوی اور جلال الدین خاجی، قالج خان کے پوتے تھے۔ قالج خان چنگیز خان کا داماد تھا۔

جب چنگیز خان کو عروج حاصل ھوا تو وہ التمش کے عہد میں ھندوستان آیا اور خوارزم شاہ کو سنہ ۱۲۲۴ھ میں شکشت دی۔ اسوقت قالج خان ملك غور اور گرجستان کے پہاڑی علاقوں میں آباد ھوے۔ قالج (۳) تھوڑے سے تغیر سے خالج ھوگیا اور عام استعمال سے خاج ھوگیا۔ بدایونی نے لکھا ھے کہ قلج اور قالج میں صرف لفظی تکرار ھے ورنہ دونوں ایك ھیں۔ قالج کا الف، قلج کے ق کے زبر کے بجائے استعمال کیا گیا ھے جو ترکی اصول تحریر ھے۔ اب ایرانیوں میں ق کے بجائے خ استعمال کیا جاتا ھے (۴)

۱۔ تاریخ فرشتہ مقالہ۔ دوم صفحہ (۸۸) سطر (۲۸)
۲۔ طبقات اکبری۔ محمد خاجی مانڈوی صفحہ (۵۷)
۳۔ طبقات اکبری صفحہ (۵۷)
۴۔ منتخب التواریخ مصنفۂ عبدالقادر بدایونی (مترجمۂ رینکنگ)

مورخ مولانا نظام الدین آحمد نے لکھا ھے کہ ایک معتبر تاریخ میں میری نظر سے گزرا کہ گروہ خلج، قالج خاں داماد چنگیز کی نسل سے ھے (۱) اور اسکا قصہ یہ ھے کہ قالج خاں اور اسکی بیوی میں جو چنگیز خاں کی بیٹی تھی رنجش پیدا ھوئی مگر چنگیز کے خوف کے باعث سوائے خاطر و مدارت کے کوئی چارہ نہ تھا لیکن قالج کو ھمیشہ رھائی پانیکی دھن سمائی تھی۔ جب چنگیز نے ساحل سندہ پہونچکر سلطان جلال الدین خوارزم کو مغلوب کیا اور ایران و توران کے مہمات سے فارغ ھوا تو وطن واپس ھوا۔ خالج خان اس زمانہ میں چنگیز کے ساتھ غور و کرجستان کے پہاڑون پر سے گزرتے وقت موروثی آبادی کے لئے موقع پاکر اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ جنکی تعداد تقریبا تیس ھزار تھی اس کوھستانی علاقہ میں آباد ھوا۔ جب چنگیز خان فوت ھوا تو اس کے بیٹون میں سے کسی نے اسکی پروانہ کی۔ یہان قالج کی نسل بہت پھیلی۔ جون جون سلاطین غور نے ھندوستان کو فتح کیا، خلجی وقتا فوقتا قربت کے باعث ھندوستان میں داخل ھوئے اور یہیں انہون نے ملازمت اختیار کی اور شہرت حاصل کی (۲)۔

خلجی ایک ترکی قبیلہ تھا جسکا نام ترکی میں کلک (۳) ھوگا۔ انکا چوتھی صدی عیسوی سے پتہ لگتا ھے۔ یہ لوگ بہ نسبت دوسرے ترکون کے بہت دور جنوب میں رھتے تھے۔ یہ مقام زمانہ حال کے لحاظ سے افغانستان کا جنوبی حصہ یعنے سیستان اور ھندوستان کے درمیان کا علاقہ ھے۔ زمانہ قدیم میں یہ لوگ یہان آکر آباد ھوئے تھے۔ یہ قبیلہ کس وقت ترکستان سے ترک وطن کر کے یہان آیا اسکا پتہ لگانا اب بلکل ناممکن ھے۔

۱۔ شہاب الدین حکیم کرمانی جونپوری نے اپنی کتاب طبقات محمد شاھی میں خلجی خاندان کی ابتدا چنگیز خان کے داماد قالج خان سے لکھی ھے۔

۲۔ در ایکہ از تواریخ معتبر .... صاحب اعتبار شدند طبقات اکبری صفحہ (۵۶) فرشتہ۔ مقالہ دوم صفحہ (۸۸)۔

۳۔ Kalac

اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مغربی افغانستان میں آکر آباد ہوئے، جہاں بہت عرصہ تک رہے جس کی وجہ سے یہ افغانی کہلانے لگے۔ انہوں نے دوسرے بادشاہوں کے تحت بحیثیت سپاہی کے بہت شہرت حاصل کی۔ لیکن خلجیوں کا تذکرہ سیاسی نقطہ نظر سے کبھی ایک خود مختار اور متحد قوم کے نہیں آیا۔ بہت زمانہ گزرنے کی وجہ سے ان کے نام میں تک بہت کچھ اختلاف ہو گیا۔

خلجیوں کے سردار، دوسرے ترکی محافظین کی طرح ہوتے تھے۔ انہوں نے غزنی اور غوری بادشاہوں کی ملازمتیں اختیار کیں اور خوب نام کمایا۔ یہی لوگ ہندوستان جاکر وہیں آباد ہو گئے جہاں انہیں اپنی خود مختار خاندانی حکومت قائم کرنے اور سیاسی قابلیت کے اظہار کے مواقع ملے۔ مثلاً بختیار خلجی نے بنگال میں حکومت قائم کی اور محمد نے مالوہ میں لیکن دہلی کے خاندان خلجی کو خاص اہمیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے زبردست سلطنت قائم کی۔ ہندوستان میں یہ بجائے خلجی کے خلجی کہلانے لگے۔ بہلول جس نے ہندوستان میں لودی خاندان کی بناء ڈالی اور (سنہ ۱۴۵۱ سے ۱۵۲۶ ع تک) دہلی میں حکومت کی، اسی خلجی قبیلہ سے تھا۔

موجودہ غلزی، ترکی خلجیوں ہی کی نسل سے ہیں۔ لیکن راورٹی نے اس خیال کی تھوڑی سی مخالفت کی ہے۔ غلزی بھی ترکی النسل ہیں اور یہ اسی قطعہ میں دکھائی دیتے ہیں جہاں خلجی آباد ہیں۔ ممکن ہے کہ افغانیوں نے اپنے غلط تلفظ کی بناء پر خلجی کے لفظ کو بگاڑ کر غلزی کر دیا ہو۔ اگر غلزی، خلجی نہوں تو ان کا پتہ لگانا دشوار ہے۔ ممکن ہے کہ غزا اور خلج اور دیگر قبائل سے ان کا تعلق ہو جو گیارھویں سے چودھویں صدی عیسوی تک کثرت سے افغانستان آئے اور غزنوی اور غوری بادشاہوں کے پاس بحیثیت جنگی سپاہیوں کے ملازمت کی۔ مخزن افغانیہ میں غلزیوں کی اصلیت اس قصہ

سے واضح کی گئی ھے کہ باٹن کی بیٹی ماٹو نے شاہ حسین سے ناجائز تعلقات پیدا کئے اور بعد ازاں اس سے شادی کرلی ۔ شاہ حسین، غور کا مفرور شہزادہ تھا ۔ ان سے جو لڑکا ھوا وہ غازی یعنے ،، فرزند چور ،، کہلانے لگا ۔ یہیں سے غازی نام کی ابتدا ھوئی (۱) ۔

ملا منہاج الدین (۲) ابو عمر عثمان نے لکھا ھے کہ خلج ایک ترکی قبیلہ ھے جو شمالی ترکستان سے بہت زمانہ قبل نکل گیا ۔ راورٹی نے اسکی وضاحت کے ساتھ یوں تشریح کی ھے کہ شاش ، ماؤرالنہر کی سرحد ، ندی ، اور شہر کا نام ھے ۔ یہ دریائے سیہون پر واقع ھے جو ترکون کی سرحد ھے ۔ یہ حصہ اب تاشقند کہلاتا ھے یہاں غز اور قاچ قبائل کے مسلمان آباد تھے ۔ یہی خلجی ترك افغانستان میں آباد ھونے کے بعد خلجی پٹھان کہلانے لگے ۔ سنہ ۶۲۳ ھ میں مغلوں کے مقابلہ کے لئے ایك خلجی جماعت خوارزمی فوج کے ساتھ شریك ھوگئی تھی جس نے سیستان کے ایك ضلع منصورہ پر قبضہ کرلیا ۔ اس جماعت کا سردار ملك خان خلجی تھا ۔ سندہ کے قریب قباچہ سے ملك خان نے مقابلہ کیا اور مارا گیا ۔ اس کے بعد خلجی فوراً التمش کی پناہ میں چلے گئے ۔ انکی مدد سے التمش نے قباچہ پر حملہ کیا اور اس کا خاتمہ کیا ۔

عربی اصول کے لحاظ سے خلجی کی جمع اخلاج ھے ۔ اس کے علاوہ یہ خلاج بھی کہلاتا ھے لیکن بہت کم ۔ چند مسلمان ھندوستانی مصنفین نے خلج اور خلجی بھی لکھا ۔ جن کی بہت سے یورپین مورخین نے اتباع کی ھے ۔ فرشتہ نے خلج لکھا ھے ۔ اور یورپینوں کے خیال کے مطابق خلج قبیلہ اور قبیلہ غلزی کے لوگ ایك نہیں ۔ بعضوں نے اس کی یوں تعریف کی ھے کہ خلج اسی نسل سے ھیں جس سے افغانی قبیلہ غلزی ھے ۔

---

۱ - ازانسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۔ دیکھو لفظ خلجی (Khaladj)
۲ - طبقات ناصری ۔ مترجمہ راورٹی ۔ صفحات ۔ ۲۸ - ۵۱۱ - ۵۳۹ - ۵۴۸ - ۵۵۰

چونکہ خلج ، غوری سلاطین کے عہد اور اس کے پیشتر سے موجود ہیں اور وہ خراسان کے اس حصہ میں بھی آباد تھے جو اب افغانستان کہلاتا ہے ۔ لہذا اسی بناء پر ان مورخین نے انہیں نہ صرف افغانی بتلایا ہے بلکہ اس سے بھی اور آگے بڑھکر انہوں نے خلج اور غلزی کو ایک کر دیا ۔ دراصل خلج ایک ترکی قبیلہ ہے جس کا شجرہ الاتراك ، جامع التواریخ اور ظفر نامہ کے مقدمہ میں تذکرہ ہے ۔ انکا ایک حصہ آکر گرم سیر میں بہت زمانہ قبل آباد ہوا تھا ۔ وہاں سے ان لوگوں نے هندوستان آکر سلطان معزالدین کی ملازمت اختیار کی ۔ اسی طرح بختیار غلام سمجھا جاتا ہے ، یہ غلام نہ تھا بلکہ خلج قبیلہ کا سردار تھا جو غور کے جنوب مغربی سرحد پر آباد تھا ۔ بختیار ، سلطان معزالدین کے عہد میں ملازمت کی تلاش کرتا ہوا غزنی آیا ۔ لیکن یہاں حسب خواہش ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے اس نے هندوستان کا رخ کیا اور لاہور پہونچا ۔ وہاں سے قطب الدین کی مخالفت پر مشرق کی طرف نکل گیا اور ملك المعظم حسام الدین آغل بك سے جا ملا ۔ ملك حسام الدین کے تحت دوآبہ کا کثیر حصہ اور دریائے گنگا کا مشرقی حصہ بھی تھا جہاں وہ قطب الدین کے اثر سے بالکل آزاد تھا ایک اور قول کے مطابق سلطان معزالدین نے ، اغل بك کو کول کا قلعہ اور اس کے تحت کے علاقے عنایت فرمائے تھے ۔ محمد بختیار نے ملك حسام الدین کی ملازمت اختیار کی اور چند مرتبہ هندوں کے مقابلہ میں اپنی مردانگی کے جوہر دکھائے جس کے صلہ میں ملك نے بختیار کو پتیتہ بحیثیت جاگیر کے دیا ۔ بختیار کی شہرت سنکر خلجی اطراف و اکناف سے اس کے پاس آپہونچے جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہوا اور انکی مدد سے اس نے بہار اور اودہ تك قبضہ کر لیا اور لکھنوتی کو اپنا مستقر قرار دیا ۔ بختیار کی اس بڑھتی قوت کی خبر پاکر قطب الدین ایبك نے اسے قیمتی لباس مرحمت فرمایا ۔ اوائل سنہ ۶۰۲ ھ میں بختیار مارا گیا (۱) ۔

---

۱ ۔ طبقات ناصری ۔ ترجمہ راورٹی ۔ انڈکس صفحہ (۶۰) خلجی

خلجیوں کی اصلیت کی نسبت ملامنہاج الدین ابو عمر عثمان کا خیال سب میں زیادہ قابل وثوق ھے۔ منہاج الدین، سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں تھا۔ اسکا زمانہ متذکرہ بالا تمام مورخین سے پیشتر کا ھے۔ اس کے قول کے مطابق خلج ایك ترکی قبیلہ ھے جو شمالی ترکستان سے بہت زمانہ قبل نکل گیا۔ صرف قالج خان ھی کی اولاد کا خلجی کہلانا اس لئے غلط ھے کہ اسے کوئی تاریخی اھمیت حاصل نہیں ھے اور بقول فرشتہ تواریخ غزنویہ کے مطابق سبکتگین اور محمود غزنوی کے بہت سے امرا قوم خلج سے تھے جن کا زمانہ قالج خان سے پیشتر کا ھے چونکہ قالج خان ترکی خلجی تھا لہذ دوسرے خلجی امرا کی اولاد کی طرح ان کی اولاد بھی خلجی تھی۔

انسا ئیکلو پیڈیا آف اسلام اور اس سے زیادہ راورٹی نے اس موضوع پر بحث کی ھے جس سے یہ واضح ھوتا ھے کہ خلجی ترکی النسل ھیں جو افغانستان میں آباد ھوے (۱)۔ ان پر افغانی تہذیب و تمدن اور رسم ورواج کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ بعدمیں جو ترکی آئے انہیں بالکل افغانی سمجھا حالانکہ یہ ترك نژاد ھیں اور ترکستان کے قبیلہ خلج سے ان کا تعلق ھے۔ رفتہ رفتہ مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ انہوں نے ھندوستان میں قدم رکھنا شروع کیا اور یہیں آباد ھو گئے۔ ترکی بلبن کے عہد تك اتنے قوی ھو گئے کہ بلبن نے التمش کے مسلك کے خلاف انہیں سلطنت کیلئے خطرناك سمجھا اور غلامان چہلگانہ کی بیخ کنی کر کے ترکی قوت کو زبردست زد لگائی۔ بہادر پور میں یغرش خان خلجی کے دونوں بیٹے جلال الدین خلجی اور شہاب الدین خلجی بلبنی فوج میں ملازم تھے۔ کیقباد کے عہدمیں ملك الامرا ملك فخرالدین کوتوال کا بھانجا و داماد ملك نظام الدین

---

۱ - پروفیسر کرشنا سوامی انیگار اور رچرڈ ٹیمپل دونوں کی رائے ھے کہ خلجی ترکی النسل ھیں جو افغانستان میں آباد ھوئے انڈین انٹی کویری سنہ ۱۹۲۲ ع صفحہ (۲۰۵)

بہت قوی ہو گیا اور تمام معاملات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیکر وکیل سلطنت بنا یعنے وزارت عظمی حاصل کی اور اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش میں اس نے تمام امرا اور عمائدین سلطنت سے مخالفت مول لی ۔ آخرکار اس کی نت نئی بد عنوانیوں سے خود بادشاہ تنگ آگیا اور اس کو زہر دیکر مار ڈالا گیا ۔ اس وقت ملک جلال الدین فیروز بن ملک یغرش خان خلجی نائب سامانہ اور امیر جائداد تھا ۔ بادشاہ نے اسے سامانہ سے طلب کیا اور شائشتہ خان کا خطاب دیکر برن کا جاگیردار بنایا ۔ اور بعد ازاں عرض ممالک کے عہدہ پر فائز کیا ۔

ترک خلجیوں کو اپنے برابر والے ترک نہ سمجھتے بلکہ انہیں پٹھان سمجھتے تھے ۔ لہذا ان کی یہ کوشش تھی کہ اپنی قوت اور اثر کو برقرار رکھیں تاکہ غیر ترک مثلا خلجی ان پر حکمران نہ ہوں ۔ لہذا کیقباد کے فریش ہوجانے کے بعد انہوں نے اس کے بیٹے کیومرث (۱) کو سلطان شمس الدین کے خطاب سے تخت نشین کیا ۔ اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی فکر میں انہوں نے خلجی جماعت کو جو جلال الدین کی سرکردگی میں قائم ہوگئی تھی ، کمزور کرنے کی کوشش کی ۔ اور عوام کو خلجیوں سے بدظن کرانے کے لئے انہوں نے خلجی جماعت کے ساتھ برا سلوک کیا ، انہیں ذلیل کیا اور حکومت کے ناقابل ٹھہرایا ۔

ترکوں کی اس خود غرضی کو مٹانے کی خاطر جلال الدین نے جنگ کی طیاری کی اور اس کے بیٹوں نے فوج کا ایک دستہ لیکر بہادری کے ساتھ محل شاہی پر حملہ کیا اور شمس الدین کو تخت سے اٹھا کر اپنے باپ کے آگے حاضر کیا ۔ کیقباد کے

---

۱ ۔ الیٹ جلد سوم ۔ ترجیت الامشار صفحہ (۳۹) آخری سطر ۔ شمس الدین کیومرث ۔ قران السعدین ۔ تمہید صفحہ (۵۰)

خاتمہ کے بعد جلال الدین فیروز شاہ خلجی سنہ ۱۲۸۹ع میں کیلو گھری میں
تخت نشین ہوا اور خاندان خلجی کی بنا ڈالی ۔ اپنے بھائی شہاب الدین مسعود کو
یغرش خان کا خطاب دیا اور عرض ممالک کے منصب پر پہونچایا اور اس کے بیٹوں میں
علاؤالدین کو جسے وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا دربار کے اعلی امرا میں
شامل کیا اور الماس بیگ کو الغ خان کا خطاب دیکر آخر بیگ کیا ۔ دربار میں رھنے سے
علاؤالدین سلطنت کے نشیب و فراز اور حکومت کی تمام چالوں سے واقف ھوگیا
اور سنہ ۱۲۹۶ع میں تخت نشین ھوکر اس نے تمام ھندوستان پر مستحکم اور منظم
حکومت کی ۔

نائٹروجن کی اہمیت اور اسکی تثبیت

از

جناب خواجہ غلام گوہر علی خان متعلم بی۔ اے

میں مضمون کے شروع کرنے کے قبل مناسب سمجھتا ہوں کہ قدرت کی بے پایان نعمتوں کا شکریہ ادا کروں کہ اس نے ہمارے آرام و آسایش کے لئے طرح طرح کی چیزیں وافر مقدار میں مہیا کردی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زمین جو ہمارے لئے مختلف قسم کے اناج پھل پھول پیدا کرتی ہے اس کی ایک خاص حد یا مقدار ہوتی ہے۔ اگر اس سے زیادہ مقدار میں حاصل کرنا ہو تو دوسرے ذریعے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسانی آبادی اور ضروریات زندگی میں اضافہ ہوتا گیا اور زمین کی طبعی پیداوار ان کے لئے ناکافی ثابت ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بڑی کاوشوں و جانفشانی کے بعد بعض ایسی چیزیں یا مرکبات معلوم کئے جن کو زمین میں ملانے پر اس میں پیدایش و نمو کی طاقت زیادہ بڑھ گئی۔ مگر وہ ان مرکبات کی ماہیت سے واقف نہ ہو سکے اور نہ مصنوعی طور پر ان کو تیار کرنے پر قادر ہوے۔ حال حال میں عالمان یورپ نے اس میدان میں قدم رکھا اور بڑی محنت و کوشش کے بعد ان کی ماہیت اور ان کے عمل سے وقفیت حاصل کی۔ یہ بات بڑی حیرت و تعجب کی ہے کہ جو چیز زمین میں جان ڈالتی ہو اور انسان کے لئے غذا جیسی ضروری شئے بہم پہونچاتی ہو وہی دوسری طرف انسانی قتل و غارتگری میں کام آتی ہے۔ کیونکہ حیوانی اور نباتی زندگی کے لئے نائٹروجن بہت ضروری ہے اور اسی نائٹروجن کا بہت سے دھماکوں و آتش گیر مادوں میں بہت دخل ہے۔

ھے، فرد بشر جانتا ھے کہ زمین کو عمدہ سے عمدہ بنانے کے لئے بعض خاص شیاء استعمال کی جاتی ھیں ۔ ان خاص اشیا کو جو اس مقصد کے لئے استعمال ھوتی ھیں ,, کھاد ،، کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے ۔ کھاد مختلف قسم کی ھوتی ھے مگر ان تمام میں نائٹروجن کا ھونا ضروری ھے خواہ وہ کسی شکل میں اور کسی عنصر سے ملی ھوئی ھو ۔ اور درختوں پر ان کا عمل ایک ھی ھوتا ھے ۔

متمدن ممالک مثلا یورپ ، انگلستان ، امریکہ وغیرہ میں کھاد کے طور پر پوٹاسیم نائٹریٹ (Potassium nitrate) سوڈیم نائٹریٹ (Sodium nitra'e) اور بعض امونیم نمک استعمال کئے جاتے ھیں ان تمام کا عمل یہی ھوتا ھے کہ یہ اپنی نائٹروجن درختوں کو دیکر انکو سرسبز شاداب رکھتے ھیں ۔ ھندوستان میں گھوڑے کی لید وغیرہ اور بعض درختوں کی جڑوں میں بلی وغیرہ کو مارکر ڈالتے ھیں ، یہاں پر بھی یہی عمل ھوتا ھے کہ بلی وغیرہ کا مابقی زیادہ دباؤ اور تپش کے تحت تحلیل ھوکر امونیا (NH_3) میں تبدیل ھوتا ھے ۔ پھر یہ چند تغیرات کے ماتحت نائٹرک ترشہ میں تبدیل ھوجاتا ھے جو زمین کے اجزا سے ترکیب کھا کر نائٹریٹس (Nitrates) میں تبدیل ھوتی ھے پھر ان نائٹریٹس سے درخت نائٹروجن حاصل کرلیتے ھیں اس سے معلوم ھوا ھوگا کہ ان تمام کا عمل ایک ھی ھے اگرچہ کہ صورتیں مختلف اور پیچیدہ ھیں پوٹاسیم نائٹریٹ کھاد کے علاوہ نہایت خوفناک اور مہلک اشیاء کی تیاری میں بھی استعمال ھوتا ھے ۔ جن کو دھما کو آمیزہ کہتے ھیں ۔

ھر وہ شخص جو سائنس سے اور خصوصیت سے علم کیمیا (Chemistry) سے کچھ بھی وقفیت رکھتا ھے وہ بخوبی جانتا ھے کہ پوٹاسیم نائٹریٹ (KNO_3) تین عنصروں یعنی پوٹاشیم ، نائٹروجن اور اکسیجن پر مشتمل ھوتا ھے ۔ اور اسی طرح سوڈیم نائٹریٹ

(Na,No3) بھی تین عناصر یعنی سوڈیم یا (Na,) نائٹروجن (N) اور اکسیجن (O) پر مشتمل ہے۔ ان دونوں مرکبات میں پوٹاشیم اور سوڈیم اساس ہے۔ اور اکسیجن نائٹروجن ہوا کے دو بڑے جزو ہیں۔ ذیل میں معمولی خشک ہوا میں جو گیسی اجزا شامل ہیں ان کا فیصدی تناسب درج کیا جاتا ہے اور یہ اعداد بلحاظ حجم کے ہیں۔

گیس کا نام	فیصدی تناسب
نائٹروجن (Nitrogen)	۷۸٫۱۱۱
اکسیجن (Oxygen)	۲۰٫۹۵۵
ارگن (Argon)	۰٫۹۳۳
نیان (Neon)	۰٫۰۰۱۵
ہیلیم (Helium)	۰٫۰۰۰۵
ہائڈروجن (Hydrogen)	٫۰۰۰۱
کرپٹن (Krypton)	۰٫۰۰۰۰۰۵
زینان (Xenon)	۰٫۰۰۰۰۰۰۶
کاربن ڈائی اسائڈ (Corbon dioxide)	۰٫۰۳
اوزون (Ozone)	۰٫۰۰۰۰۶

ان میں اکسیجن ہی ہماری زندگی کا باعث ہے اگر یہ نہ ہو تو حیوانی زندگی کا خاتمہ ہوجائے اور دنیا میں کوئی چیز نہ جل سکے۔ اور یہی اکسیجن ہے جو ہائڈروجن سے ترکیب کھا کر پانی پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح تمام اجسام خواہ وہ حیوانی ہوں یا نباتی ان کی نشوء نما کے لئے نائٹروجن کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

ایسے ~~نباتی~~ نامیاتی مرکبات (Organic Compounds) جن میں نائٹروجن ترکیبی حالات میں ہوتی ہے جب یہ جراسیم (Bacteria) کے توسط سے تحلیل ہوتے ہیں

و نائٹروجن کا کچھ حصہ کرہ ہوا میں مل جاتا ہے، اور کچھ حصہ کو اشجار بالراست
الے لیتے ہیں۔ چونکہ حیوان اس سے بالراست استفادہ نہیں اٹھا سکتے اس لئے وہ اپنی
س کمی کو ترکاریوں کے استعمال سے پورا کرتے ہیں۔ پھل، پھول، ترکاریاں جب
تحلیل ہوتی ہیں تو کچھ توانائی بھی پیدا ہوتی ہے جو اعلی حیوانی زندگی کے لئے بہت
ضروری ہے۔ توگویا اس طرح نباتات، نامیاتی اور حیوانی زندگی کے درمیان
ایک رشتہ بنتے ہیں۔

نباتات بھی بالعموم نائٹروجن کو کرہ ہوا سے بالراست نہیں لیتے بلکہ
نائٹریٹس میں جو نائٹروجن ہوتی ہے اس سے یہ استفادہ کرتے ہیں۔ دیگر نباتی اشیاء جو کھاد
وغیرہ میں ہوتی ہیں وہ جراثیم (Bacteria) (اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ
درختوں کی جڑوں میں جراثیم ہوتے ہیں جو نائٹریٹس وغیرہ سے نائٹروجن کو لیکر
درخت کو دیتے ہیں) کے حملہ یا اثر سے کچھ نائٹریٹس اور کچھ آزاد نائٹروجن میں تحلیل
ہوجاتے ہیں۔ کرہ ہوا کی نائٹروجن کی کچھ مقدار آسمانی طوفان مثلاً برقی روؤں کے
بہنے اور بجلی کی چمک وغیرہ سے تکسید (کسی عنصر یا مرکب کا اکسیجن کے ساتھ ترکیب
کھانا تکسید کہلاتا ہے) ہوکر بارش کے پانی کے ذریعہ نائٹرک ترشہ کی صورت میں
زمین پر آجاتے ہیں اور یہاں زمین پر وہ نائٹریٹس میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اگرچہ کہ
ان کی بہت قلیل مقدار ہوتی ہے مگر اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کن کن
طریقوں سے حیوانی اور نباتی زندگی کی پرورش کرتی ہے۔

سنہ ۱۸۵۲ع میں G. Ville نے دریافت کیا کہ بعض پودے مثلاً Beans
Peas Clover, Leguminosae ایسے ہیں جو تحلیل سے زمین کو اتنی نائٹروجن دیتے ہیں
کہ ایک مرتبہ ثمر کے بار آور ہونے کے بعد بھی ان میں کافی نائٹروجن موجود ہوتی ہے۔

سنہ ۱۸۸٦ع میں H. Hell نے بتلایا کہ بعض پودے مثلاً Leguminoa وغیرہ ایسے ھیں جن کی زندگی Bacteria کی وجہ سے ھے اور یہ Bacteria جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ھے درختون کی جڑون میں ہوتے ھیں یہ کہا دیا کرہ ھوا سے نائٹروجن کولیکر درخت یا پودے کو اس سے استفادہ کا موقعہ دیتے ھیں۔ غرض یہ کہ نائٹروجن کا ھماری زندگی اور موت کے ساتہ ھمیشہ کا تعلق ھے۔ جیسا کہ ذیل کی شکل سے ظاھر ھوتا ھے۔
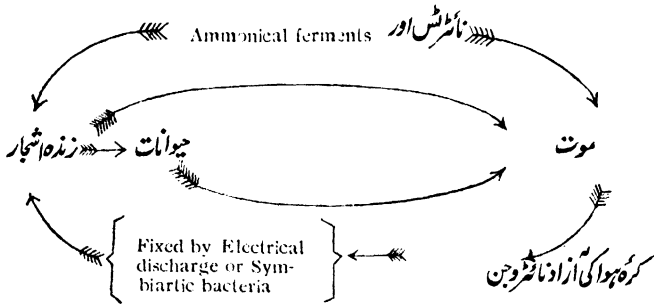
حسب بالا تغیر کو الفاظ میں یون بیان کیا جاسکتا ھے کہ نائٹروجن کا جوجوھر (Atom) اج ھرے بھرے شاداب و نازک پودے میں ھوگا وہ کل ممکن ھے کہ حیوانی غذا بنجائے اور پھر بعد ازان حیوانی فضلہ سے نکل کر کرہ ھوا کا رخ کرے اور یہان بجلی و برق کی کرشمہ سازیون کی وجہ سے تکسید (اکسیجن سے ملکر) ھوکر اکسائڈز میں تبدیل ھوجائے اور پھر بارش (پانی) کے قطرون پر سوار ھوکر زمین پر پہنچے اور کہاد ھوکر نباتات کی غذا بنکر ان کو تروتازگی بخشے۔ یہ تغیر نہ معلوم کب سے جاری ھے اور کب تک جاری رھیگا۔

دوسری طرف یہ حالت ھے کہ کرہ ھوا کی نائٹروجن اور امونیا (کرہ ھوا میں بہت قلیل مقدار میں امونیا کے شائبے پائے جاتے ھیں) کی تکسید سے نائٹروجن کے اکسائڈز پیدا ھوتے ھین اور یہ نائٹرک ترشہ میں تبدیل ھوجاتے ھیں۔ زمین پر

پہونچکر سوڈیم ، پوٹاشیم نمکوں کو نائٹریٹس میں تبدیل کردیتے ھیں ۔ اس کے قبل بیان کیا جاچکا ھے کہ سوڈیم نائٹرئٹ اگر زمین کو قوت نمو بخشتا ھے تو دوسری طرف پوٹاشیم نائٹریٹ خلق خدا کا خون بہانے میں کام آتا ھے ۔ چنانچہ نپولین اعظم کے زمانہ کی ایک جنگ میں فرانسیسی پوٹاشیم نائٹریٹ کے کافی طور پر دستیاب نہ ھونے پر بہت پریشان ھوے تھے کیونکہ ان کے پاس انسانی خون بہانے کا ذخیرہ ختم ھوگیا تھا۔ حال کی وہ خوفناک جنگ جوجنگ عظیم کے نام سے موسوم کی جاتی ھے سنہ ۱۹۱۷ع کے قبل ھی ختم ھوجاتی اگر اھل جرمنی آتش گیر اور دھما کو اشیاء بنانے کیلئے نائٹروجن کو دوسرے طریقوں سے حاصل نہ کئے ھوتے ۔

ذیل میں نائٹروجن کو اس کے مرکبات میں تبدیل کر کے یا قدرتی مرکب سے جو صنعتی پیمانہ پر حاصل کیا جاتا ھے درج کئے جاتے ھیں ۔

۱ کوئلہ کی کشید فارق کے دوران میں بہت سی امونیا ضمناً حاصل ھوتی ھے ۔

۲ ملک چلی (Chili) کے گرم اور بے آب علاقوں میں پوٹاشیم نائٹریٹ وسیع پیمانہ پر پایا جاتا ھے ۔ حساب لگایا گیا ھے کہ ایک وسیع قطعہ زمین ھے جس میں تقریباً (۳۵۰) ملین ٹن (Caliche) ھے جن میں (۵۱) فیصد پوٹاشیم نائٹریٹ ھوتا ھے ۔ سنہ ۱۹۰۹ع میں چلی کی حکومت نے ایک کمیشن بٹھایا تھا جس کی رپورٹ سے معلوم ھوتا ھے کہ سنہ ۱۹۱۲ع میں (۲-۳) ملین ٹن کے قریب سوڈیم نائٹریٹ نکالا گیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ھے اگر برامد کی یہی حالت رھے تو ایک صدی کے اندر اندر پوٹاسیم نائٹریٹ کا ذخیرہ یہاں ختم ھوجائیگا ۔

نائٹریٹ گیہوں وغیرہ کی کاشت کے لئے بہت استعمال ھوتا ھے ۔ قدرتی ماخذ کو ختم ھوتا دیکھکر یورپ میں کوششیں کی گئیں اور کی جارھی ھیں کہ کسی آسان طریقہ سے کرۂ ھوا کی نائٹروجن کی تثبیت کرسکیں جو کہ کھاد اور دیگر مفید کاموں میں استعمال

کی جا سکے - چنانچہ سنہ ۱۸۹۶ع میں (F. Nobbe) اور (L. Hiltner) نے تحقیقات کیں اور انہوں نے "Nitrogen fixing" کے طریقہ کو (Nitragen) کے نام سے موسوم کیا اور ان کی اس تحقیق سے بعض درختوں پر اچھے نتیجے اخذ ہوئے جب کہ (Glucose) اور (Peptones) کو اس پانی میں جس میں کہ (Nitrifying bacteria) موجود ہوتا ہے ملایا گیا -

۳- کرۂ ہوا کی نائٹروجن کی تثبیت کا برقی قاعدہ

(James Priestly) نے دیکھا کہ جب ہوا میں برقی شرارے پیدا کئے جاتے ہیں تو ایک ترشہ پیدا ہوتا ہے اس نے خیال کیا کہ یہ ترشئی خواص کاربانک ترشہ کی وجہ سے ہوں گے لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی سنہ ۱۷۸۵ع میں (H. Cavendish) نے ثابت کیا کہ یہ حاصل نائٹرک ترشہ ہے اسی زمانہ میں (M. Borthelot) نے تحقیق کی کہ یہاں پر نائٹرک اکسائیڈ درمیانی حاصل ہے -

(H. Cavendish) نے تجربہ میں جو آلہ استعمال کیا تھا اس کی شکل حسب ذیل ہے :-

اس میں ایک خمیدہ نلی لی جاتی ہے - نلی کے دونوں کھلے سروں کو دو گلاسوں کے اندر پارہ میں ڈبو دیا جاتا ہے پھر اس نلی کے درمیانی حصہ میں متعدد برق
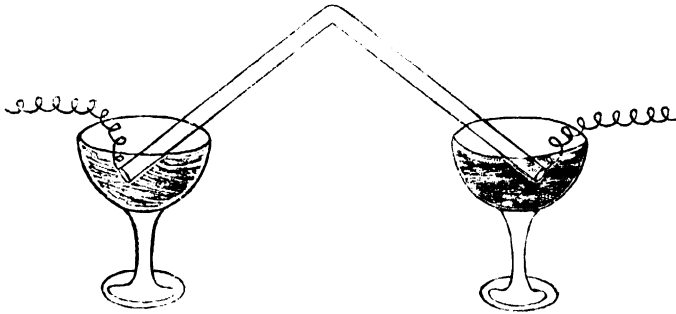
شرارے پیدا کئے جاتے ہیں تو نائٹرك ترشه پیدا ہوتا ہے اس کی تشخیص سوڈیم ہیڈرا کسائیڈ سے کی جاتی ہے کیون که اس صورت میں سوڈیم نائٹریٹ پیدا ہوتا ہے۔

سنه ۱۸۹۵ع میں Z. hefebvre نے فضا میں متعدد برقی شرارے گذارے وراس عمل سے جو گیس پیدا ہوئی اس کو نلی میں حل کیا تا که سوڈیم نائٹریٹ حاصل ہو مگر یه قاعدہ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوا۔

سنه ۱۹۰۲ع میں Siemens اور Halske نے ہوا کو ایك ایسے کمرہ میں سے گذارا جس میں برقی قوس کو بہت زیادہ پھیلنے کا موقعه تھا تو اس عمل سے نائٹروجن کے اکسائیڈز حاصل ہوئے آله کی شکل حسب ذیل ہے :—

مگر سنه ۱۹۰٦ع میں اس عمل کے دوران میں جو تغیرات حادث ہوئے ہیں ان پر (W. Nernst) اور (F.Haber) نے روشنی ڈالی۔ چون که نائٹروجن سے معمولی تپش پر نائٹروجن کے اکسیڈائز حاصل نہیں ہوتے ہیں مگر بہت بلند تپشوں پر اس کے اکسائڈز حاصل ہوتے ہیں اور جوں جوں تپش بڑھتی جاتی ہے اسی طرح پیدا ہونے والے اکسائڈز کی مقدار بھی بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچه ذیل کے مشاہدات سے اس کا پته چلتا ہے۔

تپش	°۱۸۱۱	°۲۰۳۳	°۲۱۹۵	°۳۰۰۰	°۳۲۰۰
نیٹرك اکسائیڈ	۰٫۰۳۷	۰٫۰۶۴	۰٫۹۹۷	۴٫۵	۵٫۰

اس طریقه سے نائٹروجن کے اکسائیڈ کو تجارتی پیمانه پر حاصل کرنے کی متعدد کوشش کی گئیں او Birkeland اور Eyde کاجو طریقه هے وه زیاده بهتر هے ه Norway میں زیاده مستعل هے۔ اله کی شکل اور عمل حسب ذیل هے :—
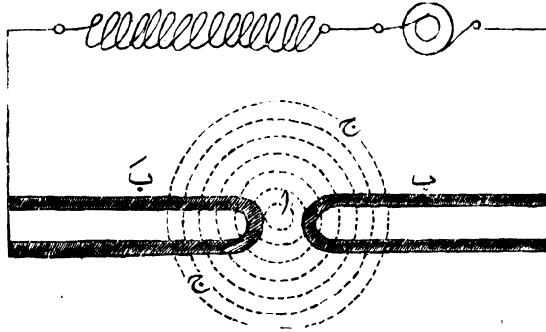
اس میں دو تانبے کی نلیاں ب ب هے جس میں سرد پانی گذرتا هے ان کے درمیان ایك بڑی طاقت کی برقی قوس پیدا کی جاتی هے۔ جب رو کو روکا اور جاری کیا جاتا هے تو قوسین جلد جلد پیدا اور فنا هوتی هیں اور ان کے پیدا هونیکا عمل ۱/۵۰ سکنڈ پر هوتا رهتا هے۔ اس طرح جلد جلد برقی قوسون کے پیدا او غائب هونے سے اتنی حرارت پیدا هوتی هے که ایك منور حلقه پیدا هوتا هے جس کو ”برقی چاند،، کهتے هیں، اس کا قطر تقریبا ٦ فیٹ هوتا هے۔ اب هوا کی روگذاری جاتی هے۔ چونکه قوس زیاده فضا پر پهیلی هوئی هوتی هے اس لئے زیاده نائٹروجن کو تکسید هونے کا موقعه ملتا هے۔ اس کو دباؤ کے ذریعه نکال کر ٹهنڈا کیا جاتا هے۔ جس سے اس کی تحلیل رك جاتی هے اب °۲۰۰ پر No کو تکسیدی کمره (Oxidaton Chamber) میں پهونچایا جاتا هے جهان یه مزید اکسیجن سے ترکیب کها کر No (نائٹرك پر اکسائیڈ) میں تبدیل هو جاتی هے

اب اس کو ایسے پانچ جاذب کروں میں سے گذارا جاتا ہے جہاں اس کو پانی اور دوریا چونا ملتے ہیں جذب شدہ نائٹروجن اکسائیڈز کیلسم نائٹریٹ پیدا کرنے میں اس کو تبخیر کرکے ٹھوس مرکب کو حاصل کیا جاتا ہے اور یہ ٹھوس مرکب کھاد کے نام سے بازار میں فروخت ہوتا ہے۔ Birkeland اور Eyde کے قاعدہ میں جو Norwegiam Saltpetre (کیلسم نائٹریٹ) حاصل ہوتا ہے وہ تقریباً نابیدہ ہوتا ہے۔ اس کی تجارتی اہمیت اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ سنہ ۱۹۰۹ع میں ۹۴۲۲ ٹن کیلسم نائٹریٹ حاصل کیا گیا اور سنہ ۱۹۱۲ع میں ۱۱۰۰۰۰—۱۲۰۰۰۰ ٹن کے قریب تیار کیا گیا۔

۴۔ کرۂ ہوا کی نائٹروجن کو ہائڈروجن کے ساتھ تقابل کرواکر ہیڈرائیڈز میں ثبت کیا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کسی خاص تپش اور دباؤ کے تحت نائٹروجن اور ہائڈروجن کے جو حجم ترکیب کھاتے ہیں ان کی کیا مقدار ہے۔

تپش	ایک کرہ ہوا دباؤ	۵۰ کراف ہوائیہ	۱۰۰ کراف راتہ	۲۰۰ کراف ہوائیہ
°۴۵۰	۰٫۲۴	۵٫۹	۲٫۱۶	۳٫۲۵
°۵۰۰	۰٫۱۳	۵٫۷	۱۰٫۴	۱۷٫۶
°۵۵۰	۰٫۰۸	۲٫۷	۶٫۹	۱۲٫۰
°۶۰۰	۰٫۰۵	۲٫۳	۴٫۵	۸٫۴

ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ تپش کم ہو اور دباؤ زیادہ ہو تو امونیا (نائٹروجن اور ہائڈروجن کے ترکیب کھانے سے جو مرکب حاصل ہوتا ہے وہ امونیا ہے) زیادہ تعداد میں حاصل ہوتی۔ °۴۵۰ تپش پر دباؤ زیادہ کرنے سے حاصل کی مقدار بھی بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ عمل سست ہوتا ہے۔ اس میں چند ترمیمیں کی گئیں ہیں جو درج ذیل ہے۔

(الف) سنہ ۱۹۰٦ع میں (F. Haber) جرمنی کے سائنس داں نے صاف کی ہوئی نائٹرجن اور ہائڈروجن گیسوں کو ۳:۱ نسبت میں لیکر ۲۰۰ کرافٹ ہوا دباؤ کے تحت ایك ایسی گرم نلی میں سے جس کی تپش ۷۰۰° ــ ۵۰۰° ہو باریك منقسم (Osmium) یا (Uranium) دھات پر سے گذارا تو امونیا حاصل ہوئی ـ

(ب) (Claude) نے اس ریزہ کو ۱۰۰۰ کرافٹ ہوائیہ دباؤ کے تحت حامل (۵۰۰° پر لوھے، پوٹاشیم اکسائڈ وغیرہ) پر سے گذارا تو ۴۰ فیصد امونیا حاصل ہوئی۔ اس صورت میں امونیا کو تابع کرلیا جاتا ھے یا زیادہ دباؤ کے تحت پانی میں جذب کرلیا جاتا ھے ۔ یہاں پر جو ہائڈروجن صرف ہوتی ھے اس کو پون گیس (Producer Gas) سے اور نائٹروجن کو مایع ہوا کی کشید سے حاصل کیا جاتا ھے ۔ یہاں پر دھاتی لوھا حامل کے طور پر بہت کارآمد ثابت ہوتا ھے بشرطیکہ وہ گندك سے کلیۃ پاك ہو ـ

سیانمائیڈ سے

امونیا تجارتی پیمانہ پر حاصل کرنا ہو تو (Haber) کے قاعدہ کے علاوہ (Calcium Cyanamide) کی آبیدگی سے بھی حاصل کی جاتی ھے۔ یہ سنہ ۱۸۹۰ع میں (Caro) اور (Frank) نے دریافت کیا تھا۔ اس میں کیا یہ جاتا ھے کہ کیلسم کاربائڈ (CaC_2) کو ۱۱۰۰° تك گرم کرکے اس پر سے نائٹروجن کو گذارا جاتا ھے تو اس صورت میں (Cyanamide) کے ساتھ کچھ گرینائیٹ بھی ہوتا ھے ـ

$$CaC_2 + N_2 —— CaCN_2 + C$$
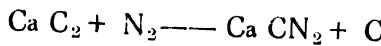
اس میں ٹھنڈا پانی ملاکر غیر تبدیل شدہ CaC_2 کو جدا کرلیا جاتا ھے ـ

اب اگر اس کو پانی کے ساتھ تعامل کروائیں اور تھوڑا سا کلورائیڈ یافلورائیڈ موجود ہو تو ۷۰۰° پر تعامل سرعت کے ساتھ ہوتا ھے ورنہ تعامل سست ہوتا ھے ـ

$$Ca\,CN_2 + 3H_2O \longrightarrow Ca\,CO_3 + 2NH_3$$
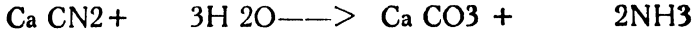
(امونیا)   (کیلسم کارپوینٹ)   (پانی)   (کیلسم سینا مائیڈ)

اگر Calaum Cyanamide پر سے ۱۸۰° پر بھاپ کو ۹ کراف ھوا کے تحت گذارا جائے تو تحلیل بہت جلد ھوتی ھے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ھے کہ کیلسم کاربائیڈ پر سے جب نائیٹروجن کو گذارا جاتا ھے تو Ca CN 2 کے ساتھ ساتھ گرینائیٹ بھی حاصل ھوتی ھے جس کی وجہ سے حاصل کا رنگ سیاہ ھوتا ھے۔ اس سیاہ سفوف کو تر کیا جاتا ھے تاکہ وہ غیر تبدیل شدہ کیلسم کاربائیڈ کی تحلیل کر دے اور اس کو ایسے Autsclaves میں آبیدہ کیا جاتا ھے جس میں ٦ ٹن پانی اور ۳ ٹن Cganamide ھوتا ھے۔ اور بھاپ کو ۳ کراف ھوا دباؤ کے تحت گذارا جاتا ھے اگر یہاں کچھ Acatylene پیدا ھو جائے تو اس کو جدا کر لیا جاتا ھے۔ پھر بھاپ کے دباؤ کو تقریبا گیارہ کراف ھوا اور تپش کو ۱۸۰° تک بڑھا کر مونیا حاصل کی جاتی ھے۔

بار گراں !

(ٹالسٹائی)

مترجمہ جناب خلیل الرحمن صاحب ایم - ایس - سی (عثمانیہ)

اٹلی و فرانس کی سرحد کے قریب بحیرۂ متوسط کے ساحل پر مونا کو نامی ایک چھوٹی سی ریاست ہے - کئی ایک گاؤں اس ملک سے زیادہ آبادی رکھنے کا فخر کرسکتے ہیں کیونکہ گنتی کے سات ہزار نفوس یہاں آباد ہیں - اگر جملہ زمین باشندوں پر تقسیم کی جائے تو ہر ایک کے حصے میں مشکل سے ایک ایکڑ آئیگا - لیکن اس ننھی ریاست کا ایک بادشاہ ہے - اسکا ایک محل ہے - درباری ہیں - وزراء، بشپ، جنرل، اور فوج ہے -

فوج جملہ ساٹھ سپاہیوں پر مشتمل ہے - دوسرے ممالک کیطرح یہاں بھی ٹیکس لیا جاتا ہے - تمباکو، شراب اور دیگر منشیات پر ٹیکس ہے - یہاں کے باشندے بھی اور ممالک کے باشندوں کیطرح شراب نوشی اور تمباکو نوشی کرتے ہیں - لیکن انکی تعداد اسقدر قلیل ہے کہ اگر بادشاہ کو آمدنی کے خاص ذرائع نہ ہوتے تو اسکے لئے محل، درباریوں اور احکام کے مصارف برداشت کرنا نہایت دشوار ہوتا - آمدنی کا یہ خاص ذریعہ ایک قمار خانہ ہے - جہاں لوگ پانسہ کھیلتے ہیں - لوگ خواہ جیتیں یا ہاریں ہر بازی کا ایک فیصدی حصہ قمار خانے کے مالک کو ملتا ہے - اور یہ اپنے منافع کا ایک کثیر حصہ بادشاہ کو دیتا ہے - اسکی وجہ یہ ہے کہ تمام یورپ میں اس قسم کا یہی ایک قمار خانہ ہے - جرمنی کے رئیس بھی اس قسم کے قمار خانے رکھا کرتے تھے لیکن چند سال ہوئے انکو اٹھوا دیا گیا - قمار خانے تباہی کا باعث ہوتے ہیں - ایک شخص انمیں جا کر قسمت آزمائی کرتا ہے، اپنی جملہ نقدی ہار دیتا ہے - اسکے بعد اس رقم

کو بھی بازی میں لگا دیتا ہے جو اسکی نہیں ہوتی۔ بالآخر جب یہ بھی ہار دیتا ہے تو پریشان ہوکر خودکشی کر لیتا ہے۔ اسیوجہ سے جرمنی کے باشندوں نے اپنے رؤسا کو اسطرح روپیہ پیدا کرنیسے منع کر دیا۔ لیکن موناکو کے بادشاہ کو کون روک سکتا تھا! اس کاروبار کا اب یہی ٹھیکےدار ہے۔

آجکل ہر شخص جوا کھیلنے کے لئے موناکو جاتا ہے۔ کسی کی ہار جیت سے بادشاہ کی مستقل آمدنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کہا جاتا ہے کہ ،، حلال کی کمائی سے محل نہیں بنتا ،،۔ خود موناکو کا بادشاہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کاروبار برا ہے۔ لیکن ، کیا کرے؟ اسکو شاہانہ طریقے سے رہنا ضروری ہے! شراب اور تمباکو کے محاصل بھی تو برے ہیں! اسطرح وہ حکومت کر کے دولت جمع کرتا ہے۔ اسکے دربار بھی ایسے ہی پر شوکت ہوتے ہیں جیسے کہ ایک بادشاہ کے ہونے چاہیئیں۔ دوسرے بادشاہوں کیطرح اسکی تاجپوشی کا بھی دربار ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ معاف کرتا ہے۔ مجلس وزراء ، تعزیزات ، عدالت سب کچھ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ سب چھوٹے پیمانے پر ہیں۔

چند سال ہوئے اس بادشاہ کی ریاست میں ایک قتل کی واردات ہوئی۔ اس ریاست کے باشندے امن پسند ہیں۔ انکے ملک میں اس قسم کا واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ تمام عدالتی رسوم کے ساتھ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ جج ، وکیل سرکار ، جیوری ، وکلاء سب موجود تھے۔ خوب بحث مباحثے کے بعد ملزم کو از روئے قانون سزائے قتل سنائی گئی۔ بعد ازاں اس حکم کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اسکو منظور کرتے ہوئے لکھا ،، اگر مجرم کو قتل کرنا ضروری ہے تو قتل کر دیا جائے ،،۔

اسکی تکمیل کے لئے ایک دقت یہ تھی کہ انکے پاس سر قلم کرنیکے لئے گیلوٹین تھی نہ کوئی جلاد۔ وزراء نے اس معاملے پر غور کرنیکے بعد یہ تصفیہ کیا کہ حکومت فرانس

سے اس بارے میں دریافت کیا جائے کہ آیا وہ گیلوٹین اور ایک ماہر جلاد فراہم کرسکتی ہے اور اگر کرسکتی ہے تو اسکے کیا مصارف ہونگے؟ خط روانہ کرینکے ایک ہفتہ بعد جواب آیا کہ آلہ اور ماہر بھجوائے جاسکتے ہیں۔ اسکے مصارف ۱۶۰۰۰ فرانک ہونگے۔ خط بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے غور کیا ،، سولہ ہزار فرانک! یہ مردود اتنی کثیر رقم کے قابل تو نہیں ہے! کیا اس سے کم خرچ میں یہ کام نہیں ہوسکتا؟ سولہ ہزار فرانک کے یہ معنی ہوئے کہ ہر شخص سے دو فرانک سے زائد ٹیکس لیا جائے۔ رعایا اسکو کبھی قبول نہیں کریگی۔ ممکن ہے فساد ہو جائے،،۔

پس اس مسئلہ پر غور کرنیکے لئے مجلس طلب کی گئی جس میں تصفیہ پایا کہ اس بارے میں شاہ اٹلی سے دریافت کیا جائے۔ حکومت فرانس جمہوری حکومت ہے یہ بادشاہوں کا لحاظ نہیں کرتی۔ لیکن شاہ اٹلی رشتۂ اخوت کا لحاظ کرتے ہوئے ممکن ہے اس سے کم رقم میں یہ کام کردیں۔ خط لکھا گیا جسکا فوری جواب وصول ہوا۔

حکومت اٹلی نے لکھا کہ اس کام کو وہ بخوشی انجام دیگی۔ اسکے مصارف بشمول اخراجات سفر ۱۲۰۰۰ فرانک ہونگے۔ یہ رقم نسبتاً کم تھی لیکن اسکی ادائی مشکل تھی بدمعاش اس رقم کے بھی قابل نہیں تھا۔ اسکے لئے بھی ۲ فرانک فی نفر ٹیکس وصول کرنا پڑتا۔ دوبارہ مجلس طلب کی گئی۔ وزراء نے اس کام کو کفایت سے سرانجام دینے کے متعلق بہت غور کیا۔ بالاخر یہ تجویز ہوئی کہ کسی سپاہی سے یہ کام لیا جائے سپہ سالار کو طلب کرکے دریافت کیا گیا ،، کیا آپ مجرم کا سر قلم کرنیکے لئے کوئی سپاہی کو دے سکتے ہیں؟ ،،۔ جنگ کے زمانے میں یہ لوگوں کو قتل کرنیسے کبھی گریز نہیں کرتے اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں صرف اسیکی مشق کرائی جاتی ہے۔ بنابریں سپہ سالار نے سپاہیوں سے اسکے متعلق دریافت کیا کہ آیا انمیں سے کوئی اس کام کو انجام دینے کے

لئے تیار ھے ؟ لیکن کسی ایک نے بھی رضامندی ظاھر نہیں کی۔ ،،نہیں،، سپاھیوں نے ہم آواز ہوکر کہا ،، ہم قتل کرنا نہیں جانتے۔ ھمیں یہ کام نہیں سکھایا گیا ھے،،۔

کیا کیا جائے ؟ دوبارہ وزراء نے اس مسئلہ پر غور کیا۔ اسکے لئے ایک کمیشن ایک کمیٹی، ھیں اور ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی اور آخرکار یہ طے پایا کہ سزائے قتل کو حبس دوام میں بدل دیا جائے۔ اس سے بادشاہ کو اپنا رقم ظاھر کرنیکا موقع ملیگا اور ساتھہ ھی اخراجات، میں بھی کافی تخفیف ھو جائیگی۔ بادشاہ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن اب یہ دشواری پیش آئی کہ دوآدمی حبس کے لئے کوئی مناسب قید خانہ موجود نہیں تھا۔ وقت ضرورت ایک چھوٹے حوالات میں مجرمین کو کچھ عرصے کے لئے رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب حبس دوام کے لئے ایک مضبوط قید خانہ کی ضرورت تھی بہر حال کام چلانیکے لئے ایک موزوں مکان تلاش کر کے قاتل کو اسمیں رکھا گیا اور اسکی نگرانی کے لئے پہرہ مقرر کیا گیا۔ پہرہ داروں کا یہ کام تھا کہ قاتل کی نگرانی کریں اور اسکے لئے شاھی باورچی خانے سے کھانا پہنچا دیا کریں۔

اسطرح مہینے گزرتے گئے حتی کہ ایک سال ختم ھوگیا۔ ختم سال پر جب بادشاہ نے اپنی جمع خرچ کا حساب دیکھا تو معلوم ھوا کہ اخراجات میں ایک نئے مد کا اضافہ ھوا ھے۔ وہ یہ کہ قیدی کی نگرانی کے لئے پہرہ اور اسکے کھانے پر سالانہ ۶۰۰ فرانک ھورھے تھے اور پھر بدقسمتی سے قاتل نوجوان اور تندرست و توانا تھا جو ابھی پچاس سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔ اسطرح جملہ اخراجات کا حساب لگانیسے ایک کثیر رقم ھوجاتی تھی۔ بادشاہ اسکے لئے کبھی تیار نہیں تھا۔ اس نے وزراء کو طلب کر کے کہا ،مجرم کو سزا دینے کا کوئی سستا طریقہ سونچا جائے۔ موجودہ طریقہ بہت زیر بار کرنیوالا ھے،،۔ وزراء نے آپسمیں مشورہ کیا۔ بالآخر بہت غور وفکر کے بعد ایک نے کہا ،، حضرات

میرے خیال میں پہرہ برخاست کر دیا جائے،،۔ ،، لیکن ،، دوسرے وزیر نے اعتراض کیا ،،مجرم فرار ہو جائیگا،،۔ پہلے مقرر نے جواب دیا ،، فرار ہو کر کہیں مر کھپ جانے دو ہماری بلا سے ،،۔ پس بادشاہ کو اس تصفیہ سے مطلع کیا گیا جسکو اسنے منظور کر لیا۔ پہرا اٹھا دیا گیا۔ اب اس بات کا انتظار تہا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے. اور ہوا یہ کہ جب کھا نیکے وقت قیدی باہر نکل کر پہرہ داروں کو غائب پایا تو فرار ہو نیکے بجائے خود اپنا کھانا لا نیکے لئے شاہی باورچی خانے کی طرف روانہ ہوا وہاں سے کھانا لیکر جیل خانہ واپس ہوا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دوسرے دن بہی یہی ہوا۔ آخر کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ وزراء نے دوبارہ اسپر غور کیا اور یہ تجویز ہوئی کہ قیدی سے صاف صاف کہدیا جائے کہ وہ اسکو رکھنا نہیں چاہتے۔ پس وزیر عدالت نے مجرم کو طلب کر کے کہا ،، تم فرار کیوں نہیں ہو جاتے؟ تمہاری حفاظت کے لئے کوئی پہرہ نہیں ہے۔ اب تم جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ بادشاہ سلامت اسکی پرواہ نہیں کرینگے ،،۔

،، بےشك۔ بادشاہ سلامت کو اسکی پروا نہیں ہوگی ،، قیدی نے کہا ،، لیکن اب میں کہاں جا سکتا ہوں؟ کیا کر سکتا ہوں؟ آپ نے میری نیکنامی پر دھبہ لگا دیا ہے۔ لوگ مجھ سے کنارہ کش رہینگے۔ اسکے علاوہ اب کام کرنیکی عادت بہی جاتی رہی۔ اپ نے میرے ساتہ بہت برا سلوك کیا۔ جب مجھکو قتل کی سزا دی گئی تہی تو چاہیئے تہا کہ اسکی تعمیل کی جاتی۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور میں خاموش رہا۔ اسکے بعد مجھکو حبس دوام کی سزا دیگئی اور میرا کھانا لانیکے لئے پہرہ مقرر کیا گیا۔ لیکن چند دنوں بعد پہرہ اٹھا دیا گیا۔ اب مجھکو اپنا کھانا آپ لانا پڑتا ہے۔ اسپر بہی میں بالکل خاموش رہا۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں تو نہیں جاؤنگا ،،۔

اس خلاف امید صورت حال کے پیدا ہونیسے پھر ایك مرتبه وزراء مشوره کے لئے جمع ہوئے۔ مجرم تو جانیسے انکار کرتا ہے اب کیا طریقه اختیار کیا جائے؟ اس مسئله کو انہوں نے بہت دیر تك غور کیا ۔ ایك صورت یه تھی که مجرم کے نام کوئی وظیفه مقرر کر دیا جائے ،، اسکے علاوه کوئی دوسری تدبیر سمجھه میں نہیں آتی انہوں نے بادشاه سے عرض کیا کسی طرح اس بلا ئے جان سے چھٹکارا ہو جائیگا ،،۔ ۶۰۰ فرانك سالانه وظیفه منظور کیا گیا اور اسکی اطلاع قیدی کو دی گئی ۔

،، خیر ،، قیدی نے کہا ،، اگر آپ پابندی کیساته دیا کریں تو مجھکو کوئی عذر نہیں صرف اسی شرط پر میں یہاں سے جانیکے لئے تیار ہوں ،،

تمام امور کا تصفیه کرنیکے بعد قیدی وظیفه سالانه کا تہائی حصه پیشگی لیکر ریاست سے باہر چلا گیا جس کے لئے ریل سے صرف پندره منٹ کا راسته تھا۔ سرحد کے اس پار اس نے کچھ زمین خرید کر وہاں سکونت اختیار کرلی ہے ۔ اب یه باغبانی کرتا ہے اور خوشحال زندگی گزار رہا ہے ۔ ہرسال پابندی سے اپنا وظیفه لینے کے لئے مونا کو جاتا ہے۔ وہاں ۲و۳ فرانك جوئے مین ہار جیت کر گھر واپس ہوجاتا ہے ۔

بھلا ہوا کہ اس نے کسی ایسے ملك میں قتل نہیں کیا جہاں کسی شخص کا سر قلم کرنیکے بار گراں اور برداشت کرنیکے لئے پس و پیش نہیں کیا جاتا ہے ۔

چند تاریخی اسناد

از

جناب محمد غوث صاحب یم۔اے ال ال۔بی (عثمانیہ)

گذشته چند سال سے مجھے جب کبھی مدراس میں مقام کرنے کا موقع ملا میں نے اپنا کچھ وقت جناب مولوی حاجی عبدالرحمن صاحب که تاریخی دفتر کے معائنه اور اسکے مرتب اور مهذب کرنے میں بھی صرف کیا۔ سارے دفتر کی با قاعده ترتیب اور تهذیب کے لئے بڑے سرمایه اور بڑےوقت کی ضرورت هے۔ اگر یه دفتر مرتب هوجائے تو تاریخ هندوستان که اکثر مختلف فیه امور قابل لحاظ حد تك تصفیه پاسکینگے۔

گذشته موسم گرما کا بڑا حصه بھی مدراس میں صرف هوا اور ساته هی تهذیب دفتر کا بھی کچه کام انجام پایا۔ اس مرتبه مجھے چند ایسے کاغذات دستیاب هوئے جن کا تعلق سلطنت حیدرآباد سے هے۔ غفران مآب حضور نظام علی خان مرحوم حضور شجاع الملك بسالت جنگ مرحوم ،۔ نواب رکن الدوله مرحوم ،۔ اعظم الامرا نواب ارسطو جاه مرحوم ،۔ میر عالم علی مرحوم وغیره اکابر حیدرآباد که بهت سارے خطوط میری نظر سے گزرے۔ اس قدر وقت نهیں تها که سارے خطوط کا بعد ترتیب مطالعه کیا جاتا۔ توقع هے که مستقبل قریب میں یه سارے خطوط بعد ترتیب و تهذیب شایع هوجائینگے۔ لیکن فی الوقت مجله عثمانیه کی اس اشاعت میں چند خطوط واسناد تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعه کے لئے پیش کئے جاتے هیں۔

عنایت نامجات حضور غفران مآب
نواب میر نظام علی خان

لفافہ پر حسب ذیل القاب لکھنے کا التزام تھا :—

"امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت عزیز القدر عمدۃ الملک سراج الدولہ انور الدین خان بہادر منصور جنگ"

یہ خطاب و القاب نواب محمد علی خان والا جاہ بہادر کے لئے مستعمل تھا۔

سارے خطوط پر "نظام الملک آصف جاہ سنہ ۱۱۷۵" کی "مہر خورد" ثبت ہے۔ اس زمانہ کے دستور کے موافق لفافوں پر مہر کی گئی ہے۔ سارے عنایت نامجات "دستخط خاص" سے مزین ہیں۔ جیسے کہ اس وقت قاعدہ تھا دستخط کے لئے کوئی خاص نشان اختیار کرلیا جاتا تھا، ان عنایت ناموں میں بھی "دستخط خاص" کے لئے ایک مخصوص نشان اختیار فرمایا گیا ہے۔ کاغذ افشان زدہ ہے۔

(۱) عنایت نامہ جو ۱۹ ذی حجہ سنہ ۱۱۷۵ ھ کو ترچنا پلی میں وصول ہوا۔

تقریبا ہر عنایت نامہ کا آغاز "ہو الکریم" سے ہے جو سر نامہ پر تحریر ہے اس کے نیچے وہی القاب درج ہوئے ہیں جو لفافہ پر مرقوم ہیں۔

"نظیر بر خلوص عقیدت وصدق ارادت آن عزیز القدر کہ بہ تخصیص دریں جناب متحقق است از سابق مقرر فرمودہ ایم کہ جواب سوال امورات آن ملک بے وساطت آن عزیز القدر بمیان نیاید۔ لہذا بعضے

مراتب به شهامت و بسالت مرتبت سمو المکان موالات نشان، راج راجندر راجه تهلداس بهادر .... ارشاد گشته مفصل از نوشته، راجه مشار الیه و سیادت پناه میر مرتضی خان مطلع شده درآنچه صلاح دولت باشد بعمل باید آورد۔ زیاده چه نوشته شود،،

---

(۲) عنایت نامه جو ۲۱ شعبان سنه ۱۱۷۶ھ کو قلعه ایلوره میں وصول ہوا۔
بعد القاب معمولی ۔

،، حسین علی خان مبلغ خطیر بقایائے سرکار راجمندری وغیره بذمه خود باقی داشته بچناپٹن (مدراس) رفته در پناه انگریز نشسته می خواست، کسان انگریز همراه آورده در سرکار راجمندری وغیره خلل انداز شود چنانچه شهامت و جلادت دستگاه جارجی پیکٹ گورندور چناپٹن (جارج پیکٹ گورنر مدراس) بر طبق حکم حضور، مقتضائے صدق ارادت، دست ازاین خیال بر داشته، و سرکارات مذکور از حضور بمیر بدیع الزمان خان تفویض یافته اما کسان مشار الیه بعلت وجه اخراجات شبندی در راجمندری برائے دخل تعرض دارند و این معنی از شیوه راستی و درستی انگریزان خیلے مستبعد نمود اگر خان مذکور قرار اخراجات کرده باشد از و تقاضا نمایند۔ بے دست آویز حضور مزاحمت در تعلقه سرکار چه لازم۔ لهذا گورندور را باید فهمایند که به نائب بند رمچھلی پٹن تاکید بنویسند که کسان خود را بر داشته به هیچ وجه مزاهم نشوند و به همه وجوه ممد و معاون عامل منصوب باشند۔ زیاده چه نوشته شود ایام بکام باد ۔

(۳) ۔ عنایت نامہ جو ۸ شوال سنہ ۱۱۷۸ھ کو میر اخوی خان کی وساطت سے مدراس میں وصول ہوا

بعد القاب معمولی ۔

,, حقوق عنایات و احسان‌هائے متکاثرہ نواب صاحب قبلہ مغفرت مآب (حضور آصف جاہ اول) کہ بحال والد ماجدان شہامت مرتبت در جمیع اوقات و احوال بر سبیل تزاید و ترقی جلوہ آرائے شہود بودہ بر وضیع و شریف عالمیان مستحق و مستغنی از بینہ و برہان است وہم چنین خلوص عقیدت و صفائے طویت و ثبات و قدم بر صراط مستقیم انقیاد و صداقت و تقدیم خدمات و جان بازیہا تادم واپسین ازان طرف متیقن و متفق جمہور انام و بے نیاز از شرح و بیان بودہ۔ نظر بر تحقق این مراتب و مصداق کلام صدق انجام الولد سر لابیہ چشم داشت ظہور اخلاص و اطاعت و پاس مراسم دولت خواہی و فدویت ازان بسالت منزلت بر سبیل توارث و تفاعف بودہ و بفضل الٰہی ہست لیکن در چشم بصیرت اصحاب عقل و ذکا و خود قرائن وآثار رادر اثبات مضمرات باطن دخل کلی یست..... ازان خلف الصدق دودمان صدق و صفا درین امر واجب الادا توقف مفرط بمعرض وتوع آمدہ حتی موجب تامل خاطر حق مظاہر ماکہ پیوستہ در صدد بذل عنایات روز افزون است گشتہ خصوص درین وقت کہ موکب جاہ و جلال با افواج بحر امواج باین قرب مسافت رسیدہ عدم ارسال عرایض و اطلاع روداد و حقایق تعجب بر تعجب افزودہ لهذا برائے اظہار بعضے مراتب و دریافت مکنونات باطن عقیدت مواطن ان خلت منزلت خان سیادت دعوایی نشان

سید رضوی خان را روانه چوب کرده شد که بابلاغ مدارج تفصلات بیکران بیان فواید و منافع تقدیم اخلاص و خدمات نمایان پردازند مجدد گلشن صدق فدویت و دولت خواهی را آب و رنگ طراوت انضارت بر روے کار آید احسن کما احسن الله الیک

نواب والا جاه بہادر نے اسکے جواب میں جو عریضہ ارسال کیا اس کا صاف شده مسوده ایك افشانی مطلا کاغذ پر موجود ہے اسکے سرنامہ پر درج ہے کہ

بیستم شهر شوال سنه ۱۱۷۸ ھ وقت شب مہر شده حواله میر مرتضی خان شد۔ به همین مضمون بنام رکن الدوله و شیر جنگ بہادر نوشتہ جات روانه گردید

مد کھینچ کر عریضہ اسطرح لکھا گیا ہے:—

وو عنایت نامه تفضل آمود...... این که حقوق عنایات متکاثره حضرت مغفرت ماب بر والد...... در جمع اوقات بر سبیل تزاید جاوه آرائے شهود بوده دهم چنین خلوص عقیدت و صفای طویت و تقدیم خدمات وجان بازی‌ها تادم واپسین از طرف والد احقر بظهور رسیده و نظر بمصداق کلام صدق انجام الولد سرّ لابیه چشم داشت مراسم دولت خواهی و فدویت از بنده بر سبیل توارث مر تضاعف بوره و هست لاکن در چشم بصیرت اصحاب عقل وذکا ازین عقیدت مند درین امر واجب الادا توقف مفرط بوقوع آمده خصوص درین وقت که موکب جاه وجلال بمافت قریب نزول فرموده عدم رسیدن عرایض واطلاع روداد وحقایق تعجب بر تعجب افزود هشتم شهرالمکرم بمصاحبت سید رضوی خان ورود فرموده معزز و ممتاز ساخت و مضمون

عنایت مشحون و ارشاد محوله زبانی خان مشارالیه مفصل در یافت ۔ احقر را بهمه وجوه حتی المقدور سعی افزونی دولت خواهی آن جناب که مقصود دائمی است متحقق و سابق از همه پیشتر بار سال عرایض .... باحضور عطوفت گنجور پیشتر از چند ماه که محور قصور گردیده وجهش مشروحاً از اظهار خان موی الیه بعرض خواهد در آید ۔ بنا بر معرض داشتن حقایق ارشاد شده احوال این جا این است که فرانسیس از روی اسناد دکن همه ملک را از کنار کشنا گرفته تا دریائے شور متصرف بود و کسانیکه تفضل بسیار بر او کردند اگر فائده خود و حرص وافر قوم مذکور ملاحظه می نمودند این قدر توجه بماش نمی فرمودند دراستخلاص این ملک از دست فرانسیس و گرفتن انتقام حضرت نواب شهید (۱) و والد شهید رحمتہ اللہ علیہما محنت و مشقتے کہ از هفتده سال بر خود اختیار کرده وکرورها را از انگریزان و دیگر ساهوکاران وغیره قرض سودی کشیده صرف این کار نموده احتیاج به تشریح ندارد وهنوز وجه سود هم ادا نشده تا باصل چه رسد و ملک از اتفاق محاربات دوام هفتده ساله بالکل ویران .... گردیده مع هذا قلعے که تحصیل می شود باداى سود قرض خواهان واخرجات سربندی هر اهی کفایت نمی کند تدارک مهام معروضه و قوام دین اسلام درین ملک از پیشگاه تفضلات توقع انواع تحسین و آفرین بخاطر نیاز مآثر درشت و دار د لاکن بر طبق تمنائے احقر نوازش و عطیات آن جناب در نظر مردم ظاهر بین جلوه پذیر نشد مفصل زبانی سید رضوی خان و میر مرتضی خان

---

(۱) حضور ناصر جنگ شهید ۱۲

بعرض خواهد د رآمد - الحال که تفصلات بے غایات ملازمان بر احوال خود بدستور سابق یقین خاطر شده آینده به ترسیل عرایض و پا سراری مزاج مبارک مرتکب اهمال نخواهد گردید - مراتب اعتقاد و رسوخیت و دولت خواهی بنده انقدر است که ملازمان جناب در درستی و درستی ان هیچ شك و شبه بخاطر مبارك نخواهند داشت - امیدوار فضل وکرم که ازحدور عنایت نامجات سرمایه اندوزاعزاز و مباهات باشد - زیاده مدارب افتاب دولت و اقبال تابان باد ،، -

---

۲۳ شوال سنه ۱۱۸۱ ھ کو نواب والا جاه بهادر کے حسب خواهش ان فرزند کے نام سندالتمغا عنایت هوی اس کے متعلق بعض ضروری کی اشاعت دلچسپی سے خالی نہیں - پہلے اصلی سند کی مقدمه نقل ذیل میں نقل کی جاتی ہے -

،، نقل سندالتمغا بمهر و دستخط نواب آصف جاه نظام الدوله بهادر و مهر ۰۰۰۰۰۰۰ رکن الدوله مدارالمهام ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

قراربتاریخ ۲۳ شوال سنه ۱۱۸۱ ھ آنکه درین ولا تمامی تعلقه کرناٹك بالاگهاٹ که از ابتدا متعلقه حیدر آباد بود و از بالاگهاٹ که از ابتدا بابت صوبه داری بیجاپور متعلق بود جدا د متفرق هست معه کرناٹك پایان گهاٹ در و بست ازکنار دریائے کشنا تا آخر سرحد ملك ملیوار معه دیوانی و بخشی گری و میر اتشی پایان گهاٹ وبالاگهاٹ مذکور - و همگی تلاغ وجاگیر داران و زمینداران و پالکاران وتعلقه داران وانعام داران و روزینه داران وغیره بهمه جهت در وبست بلاشرط و شراکت ومداخات آمدے دروجه انعاالتمغ امارت و ایالت حشمت و شرکت منزلت عمدة الامرا معین الملك اسدالدوله

حسین علی خان ذو الفقار جنگ مطابق فرمان والا شان و سند نواب آصف الدوله
صلابت جنگ مرحوم حسب الضمن مقرر و مفوض گشته باید که فرزندان
برادران کام گار جانشین این جانب و کرام و متصدیان نظامت دکن متکفلان
معاملات نو دکهن حال و استقبال مطابق فرمان و سند این جانب ابدا
مو بدا در استقرار و استمرار این مراتب کوشیده تعلقات مذبوره بتصرف
امارت و ایالت مرتبت مسطور نسلا بعد نسل و بطنا بعد بطن وا گزارند و
از حوادم تغیر و تبدل معون و محروس دانسته بعلت پیشکش صوبه داری و
فوجداری و جمیع ابواب ما بوجهات و اخرجات وغیره بوجهی من الوجوه
مزاحم و منصرض نشوند و توقیر کل تکالیف دیوانی وغیره معاف و مرفوع القلم
شمارند دریں بابت تاکید اکید دانسته هر سال سند مجدد نه طلبند و از
مراتب مرقوم الصدر اصلا تخلف و انحراف نو زند تحریر فی التاریخ ـــ،،

واضع هو که یه سند سنه $\frac{\text{۱۷۶۷ع}}{\text{۱۱۸۱ھ}}$ کی جنگ ترناوی کے بعد عطا هوئی هے
جو پہلی جنگ میسور شمار هوتی هے اس جنگ میں نواب حیدر علی خان ـ حضور نظام علی خان
اور مرهٹے ایك طرف اور انگریز یا نواب محمد علی خان والاجاه ایك طرف تھے
جنگ میں نواب حیدر علی خان کو شکست هوئی تهی ـ بعد از ان نواب والا جاه بهادر
کی کوشش سے حضور نظام علی خان اور انگریزوں میں صلح و آشتی طے پائی اور
معاهده مرتب هوا ـ اس معاهده کی بناء پر سند مذکور عطا هوئی ـ

معلوم هوتا هے که نواب والا جاه بهادر نے اصلی سند آنے کے بعد
سارے کاغذات متعلقه کی مصدقه نقلیں بهی حاصل کیں چنانچه اس وقت جو نقل مصدقه
پیش نظر هے اس پر ،، مطابق است ،، مرقوم هے اور ،، خادم شرع شریف قاضی

حمیدالدین احمد ،، کی ,, مہر کلاں ،، ثبت ہے ۔ پشت پر ,, ضمن ،، یا ,, کیفیت ،، درج ہے جس کے آخیر میں ,, شرح دستخط خاص سند بد ہند ،، کے الفاظ موجود ہیں اطراف کاغذ پر ,, داخل سیاہیه حضور شد ،، ,, نقل بد فتر استسفا رسید ،، ,, مہر رکن‌الدوله بتاریخ ۲۳ شوال سنه ۱۱۸۱ ھ ثبت شد ،، نقل بدفتر دیوانی رسید ،، مرقوم ہے۔

واضح ہو کہ خود دفتر والاجاہی میں اس سند کا مسودہ تیار ہوا بعد ازاں اسکو گورنر مدراس کے پاس راوانه کیا گیا۔ مسٹر رچرڈ بوچر اس زمانه میں گورنر تھے۔ ان کے ملاحظه کے لئے جو مسودہ راونه کیا گیا اس پر درج ہے که

,, نقل این مسودہ حواله رکن الدوله بہادر
روبروے صاحب زادہ پنجم شوال سنه ۱۱۸۱ ھ ،،

اس مسودے میں ملك کا نام صرف اس قدر درج ہے۔
تمائی تعلقه کرناٹك پائین گھاٹ و بالا گھاٹ ،،

لیکن گورنر مدراس نے اس کو پسند نہیں کیا اور اس حصه مسودہ کو قلم‌زد کر کے خود ایك علیحدہ کاغذ پر اس کا مسودہ کیا ہے۔ اس کاغذ پر جو ساختهٔ ولایت ہے۔ حسب ذیل عبارت درج ہے۔

,, کاغذ انگریزی نوشته گورنر مسٹر بوچر ،، گورنر مدراس کا مسودہ یوں ہے۔

,, کرناٹك بالا گھاٹ که ازابتدا متعلقه
حیدرآباد بود و از بالا گھاٹ که از
ابتدا بابت صوبه داری بچھا ہوا متعلق

بو د جدا د متفریق هست معه کر نا ٹك
پایان گھاٹ د ر و بست تا اخیر سر حد
ملك ملیوا ر ،،

اس فارسی عبارت کے نیچے اس کا انگریزی میں تر جمه بهی کیا گیا ھے ۔ دفتر والا جا ھی میں اس جدید مسود ہ کے لحاظ سے پھر ایك علحدہ مسود ہ صاف کیا گیا اور اسکو پھر مع سابقه کاغذات کے گورنر مدراس کے پاس روانه کیا گیا ھے ۔ چنانچه اس پر مسٹر اسٹریسی نے اپنے دستخط کئے ھیں ۔مسٹر اسٹریسی کمپنی کے دفتر میں مترجم تھے ۔ مسٹر اسٹریسی نے اس کاغذ پر کالی سیاھی سے لکھا ھے که ۔

،، استریسی دید ،،

البته اس مسود ہ میں پھر ،، از کنار دریائے کشنا ،، کی اصلاح کی گئی ھے ۔ اور گورنر مدراس کے سابقه مسود ہ میں بھی ان الفاظ کا اضافه سیاھی سے کر دیا گیا ھے ان مراحل کے طے ھونے کے بعد مسود ہ نواب رکن الدوله بہادر کے سپرد کیا گیا جو مدراس آئے تھے ۔ وہ اسکو لیکر لشکر گاہ آصفی میں واپس آئے اور مراتب ضروری کی تکمیل کے بعد سند مرتب اور نواب والا جاہ کی خدمت میں روانه کی گئی ۔

واضح ھو که گورنر مدراس نے اپنے بھائی جیمس بوچر کو لشکر آصفی میں وکیل بنا کر روانه کیا تھا۔ ساته ھی مسٹر اسٹریسی اور مسٹر ،، لتیم ،، بھی روانه کئے گئے تھے ۔ ان لوگوں نے روشن الدوله اعتبار الملك بہادر کرنل جان کال کی وساطت سے حصول سند کے متعلق جو عرائض نواب والا جاہ بہادر کو روانه کئے ھیں وہ یه ھیں ۔

خط کرنل کال

(الف) لفافه پر حسب ذیل مہر ثبت ہیں۔

"روشن الدوله اعتبار الملك بہادر جان کال"، خط کے سرنامه پر "ہی"، درج ہیں۔

"نواب صاحب قبله خداوندگان فیاض عالم و عالمیان مدظله العالی الحال خط مسٹر جیمس بوچر مرقوم شانزدہم معه انگریزی رسید دران نوشته‌اند که کاغذیکه آن فدایگان مستدعی شده بودند از ناظم دکهن حاصل نموده و توقع دارد که در معدود دالایام امورات دیگرهم منقع خواهد شد چراکه اوشان از ناظم مذکور به تقید گفتند درصورتیکه ایشان به چستی زیاده کارگزار نه بوده و اعتماد بر انگریزان ندارند فوج مایان فی الفور بطرف کرناٹك روانه خواهد شد. چنانچه ناظم مذکور در جواب این کلمات جواب از مهربانی دادند تفصیل ان فردا به نیازمند خواهد رسیدان وقت بآن خدایگان اطلاع داده خواهد شد خطوط شکر بنام نابی که ملفوف نیازنامه فرستاده شد از ان خوش خبران فیض رسان دریافت خواهد گردید زیاده چه نماید۔"

(ب) خط جیمس بوچر۔

نواب صاحب خدایگان فیاض زمان امیدگاه نیازمندان سمه الله تعالی۔

دو قطعه عنایت نامه مکرمت سمامه مرقوم هشتم ذیحجه سنه ۱۱۸۰ ه وصول فرحت شمول آورده مسرور ساخت مطابق مسوده نواب صاحب

سند التمغا حاصل گردید چنانچه، در خدمت گزراینده خواهد شد باقی
کوایف بعد هوں ملازمت که به فضل الهی در عرصه قلیل الایام میر
خواهد شد اظهار خدمت گرامی مرتبت نموده خواهد گشت تا حصول ملاقات
فرحت ایات پیوسته به ترقیم نوازش نامجات مسرور می فرموده باشند
زیاده چه بر طراز و آفتاب عمر و دولت مدام تابان درخشان با دهرب العباد،،

لفافه خط پر جو مهر ثبت هے وه محو هو گئی هے۔

(ج) خط مسٹر اسٹریسی۔

اس خط کی عبارت بعینه وهی هے جو مسٹر جمس بوچر کی هے لفافه هر حسب ذیل مهر ثبت هے۔

،، مستر ید وردا سٹریسی مترجم۔

فارسی کمپنی انگلیس سنه ۱۷٦۷ عیسوی،،۔

(د) خط ،، مستر لیستم ......،،

نواب صاحب قبله فیض رسان عالمیان امیدگاه جهانپناه دام الله ظلال اقباله۔

آداب تسلیمات و کورنشات ......بجا

آورده بموقف عرض باریابان بارگاه خلایق پناه می رساند قبل ازیں
دو قطعه عرایض نیاز متضمن فحاوی این نواحی یکے از معرفت نتاننند و دویم
معحوب مردم .... ارسال حضور فیض گنجور ساخته یقین که بفضل الهی
از روی ان کماهی کوایف منظور نظر کرم مظهر خواهد شد۔ دی روز که تاریخ
شانزدهم ذی حجه، بود مستر جیمس بوچر و مستر استریسی و نیازمند نزد
رکن الدوله بهادر رفته بودیم بنا بر نوشته دادن اسناد التمغا مطابق
مسودهاے بندگان عالی که در تحویل مستر استریسی است ذکر داد کار در پیش آمد
آنچه رکن الدوله فرمودند که اسناد مذکو رفردا تیار کرد اینده محاذیم

امید در جناب الهی است کہ زود حاصل خواهد شد زیاده جمعیت و دولت وصحت وعافیت فتح و نصرت حاضر رکاب باد۔

مکرر معرض آنکه امروز بوقت شام سند التمغا بکرم الهی رسید چنانچه مستر استریسی در عرضداشت خود ملفوف آن جناب کرده اند از نظر مبارك خواهد گزشت یکے از دولت خواهان صادق محمد خواهنده قادری آداب تسلیمات وکورنشات بجامی آرد،،۔

نواب الدوله جاه بهادر نے سند حاصل هونے کے بعد ایك سو ایك اشرفی نذرگزرانی اور عرضداشت روانه کیا جوجواب صادر هوا وه یه هے۔

,, خطمرسله با یکصد و یك اشرفی نذر و ورود سند التمغا رسید و مضامین ارادت صداقت مقرون که مثمر برکات روزافزون است واسطۂ وفور وسرور خاطرگردید بفضل الهی ازیں خاندان دولت نشان عموما در حق ادنا واعلی ورائی تفضلات وپرورش بعرصۂ ظهورنیامده اگر احیاناً کسے بمقتضائے شامت ایام عار نمك حرامی بر خود اختیار کرده جاده پیمائے دشت ادبار گشته بسزائے کردار ناهنجار رسیده مجدد باندك زمان رهگزائے اطاعت شده به تخصیص آن عزیز القدر که از ابتد ناهج مناهج دولت خواهی و خواهان صولت وسطوت سرکار اند هرآئینه مستوجب عنایات اخص الخواص حضور هستند۔ هر قدر عنایات مبذول شود محل استعجاب نیست۔ حاضر بودن جمعیت خود وانگریزان باطراف نیابر پاداش خیره سرآن درجه استحسان یافت۔ بعون افضال ایزدی از بدو تنظیم و تنسیق مهام ریاست تا الی‌الان احدے از مفسدان

طاقت اطراف از حکم حضور نیافته بر صراط مستقیم فدویت و اطاعت استقامت ورزیده و دریں دلا معاملات پیشکش حیدرعلی خان بهادر نوے که انفعال شده و پسر بهادر مذکور حصول ملازمت نموده رخصت شده از بس اشکار محتاج تشریح نیست و بفضله هم عنان نصرت و اقبال معاودت بعمل آمد. الحال مهیا و متفریق داشتن جمعیت با ماکن مرقومه ضرور نیست. معروض مقدمات هلاح دولت را موجب استرخاۓ حضور دانسته به هیچ وجه مقصر نباید بود زیاده چه نوشته شود»

ترک شعر

از

جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی یم۔ اے (عثمانیہ)

بند کرتا ہوں دکاں اے قدرداں اب الوداع تیری خاطر میں سمندر سے گہر لایا کیا

تیرا احسان مانتا ہوں اے میرے جوہر شناس لیکن اس جوہر فروشی سے مجھے کیا مل گیا

عالم امکاں میں لاکھوں ہیں بیابان و چمن

ایک کٹھن وادی ہے اب اس سے گزرنا ہے مجھے

کیا جواب آخر میں دونگا کل کسی کے روبرو ڈگمگا جائے اگر اس راہ میں پاؤں میرا

دست و پا شل ہو گئے ہیں گم ہوئی پرواز روح بار دنیا سر پر ہے سیر چمن کا ذکر کیا

عرش آزادی پہ کی پرواز تو اب تک بہت

خارزار پائے بندی میں بھی ہے جانا مجھے

اب تلک میں خود رہا عالم پہ اک بار گراں اب اجازت دے کہ کردوں اسکا کفارہ ادا

ہو رہا ہوں آشنائے لذت تلخاب دھر اب مزہ جاتا رہا شیرینی گفتار کا

اب تو وہ ہمدم نہیں شاعر نہیں رشدی نہیں

خودغرض، دنیاطلب، مزدور بننا ہے مجھے

جواب قدرداں

از

جناب عمر بن صالح صاحب وفا

کس طرح روکوں تجھے جاتے ہوئے اے غمگسار
ہوں تہی دامن تیری مشکل میں کام اونگا کیا

میرا احسان ؟ کاش میں احسان ھی کر سکتا کوئی
کاش تیری گوھر افشانی کا دے سکتا صلہ

عالم امکاں میں بے شك ھے بیابان و چمن
کون سی وادی ھے اب جس سے گذرنا ھے تجھے

وہ کٹھن وادی اگر ھے خارزار رنگ و بو
وہ کٹھن وادی اگر ھے امتحان گاہ وفا

وہ کٹھن وادی اگر ھے منظر صبرو سکون
وہ کٹھن وادی اگر ھے منزل راہ وفا

پھر تو اے وارفتۂ غم جا آسے بھی دیکھہ آ
گر بہ ھر عنوان بگڑ ھی کر سنورنا ھے تجھے

تجھکو کیا فکر جواب اخرت ھے میرے دوست
پرسش ایزد کے قابل ھی نہیں عصیاں تیرا

تیری صورت سے نمایاں ہے تیری مجبوریاں
اس کو اپنے جبر کا ہوگا نہ کچھ احساس کیا؟

اے میں قرباں یہ طلسم زندگی کے دام ہیں
ان سے بچ کر ہی ابھی پرواز کرنا ہے تجھے

فرض کرتا ہوں کہ تو عالم پہ ہے بار گراں
مان لیتا ہوں کہ تجھ پر تنگ ہے ارض و سما
کیا مگر یہ کج ادا عالم نہیں ہے تجھ پر بار
کیا تیری تقریب میں اس کا نہیں ہے مشورہ

زندگی تیری ہے گویا موجۂ اب رواں
ہر نفس سو بار مٹ مٹ کر ابھرنا ہے تجھے

ساز ہستی کی خموشی کیوں نہو غم آفریں
تشنۂ مضراب ہوں پھر چھیڑ دے مجھکو ذرا
پھر گہر ہائے مضامین سے میرے داماں کو بھر
پھر میری خاطر سمندر سے در نایاب لا

تو وہی شاعر، وہی ہمدم، وہی رشدی ہے تو
تابش فکر سخن ہی سے نکھرنا ہے تجھے

ولی کی غیر مطبوعہ غزل

از

جناب خواجہ محمد احمد صاحب یم۔ اے۔ ال ال، بی (عثمانیہ)

مجھ سے مکرمی مولوی سید حبیب اللہ شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ موصوف کے پاس کلیات ولی کا جو قلمی نسخہ ہے اسکے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروں۔

اس نسخے پر اسکی تحریر کی تاریخ اور کاتب کا نام نہیں ہے اس وجہ سے اس کا صحیح اندازہ لگانا کہ یہ کب ضبط تحریر میں آیا نہایت دشوار ہے، لیکن کاغذ۔ سیاھی اور رسم الخط سے ظاھر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کم از کم ایک صدی قبل لکھا گیا ہے۔ کاغذ پر ازافشاں ہے اور جدول طلائی ہے، خط صاف اور اچھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں دوسرے نسخوں سے اس کا مقابلہ کرنے پر زیادہ وقت صرف نہ کرسکا۔ انجمن ترقی اردو کی طبع کی ہوئی کلیات سے اس کا میں نے سرسری مقابلہ کیا اور دو باتیں میں نے اس میں خاص پائیں ایک تو یہ کہ بعض جگہ پر اس میں ان نسخوں سے جو کلیات کی طباعت کے وقت پیش نظر تھے جو اختلاف ہے اس سے وہ اشعار جو ابھی تک بے معنی خیال کئے جا سکتے تھے اب با معنی ہو جاتے ہیں اور اکثر اشعار میں معنی کی خوبی اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نسخے میں چند وہ اشعار یا غزلیں نہیں ملتیں جو مطبوعہ کلیات میں ہیں۔ لیکن اس میں اکثر ایسے اشعار ہیں جو صرف ایک یا دو نسخوں میں ملتے ہیں۔ مجھے اس میں ایک پوری غزل ایسی ملی ہے جس کا ولی کے مطبوعہ کلام میں پتہ نہیں اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

سیر ہے باغ ہے نظارہ ہے   سبزہ ہے لالہ ہے ہزارا ہے

کان میں یار کی دروبالی   مہر ہے ماہ ہے ستارہ ہے

بات کے بیچ ساز مطرب کی   بین ہے چنگ ہے دوتارا ہے

نگہ شوخ و قاتل خونخوار   سیف ہے، بانک ہے، دودھارا ہے

آتو آغوش میں حجاب نہ کر   گوشہ ہے رات ہے اندھارا ہے

ملک دل کی خرابی کرتے کون   شاہ ہے فوج ہے نقارا ہے

مجکوں ہر دم ولی فراق مستی   آہ ہے نالہ ہے پکارا ہے

کیا عجب ہے کہ جن حضرات کو ولی کے کلام سے زیادہ دلچسپی ہے اس قسم کے مزید اشعار یا غزلیں ملجائیں۔ اور ان سے ولی کے کلام پر مزید روشنی پڑ سکے۔

,,خود اپنے کو نہ پہچانا مگر نا آشنا بنکر،،

از

سرتاج

پریشان خاطری دیکھی خم زلف دوتا بن کر کبھی آسودگی پائی دل بے مدعا بن کر

کبھی سینہ زمین کا چیر کر تحت الثریٰ پہونچا کبھی اوج فلک دیکھا یتیموں کی دعا بن کر

بحالت کی حقیقت آئینہ صورت نظر آئی جو دل کا حوصلہ دیکھا کبھی دست عطا بن کر

حق و باطل کو دیکھا بن کے محور وئے دھریت کبھی مندر میں بت اور گاہ مسجد میں خدا بن کر

حیات و موت کی ہر طرح کیں آگاھیاں حاصل کبھی خضر بیابان گاہ تصویر قضا بن کر

وجود ھستی معبود کی شان بقا دیکھی چمن زار جہاں میں موج سیلاب فنا بن کر

زباں سوسن کی ہو کر سن لیا افسانۂ ھستی زوال حسن دیکھا چشم نرگس کی ادا بن کر

زلیخا کی نظر سے حسن کی تاثیر پہچانی ضمیر پاک دامن جسم یوسف کی قبا بن کر

حقیقت جزو و کل کی دیکھ لی سچے خیالوں میں خود اپنے کو نہ پہچانا مگر نا آشنا بن کر

سراب حیات

از

جناب محمد بدر الدین خان صاحب شکیب بی۔ اے (عثمانیہ)

زندگانی! آہ! یہ مایوسیاں
ایک دل اور سیکڑوں مجبوریاں

عشق کی دنیا ہے اک رنگین خواب
اک طلسم آرزو حسن و شباب

ہے ہوس اک بحر ناپیدا کنار
اور مسرت گل پہ شبنم کی بہار

لالہ و گل موت کی تفسیر ہیں
اور بہاریں خود خزاں تعمیر ہیں

ذرہ ذرہ دہر کا ناپائدار
زندگانی کا نہیں کچھ اعتبار

عالم حسرت میں جاں خاموش ہے
بیکسی سے زیست ہم آغوش ہے

ہاں! مسرت دہر میں ناپید ہے
زندگی موہوم سی امید ہے

خطبہ صدارت

از

جناب اغا جعفر حسن صاحب متعلم ال ال۔ بی صدر انجمن اتحاد

جناب صدر و معزز حاضرین

میں زیر بار احسان ہوں کہ آپ نے مجھ ایسے حقیر کو اس منصب جلیل سے سرفراز فرما کر اپنی ذرہ نوازی کا ثبوت دیا۔ ناچیز ہدیہ شکر قبول فرمائے۔ خدا میرے کمزور بازوں میں قوت دے کہ ان توقعات کو پایہ تکمیل تک پہونچا سکوں جو آپ نے مجھسے انجمن اتحاد کی خدمت گذاری کے لئے منتخب فرماتے وقت وابستہ کی ہونگی۔

حضرات! انجمن اتحاد کے مقاصد اور اسکی اہمیت کا ذکر ایک رسم کہنہ ہے لیکن جب میں اس افسوس ناک حقیقت کا احساس کرتا ہوں کہ ہماری انجمن تا حال وہ توجہ اور وابستگی حاصل نہیں کر سکی، جسکی وہ مستحق ہے تو میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ ایک مرتبہ پھر اس داستان پارنیہ کو آپ کے گوش گذار کروں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ کسی جامعہ کا نصاب تعلیم خواہ کیسا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ انجمن اتحاد ہی ایسا ادارہ ہے جو فطری ذوق آگاہی کی تکمیل کے لئے میدان مہیا کرتا ہے۔ یہاں آپ آزادی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کچھ اپنی کہئے گا کچھ دوسرونکی سنئے گا اس طرح نہ صرف کرید اور تجسس کی عادت پیدا ہوگی جو حیات انسانی کا نصب العین ہے بلکہ جب آپ عملی دنیا میں قدم رکھینگے تو آپ

ایك اهل الرائے اور جامع انسان هونگے اور یه اپنی قدر و قیمت میں درسگاهوں کی آعلی ترین عملی اسناد سے بهی زیاده بلند هے ۔ انجمن اتحاد کا وجود اس امر کا ثبوت هے که همارا اخلاقی عملی اور تمدنی اتقا کا احساس زنده هے اس میں شك نهیں که هماری مادر علمیه نے ملکی زبان کو ذریعه تعلیم قرار دیکر خوابیده هندوسان کے آگے ایك قابل تقلید مثال پیش کی اور به آواز بلند پکار دیا ۔

کرمك نادان طواف شمع سے آزاد هو

اپنی فَطرت کی تجلی زار میں آباد هو

همارا نصاب تعلیم اعلی هے ، همارے امتحانات کا معیار بلند هے لیکن میں افسوس کے ساته اعتراف کرنے پر مجبور هوں که هم وه و قعت و منزلت اور هر دلعزیزی حاصل نه کرسکے جو اس اصلاح یافته یونیورسٹی کی بنیاد قائم کرنے والونکے پیش نظر تهی ۔ ممکن هے اسکی وجه یه هے که مست و مدهوش هندوستان هنوز بیدار نهیں هوا هے ، ممکن هے اسکی وجه یه هے که بیگانه نگاهیں انصاف کرنے کے لئے تیار نهیں هیں لیکن اس کی ایك وجه یه بهی که همنے درسی تعلیم کے علاوه طالب علمانه زندگی کے دیگر مشاغل میں کما حقه دلچسپی نهیں لی ۔ یهی سبب هے که جب هم عملی زندگی متلاطم سمندر میں قدم رکهتے هیں تو همیں محسوس هوتا که ساحل تك پهونچانے کے لئے همارے ٹهوس فنی معلومات کافی نهیں هیں ۔ برادران کلیه انجمن اتحاد آپ کی خدمت گزاری کے لئے موجود هے ، آئے اپنی کمزوریوں کو دور کیجئے اپنی قوتوں کو ترقی دیجئے تاکه جب آپ کالج کی چار دیواری سے باهر نکلیں تو دنیا کے سامنے مکمل انسان کا نمونه لیکر جائیں ۔

اس زمانه میں جب که هندوستان فرقهواری احساسات کے افسوس ناك دور سے گذر رها هے ۔ میں آپ کی خدمت میں ایك پیام عمل پیش کرنا چاهتا هوں ۔ وه یه

یہ ہے کہ ان مانع ترقی امتیازات کو دور کرکے ایک روح ایک قالب بن جائے اور انصاف کو اپنا نصب العین قرار دیجئے ، انصاف اپنی ذات کے ساتھہ اور انصاف غیرِ ذات کے ساتھہ اگر آپ نے انصاف کو اپنا زلایحۂ عمل قرار دے لیا تو پھر تمام امتیازات خود بخود اٹھہ جائنگے ۔ من و تو کی بحث باقی ھی نہیں رھیگی ۔ اس وقت باھم فرق کرنا ھی مشکل ھوگا کہ کون کیا ھے ۔ اس کیفیت کا ھمارے ملک کے مایہ ناز شاعر علامہ اقبال نے بڑی خوبی سے نقشہ کھینچا ھے ۔

زاھد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ھے مسلمان ھوں میں

اپنے دل مین اس تمام احترام اور ارادت کو برقرار رکھتے ھوئے جس کے علامہ اقبال ایک بلند پایہ شاعر ھونے کی حیثیت سے مستحق ھیں ، میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرونگا کہ مساوات اور اخوت کی منزل تک پھونچنے کے لئے ھمیں ایک درجہ اور طے کرنا ھے جب کہ زاھد تنگ نظر مجھے کافر نہیں بلکہ زاھد سمجھیگا اور کافر تنگ نظر مجھے مسلمان نہیں بلکہ کافر خیال کریگا ۔ اصل تو یوں ھے کہ زاھد و کافر کی تقسیم میں خود دوئی کی بو ھے ۔ ھمیں نہ زاھد کی ضرورت ھے ، نہ کافر سے سروکار ھم اپنے دامن میں زندگی کا شرارہ رکھنے والے ھندوستانی چاھتے ھیں جن کے قلب ذات الٰھی اور اس کے شعائر و آثار وقعت و منزلت سے معمور ھوں ۔ ھم کاش فرقہ واری اور جماعتی لحاظات کی تنگ نظری سے بلند ھوکر بنی نوع انسان سے محض انسان کی حیثیت سے محبت کرنا سیکھیں !۔

برادران کلیہ یہ آپ کا کام ھے کہ کامل اتحاد کا نمونہ بنکر دنیا کو پیام اخوت دیجئے ۔ اب مین بہت مختصر الفاظ میں انجمن کی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ اصلاحی تجاویز پیش کرونگا ۔ میری پہلی تجویز جلسون کے اوقات سے متعلق ھے ۔ فی الحال

انجمن کے تمام علمی جلسے سہ پہر میں منعقد کئے جاتے ھیں جبکہ ارکان انجمن دن بھر کی کالج کی تھکن کے باعث آرام کے جویاں ھوتے ھیں اور اکثر جلسوں میں شریک ھونے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اصل یہ ھے کہ اسوقت ان میں وہ شگفتگی اور مستعدی باقی نہیں رھتی کہ مباحثوں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ھو سکیں۔ حضرات یونیورسٹی کی ذاتی عمارات کی عدم موجودگی سے جو تباہ کن اثر طلبا کی معاشرتی اور علمی زندگی پر پڑ رھا ھے وہ محتاج بیان نہیں ھے ۔ خدا کا شکر ھے کہ ھمارے رعایا نواز بادشاہ سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی فیاض منشی کی بدولت یونیورسٹی ٹون کی اسکیم کروڑھا روپیہ کے صرف سے میدان عمل میں لائی جاری ھے ہم نہایت بے چینی کے ساتھ اس مبارک گھڑی کا انتظار کر رھے ھیں جبکہ جامعہ عثمانیہ اپنی علمی بستی میں ھوگی جہاں کی ھر ھر شے طلباء کی معاشرتی اور علمی زندگی کی ضروریات کے مطابق مہیا کی گئی ھوگی۔ حضرات میں یقین دلاتا ھوں کہ طلبائے جامعہ اس مبارک گھڑی کے بے انتہا مشتاق ھیں جو جامعہ عثمانیہ کی زندگی میں ارتقا کے ایك عظیم الشان دور کی پیغامبر ثابت ھوگی۔ اسکی تعمیر و تکمیل میں ایك ایك روز کا وقفہ اور تاخیر ھمارے لئے زھر قاتل کا حکم رکھتی ھے۔ ھماری علمی ترقیوں کے راستہ میں صدھا مشکلات حائل ھیں ھماری معاشرت یکساں نہیں ھے، ھمارے خیالات کا مرکز ایك نہیں ھے ، سیکڑوں غیر علمی کششیں ھمارے خیالات کو اپنی طرف منتقل کرنے کے لئے موجود ھیں ۔

میں چاھتا ھوں کہ اپنی آواز کو جناب صدر آپ کے ذریعہ سے تمام ارباب متعلقہ تك پہونچاؤں ۔

بہرحال یونیورسٹی ٹون کی تعمیر کے بعد جب کہ جامعہ عثمانیہ اقامتی جامعہ ھو جائیگی یہ وقت کا سوال خود بخود مٹ جائیگا، لیکن فی الوقت ارکان انجمن کی سہولت کے مدنظر

مناسب ہو گا کہ اوقات درس میں سے ہر ہفتہ کچھ وقت انجمن کے جلسوں کے لئے دیا جائے - میرے دانست میں ۱۱ بجے سے ایک بجے تک کا وقت بہت موزوں ہو گا میں انتہائی مسرت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ جب سال گذشتہ یہ تحریک پیش ہوئی تو ہمارے علم دوست اور طلبا نواز صدر عالیجناب عبدالرحمن خان صاحب نے اظہار ہمدردی فرمایا میں پھر نہایت ادب کے ساتھ ایک مرتبہ صاحب ممدوح کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں اور مجھے یقیں ہے کہ ہمارے شفیق صدر جن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ علمی مشاغل میں طلبا کی ہر امکانی طور پر حوصلہ افزائی فرمائیں اس خاص دلچسپی کا جو آپ کو انجمن اتحاد کی اصلاح و ترقی سے ہے ایک اور ثبوت مہیا کرنے میں تامل نہیں فرمائیگے -

جناب صدر میں اس موقع پر اعترف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح آپ نے ہر موقع پر ہماری اعانت فرما کر اپنی شفقت اور اثیار کا اظہار فرمایا اس کی خوشگوار یاد ہمارے قلوب پر ہمیشہ منقوش رہیگی - ہم آئندہ بھی آپ سے ہر جائز امداد کی توقع رکھتے ہیں - آپ کی طلبا نوازیوں کی ایک تازہ مثال اس وقت میری پیش نظر ہے - آپ ہی کی انتہک کوشش تھی کہ ہمارے جامعہ کے ہر دلعزیز طالب علم شفیع احمد صاحب کو ہیراکی کی مشق کے لئے ریاست کی جانب سے یورپین اسکالرشپ عطا کیا گیا - اسی سلسلہ میں اور جن جن صاحبوں نے دلچسپی کا اظہار فرمایا ان کی عنایت و مہربانی کو طلبائے جامعہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے -

اسی سلسلہ میں جناب صدر میری ایک عرض اور ہے یعنی یہ کہ یونیورسٹی ٹاؤن کی تعمیر تک جسطرح یونیورسٹی کی دیگر عمارات کے لئے کثیر ماہانہ مصارف برداشت کئے جاتے ہیں وہاں اتنا اور کیا جائے کہ انجمن اتحاد کے لئے جو طلبا کی جسمانی دماغی، علمی

اور معاشرتی اصلاح و ترقی کی اہم ترین آلہ کار ہے کوئی موزوں عمارت مہیا کردیجائے۔ انجمن کو اپنے جلسے منعقد کرنے اور دیگر فرائض انجام دینے میں جو دشواریاں در پیش ہیں وہ جناب صدر آپ سے مخفی نہیں ہیں۔

اب میرا روئے سخن اپنے شفیق اساتزہ کی جانب ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے ہمارے انجمن کے ساتھ بے توجھی برتی۔ میں خوب واقف ہوں کہ جب کبھی کار پردازان انجمن آپ کی خدمت میں اعانت کی درخواست لیکر گئے اکثر اصحاب جنکے اسمائے گرامی میں بخوف طوالت ظاہر نہیں کر رہا ہوں نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہوگئے۔ کابینۂ جدید آپ سے روزافزوں الطاف و عنایات کی توقع رکھتی ہے۔ ہمارے جلسوں میں آپ کی موجودگی موجب حوصلہ افزائی بعد آپ کے مفید و قیمتی خیالات ہمارے لئے شمع ہدایات ہونگے۔

حضرات محل مسرت ہے کہ انجمن اتحاد منازل ارتقا سے گزر رہی ہے۔ گزشتہ دو سال کے عرصہ میں کئی کامیاب علمی سیاحتیں کی گئیں۔ یوم کلیہ بھی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا جسکے تمام ہی خواہان کلیہ متمنی تھے۔ لیکن برادران کلیہ برا نہ مانئے اگر میں عرض کروں کہ ہمارے علمی جلسوں کی تعداد کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ہم انجمن اتحاد کے اہم ترین مقصد سے قابل انسوس بے توجھی برت رہے ہیں۔

بخون آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسین
تو اول زیب اسپ و زینت برگستواں بینی

برادران کلیہ انجمن آپ کے واسطے ہر ممکن سہولت بہم پہونچانے کے لئے تیار ہے۔ ہم اگر خدمت گزاری میں کوتاہی کریں تو سزاوار سرزنش، لیکن آپ بھی اسے اپنا فریضہ تصور فرما کر انجمن کے ہر جلسہ میں شرکت کیجئے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تقاریر میں حصہ لیجئے۔

جناب وقار لکھنوی ہندوستانیوں میں جدوجہد کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ طوق بےحسی کس واسطے پہنا ہے گردن میں
کبھی کچھ نا امیدی تو نہیں غفلت کے دامن میں

جہاں تک مینے حالات کا مطالعہ کیا ہے یہ شعر بہت کچھ ہمارے حسب حال ہے۔ اکثر ارکان انجمن محض اس بنا پر تقاریر کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ذہن میں مقرر کی قابلیت و علمیت کے متعلق ایک غلط تصور قائم کر رکھا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اسٹیج پر قدم رکھنے کے لئے ہر شخص کو لائڈ جارج اور شاستری ہونا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو اس تصوری معیار پر پورا اترتے نہیں دیکھتے تو انجمن کے علمی جلسوں سے بے تعلقی ہی کو اپنے لئے پسند کرلیتے ہیں۔

برادران کلیہ اول تو یہ بجائے خود ایک غلط خیال ہے کہ مقرر کو اسٹیج پر آنے کے لئے کچھ غیر معمولی صفات سے متصف ہونا چاہئے۔ انسانی تخیل کی انتہائی یکسانیت کے باوجود ہر شخص کو فطرت نے کچھ امتیازی خصوصیات سے سرفراز کیا ہے جو اسے بقیہ گروہ انسانی سے علحدہ کردیتی ہیں اور یہی انفرادیت سوسائٹی کی ہئیت اجتماعی کی اصلاح و ترقی کا ہیولی ہے۔ یہ آفرانیش کا بڑا دلچسپ راز ہے کہ کائنات کی گونا گونی کے باوجود ہر جگہ ایک وحدت موجود ہے اور پھر یہی مختلف اور متضاد عناصر سمٹ کر ایک مرکز پر قائم ہوجاتے ہیں اور ایک ہی رشتہ میں شیرازہ بند ہوجاتے ہیں۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرہ کا ہر رکن خواہ وہ کسی طبقہ اور کسی حیثیت کا ہو منظر عام پر آکر اپنی انفرادیت سے معاشرہ (سوسائٹی) کی ترکیب و تشکیل میں مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ قطع نظر اسکے انجمن اتحاد تو اس لئے ہے کہ آپ کے واسطے مشق و مہارت کا موقع مہیا کرے۔ یہ درحقیقت درس

و تحصیل کا زمانہ ہے جسے آپ نے امتحان تصور فرما لیا ہے امتحان کا وقت بعد میں آئیگا اور اگر آپ نے اس وقت سے فائدہ اٹھایا اور مشق و کوشش جاری رکھی تو بہت ممکن ہے کہ جب عملی زندگی کا وہ دور آئے جسے میں نے امتحان کا زمانہ کہا ہے تو آپ دنیا کے اعلیٰ ترین مقررین میں سے ثابت ہوں ۔

ایک اور تجویز میں آپکی خدمت میں یہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں مختلف جامعات کے طلباء کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور واقفیت ہونے کے مواقع فراہم کرنا بہت ضروری ہے ۔ افسوس ہے کہ طلباء کا کوئی آل انڈیا ادارہ موجود نہیں ہے اس لئے انمیں ہم خیالی خلوص و اتحاد کی روح پیدا کرنے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ''یوم کلیہ،، کے سلسلہ میں ایک آل انڈیا یا بین الاقوامی تقریری مقابلہ ترتیب دیا جائے جسمیں تمام جامعات کے نمائندے حصہ لیں ۔ یہ نہ صرف معاشرتی اعتبار سے مفید ہوگا بلکہ اس سے تقریر میں مہارت حاصل کرنے کی بھی تحریک و ترغیب ہوگی ۔

میری آخری تجویز علمی سیاحتوں سے متعلق ہے۔ علمی سیاحتوں کی ہمیں جس درجہ ضرورت ہے اور یہ ہماری کردار کی تعمیر اور ہمارے تجربہ کی توسیع میں جو اہم حیثیت رکھتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ۔ مقام مسرت ہے کہ طلبائے کلیہ میں علمی سیاحتوں کی اہمیت کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے جیسا کہ گذشتہ کئی مواقع پر ظاہر ہوا ۔ لیکن مصارف کا سوال ایسا ہے کہ ہم میں اکثر باوجود خواہش و کوشش کے ان سیاحتوں میں میں حصہ نہیں لے سکتے ۔ یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی توسیع و اشاعت کے مدنظر ہمارے جامعہ میں ہر پہلو سے اس امر کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے طلبا اعلیٰ تعلیم کی دولت سے مستفید ہوسکیں ۔ ان حالات میں ہم توقع نہیں کرسکتے کہ خواہ طلباء میں کیسی ہی اُمنگیں کیوں نہ موجود ہوں علمی سیاحتوں میں بغیر سرکاری امداد کے

طلباء کی زیادہ تعداد حصہ لے سکیگی ۔ میں یہاں پھر انتہائی مسرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں
کہ ہمارے شفیق صدر عالی جناب عبدالرحمٰن خان صاحب نے جو طلباء کی جائز ضروریات سے
کبھی غافل نہیں رہے اس مسئلہ میں اعانت فرمانے کا وعدہ کرلیا ہے ۔ لہذا میں اس موقع
سے فائدہ اٹھاکر جناب صدر سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سال اپنے وعدہ کو عملی جامہ
پہناکر انجمن اتحاد کی ترقی میں معاون ہوں ۔

حضرات اب میں اس دعا کے بعد اپ سے رخصت ہونگا کہ خدا ہمارے
بادشاہ عدل پرست نواب میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی عمر و اقبال میں
ترقی عطا فرمائے اور ان کے ظل عاطفت میں جامعہ عثمانیہ جو اس علم نواز دور فرمانروائی
کی مہتم بالشان یادگار ہے دن دونی رات چوگنی ترقی کرے ۔

"این دعا از من وداز جملہ جہان آمین باد"

کلیہ کی خبریں

صدارت کلیہ ہمارے سابق صدر کلیہ مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب بی-ایس سی (لندن) اپنی اصلی خدمت پر نظام کالج واپس تشریف لے گئے اور صدارت کا جائزہ پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب ام - اے - نے حاصل فرمایا -

اساتذہ جامعہ عثمانیہ مولوی حبیب الرحمن صاحب ام - اے - ال - بی مددگار پروفیسر معاشیات نے لندن یونیورسٹی سے بی - ایس - سی (آنرز) کی ڈگری امتیازی طریقے سے حاصل کی ہے -

مولوی ابن حسن صاحب مددگار پروفیسر تاریخ کا مقالۂ تحقیقاتی پی - ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے اکسفورڈ یونیوسٹی نے منظور کیا -

ایچ - سی ایس کا مقابلہ اس سال امتحان ایچ - سی - ایس کے مقابلہ میں کلیہ کے حسب ذیل طالب علموں نے کامیابی حاصل کی -

جناب زین العابدین صاحب متعلم ال ، ال - بی (آبتدائی) -

جناب چندر کانت راؤ صاحب گوٹسے متعلم ال ، ال - بی (آبتدائی) -

کالج کے دن

از

جناب عزیز احمد صاحب

متعلم، کلیۂ جامعہ عثمانیہ

مجیب.......... کالج کا ایک طالبعلم

صالح............ مجیب کا ہم جماعت اور دوست

وحید............ انکا ہم جماعت اور دوست

وسیم............ ,,

ظفر............ انکا ہم جماعت اور دوست

حسام الدین...... ,,

سیموئیل جیوفرے... کالج کا ایک طالب علم

ابراھیم............ ایک دیہاتی طالب علم

شمش الدین........ ,, دو برس کے بعد

اور کئی طالب علم

پرنسپل..........

ادریسی صاحب...... پروفیسر اردو

حبیب احمد.......... مجیب کے والد

چپراسی وغیرہ

آرورا (Aurora)...... کالج کی ایک متعلمہ

لارا (Laura).......... اسکی ہم جماعت سہیلی

اور لڑکیاں

پہلا ایکٹ

پہلا منظر

[کلاس کا ایک کمرہ نظر آ رہا ہے۔نشستیں جمی ہوئی ہیں۔ انکے آگے کچھ فاصلے پر طالبات کی نشستیں ہیں۔ اسکے بعد چبوترے پر کرسی اور میز ہے۔کلاس بھر میں صرف ایک طالبعلم نظر آرہا ہے جو آڈی ٹوریم کی قریب ترین نشستوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا ہے۔اسکے چہرے سے انتہائی سنجیدگی اور متانت کا اظہار ہورہا ہے وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہا ہے اسکا نام مجیب ہے۔ پردہ اٹھنے کے دس سکنڈ بعد ایک اور طالبعلم داخل ہوتا ہے جسکی صورت سے بے فکری اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اسکا نام ظفر ہے۔]

ظفر :۔۔ اجی آداب عرض ہے قبلہ سب سے پہلے آپ ہی موجود [ہاتھ ملاکر کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتا ہے اور نشست پر کتابیں رکھدیتا ہے۔ مجیب کے چہرے پر یکساں تبسم رہتا ہے] معلوم ہوتا ہے گھر سے وائر لیس پر تشریف لائے ہیں۔

[اس جملہ پر دونوں ہنستے ہیں]

مجیب:۔۔ وائر لیس نہیں بھائی لاسلکی یا بے تارکی تاربرقی کہو۔ معلوم ہے کہ آپ انگریزی بہت جانتے ہیں [اس جملے کی بےلطفی پر وہ خود مسکراتا ہے اور ظفر بھی تقریباً ہنستا ہے]

ظفر :۔۔ جناب کلاس تو آج کل گلزار ارم یا اندرکا اکھاڑا بنی ہوئی ہے۔ غالب نے اسی پر تو کہا ہے کہ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے۔

مجیب :۔۔ واہ بھئی جنت نگاہ تو نظارہ ہے اورفردوس گوش کیا چیز ہے؟

ظفر :— خوب جناب خوب۔ آپ کی آواز میں اور [سامنے کی نشستوں کی طرف اشارہ کر کے] اور انکی آواز میں کوئی فرق ھے کہ نہیں؟

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ھے — آئینہ زانوے فکر اختراع جلوہ ھے

مجیب :— (ھنستے ھوئے) واہ وا۔ کیا کہنا۔ کیا دلیل پیش کی ھے۔ غالب نے اسی موقع کے لئے تو یہ شعر لکھا تھا.....

[اتنے میں چار پانچ طالب علم داخل ھوتے ھیں علیك سلیك اور ھاتھ ملانیکے بعد آپس میں باتیں کرنے لگتے ھیں۔ اسکے بعد متواتر اور طالب علم داخل ھوتے جاتے ھیں اور گفتگو باھم ملی جلی ھوتی جاتی ھے۔ بیچ بیچ میں کچھ الفاظ صاف سنائی دیتے ھیں۔ نشستیں تقریباً بھر جاتی ھیں اسکے بعد گھنٹی کی آواز آتی ھے اور آواز کے ساتھ ھی پروفیسر صاحب داخل ھوتے ھیں۔ پروفیسر صاحب کے بعد ھی لڑکیاں داخل ھوکر سامنے کی نشستوں پر بیٹھ جاتی ھیں لڑکے پروفیسر کی آمد کے وقت اٹھ کھڑے ھوتے ھیں اور اسی اثناء میں ڈسکوں کی آوازوں کا ایك ملا جلا شور پیدا ھوکر غائب ھو جاتا ھے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ پروفیسر صاحب ادریسی صاحب کے نام سے مشہور ھیں]۔

پروفیسر :— [ایك کتاب کھول کر ورق گردانی کرتے ھوئے اس اثناء میں سب لڑکے اور لڑکیاں اپنی کتابوں میں سے ایك کتاب نکالتے ھیں] ھاں صاحب شروع کیجئے۔ آج غالب ھے نا۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بیك کف بردن صد دل پسند آیا

آپ صاحبین میں سے کوئی اس شعر کا مطلب بتائیگا [شروع سے آخر تك ایك نظر ڈالکر] اچھا آپ بتائے حسام الدین صاحب۔

حسام :— [کچھ سونچتے ہوئے] شمار سبحہ یعنی تسبیح پڑھناھما رے مشکل او ر مرغوب محبوب کو پسند آیا ۔۔۔۔ او ر ۔۔۔۔ جناب دوسرے مصرع کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا ۔

وسیم :— (بہت آھستہ سے اٹھکر نہایت آھستگی سے رك رك کر کہتا ھے) جی صاحب میں ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔

پروفیسر — ھاں ھاں وسیم صاحب آپ ھی بتائے ۔

وسیم ۔ جی صاحب ۔۔۔۔۔ بہت بہتر ۔۔۔۔ جی میں عرض کرنے والا تھا ۔۔۔۔۔

پروفیسر ھوں ھوں ۔

وسیم :— جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ کہ یہ شعر بہت سادہ او ر سلیس ۔۔۔۔ اور عام فہم ھے ۔۔۔۔

ظفر :— خوب ۔

وسیم :— جی صاحب غالب کا مطلب یہ ھے کہ اس کا محبوب اس درجہ عیار ھے کہ وہ اپنے عاشقوں کو فریب دینے کے لئے ھمیشہ تسبیح پڑھا کرتا ھے ، اور اسطرح اس کی ایك ھتیلی میں جو تسبیح ھوتی ھے ۔۔۔۔ وہ گویا کہ سیکڑوں عاشقوں کو دھوکا دیتی ھے ۔

[یہ مطلب سنکر کچھ لڑکے ھنستے ھیں مگر پروفیسر کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے ، اور کچھ لڑکے جھك کر ور سے کتابوں کی طرف دیکھنے لگتے ھیں] ۔

پروفیسر :— کوئی اور صاحب اس شعر کا مطلب بتائینگے ؟

ظفر :— جناب میرے خیال میں خود غالب بھی اس شعر کا مطلب نہیں سمجھے ہونگے ۔

[اس پر کلاس کے کچھ اور لڑکے ھنستے ھیں] ۔

پروفیسر :— [یہ دیکھکر کہ لڑکوں میں سے کوئی اس شعر کا مطلب بتانیکے لئے تیار نہیں] اچھ
سنئے ۔ یہ شعر یقینا بہت زیادہ مشکل ھے ۔ یہ غالب کے ابتدائی اشعار میں
سے ھے ، جب غالب کا دیوان شایع ہونے لگا تو اس میں غالب نے اپنا
ابتدائی سخت مشکل اور ادق کلام شامل نہیں کیا ۔ لیکن یہ شعر چونکہ بہت
محنت اور جانفشانی سے لکھا گیا تھا ۔ اس لئے اسکو کاٹنے پر غالب کا قلم نہ
اٹھسکا ۔

حسام :— غالب کا پورا ابتدائی کلام نسخۂ حمیدیہ میں موجود ھے یا اس سے بھی
زیادہ کلام دستیاب ہو سکا ؟

پروفیسر :— ھاں نسخۂ حمیدیہ میں غالب کا جتنا کلام درج ھے اسکے علاوہ اور بھی غالب
کا کچھ کلام ھے ۔ اکثر بالکل غیر مطبوعہ غزلیں جو کسی نہ کسی طرح
دستیاب ہو گئیں رسالوں میں آپ لوگوں کی نظروں سے گذری
ہونگی ......

وسیم :— جی صاحب [اٹھکر] میں دریافت کرسکتا ہوں کہ غالب نے یہ غزلیں اپنے
مطبوعہ دیوان میں کیوں شریک نہیں کیں ؟

پروفیسر :— اس وجہ سے کہ غالب کے زمانے کے لوگ ان کی مشکل گوئی سے عاجز
تھے ، اور ان پر طرح طرح سے حملے کرتے تھے چنانچہ ایک شعر بھی لکھا
گیا جس میں غالب پر چوٹ کی گئی ۔

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب اپنے ھمعصروں کی تنگ نظری اور تنگ فھمی سے عاجز آ گئے تھے ،
چنانچہ انہوں نے اپنے اشعار میں جا بجا اسکی طرف اشارہ کیا ھے مثلاً :—

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ھیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اسکے علاوہ ایک قطعہ بھی تو ہے۔ آپ لوگوں میں سے کسی کو یاد ہے۔

حسام :— مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سن سن کے جسے سخنوران کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش   گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

پروفیسر :— ہاں اب اس شعر کا مطلب سن لیجئے۔

شمار سجہ مرغوب بت مشکل پسند آیا   تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ تسبیح کا پڑھنا۔ سجہ کے معنی ہیں تسبیح فارسی لفظ ہے، جسکا مفہوم ہے وہ چیز جس پر سبحان اللہ پڑھا جائے۔ یعنی تسبیح ۔۔۔۔۔۔ہاں تو ہمارے بت مشکل پسند کو تسبیح خوانی مرغوب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ کو سمجھنے میں دقت ہورہی ہے۔۔۔۔۔۔ اچھا پہلے نثر کر لیجئے ۔۔۔۔۔۔بت مشکل پسند کو شمار سجہ مرغوب آیا۔ یعنی ہمارے محبوب کو جو بہت دقت پسند واقع ہوا ہے، تسبیح خوانی بہت مرغوب ہے ۔۔۔۔۔۔۔اسکی توجیہ شاعر دوسرے مصرع میں کرتا ہے۔ کہ اسکے محبوب کے ہاتھ میں جو تسبیح ہے وہ گویا اسکے عاشقوں کے دل کا مجموعہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ دیکھئے تسبیح میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح محبوب جو ایک ہاتھ میں سو دانے لئے ہوئے ہے! وہ سو دانے تسبیح کے دانے نہیں ہیں۔ بلکہ اسکے سو عاشقوں کے دل ہیں۔ اور مشکل پسند محبوب اس خیال سے مسرور ہے کہ میری ایک ہتیلی میں سو دل ہیں۔۔۔ اب غالباً آپ لوگ سمجھ گئے ۔۔۔۔۔۔ اچھا دیکھئے۔ بت مشکل پسند کی مناسبت سے شمار سجہ وہاں کسقدر لطف پیدا کر رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اس شعر کی فارسی بندشوں پر نظر رکھئے۔ سوائے "آیا" کے کوئی لفظ اردو نہیں۔ اگر اسکو پورا کر دیا جائے۔

شمار سجہ مرغوب بت مشکل پسند آمد   تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آمد

تو شعر بالکل فارسی ہو جاتا ہے۔ آپ سب لوگ سمجھ گئے یا اور اچھی طرح سمجھاؤں۔

[آروراا دروازے پر ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر داخل ہوتی ھے۔ سب طالب علموں کی نظریں اسکی طرف اٹھہ جاتی ھیں۔ پروفیسر صاحب پہلے لڑکی کی طرف پھر غور سے پوری کلاس کی طرف دیکھتے ھیں۔ لڑکی سامنے کی صف میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ جاتی ھے۔ مجیب بے چینی سے نشست پر پہلو بدلتا ھے اسکے چہرے کا رنگ متغیر ھو جاتا ھے۔ اسکے پاس کے چند طالبعلموں کی نظریں اسکی طرف اٹھ جاتی ھیں۔ بالآخر اس بے محل سکوت کو جو تقریباً بیس سکنڈ طاری رھتا ھے، پروفیسر کی آواز توڑتی ھے]

پروفیسر:— ھاں اسکے بعد کا شعر—

به فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ھے کشایش کو ھمارا عقدہ مشکل پسند آیا

یہ شعر باوجود مشکل ھونیکے کسیقدر پر اثر ھے۔ میرے خیال میں اسکا شمار غالب کے بہترین اشعار میں ھونا چاھئے۔ یہ فوراً معلوم ھوجاتا ھے کہ کون سا شعر شاعر کے دل سے نکلا ھے اور کونسا شعر اسنے محض شعر کہنے کی خاطر کہا ھے اچھا مجیب صاحب آپ اسکا مطلب بتائیے—

[مجیب بے چینی سے حرکت کرتا ھے]

مجیب:—[رسمی اخلاق سے] جی نہیں کوئی خاص بات نہیں (کتاب کی طرف غور کرکے) انسان اگر بیدل ھو یعنی اسے کسی قسم کی آرزو نہو تو اسکے لئے نا امیدی کوئی اھمیت نہیں رکھتی۔ خداوند تعالی کی صفت عقدہ کشائی نے ھمارے عقدۂ مشکل کو اسی لئے پسند کیا—

پروفیسر:— ٹھیک ھے۔ لیکن آپ آدھے مطلب کو زیادہ واضح نہ کرسکے۔ سنئے مایوسی، اور نا آمیدی اسقدر بھیانک چیز ھے کہ کسی معمولی سی چیز میں مایوسی ھمکو پریشان کردیتی ھے۔ لیکن جب انسان میں بیدلی پیدا ھوجاتی ھے۔ یعنی وہ اپنی قوت احساس کے اثر میں نہیں رھتا تو نا آمیدی اس کو

پریشان نہیں کرسکتی۔ ذات کشایش نے میری نو آمیدی جاوید کے عقدۂ مشکل کا یہ حل تجویز کیا کہ مجھے بیدلی عطا کی۔ یوں تو ذات کشایش معمولی معمولی عقدے سلجھایا ھی کرتی ھے۔ لیکن اس عقدے کو اسکی دقت کی وجہ سے ذات کشایش نے خاص طور پر انتخاب کیا اور بیدلی کو اسکا علاج تجویز کیا.............شعر صاف ھوگیا؟

حسام :— جی ھاں سمجھ میں آگیا

(گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ھے۔ پروفیسر صاحب کتاب بند کرتے ھیں۔ طلباء اٹھ کھڑے ھوتے ھیں۔ ایک بار پھر ڈسکوں کا ملا جلا شور ھوتا ھے۔ پروفیسر صاحب اور انکے ساتھ ساتھ اکثر طلباء جاتے ھیں۔ لڑکیاں دوسرے دروازے سے جاتی ھیں۔ لیکن آرورا بے خیالی میں اپنی کتابیں بھول کر آنکے ساتھ چلی جاتی ھے۔ جاتے ھوئے لڑکوں کے درمیان مجیب اور وسیم اور ظفر باقی رہ جاتے ھیں مجیب ایک انگڑائی لیکر اٹھتا ھے)

ظفر :— (مجیب سے) کیا ھے دوست آج بہت خاموش ھو۔ معلوم ھوتا ھے ملاقات ھوئی.........

(اسی اثناء میں وسیم صاحب آستین چڑھا کر پہنچتے ھیں اور ظفر کے شانے پر زور سے ھاتھ رکھکر انتہائی غصے کے لهجے میں کہتے ھیں)۔

وسیم :— یہ کیا حرکت تھی جناب آپ کی۔۔

ظفر :— ارے ارے خیریت تو ھے۔

وسیم :— جی صاحب..... (اور زیادہ تیز لهجے میں) جی صاحب..... آپ نے پوری کلاس اور پروفیسر کے سامنے میری توھین کی ھے (وسیم غصہ سے دانت کٹکٹاتا ھے ظفر زور سے ھنستا ھے اور مجیب آھستہ سے اٹھکر دونوں کے بیچ میں آتا ھے۔

مجیب :— ارے ارے وسیم صاحب یہ کیا ھے آپ دونوں شریف آدمی ھیں۔

وسیم :— جی صاحب۰۰۰۰۰۰جی صاحب۰۰۰۰۰۰جی صاحب کیا شرافت اسی کا نام ھے

۰۰۰۰۰۰جی صاحب میں ھرگز ایسے پاجیوں کو شریف نہیں سمجھتا۔

ظفر :— واہ، وسیم صاحب۔ غالب نے یہ شعر آپ ھی کی تعریف میں لکھا ھے۔

کتّا زتو بلّی زتو بندر زتو آموخت نوچیدن و پھاڑیدن وبر آنگ پڑیدن

وسیم :— شرم نہیں آتی بے حیا کو ھنستا ھے۔

ظفر :— بسم اللہ وسیم صاحب رونا شروع کردیجئے۔

وسیم :— ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔

ظفر :— بہت بہتر صاحب آپ خفا کیوں ھوتے ھیں [وسیم ایک کرسی پر بیٹھنے کو جاتا ھے۔ ظفر کرسی کھینچ لیتا ھے اور وسیم زمین پر گر پڑتا ھے] خدا حافظ وسیم صاحب جب تک آپ اُٹھنے کی زحمت گوارا فرمائیں بندہ اجازت چاھتا ھے، غالباً آپ کو زیادہ چوٹ نہ لگی ھو۔

[ظفر جاتا ھے۔ وسیم ابھی اُٹھنے بھی نہیں پاتا کہ آرورا بھولی ھوی کتابیں لینے آتی ھے۔ کتابیں اُٹھاتی ھے۔ لیکن وسیم کی قطع دیکھکر وہ پھر بے خیالی میں اسطرح جانے لگتی ھے کہ اسکا ھاتہ ایک کرسی کی پشت سے ٹکراجاتا ھے اور کتابیں بکھر جاتی ھیں۔ مجیب آگے بڑہ کر کتابوں کو جمع کرنے میں مدد دیتا ھے۔ آرورا خشک آواز میں ,, شکریہ ،، کہکر باھر نکل جاتی ھے۔ اور مجیب اسکے پیچھے دیکھتا رہ جاتا ھے اسی اثناء میں وسیم گرد جھاڑتا ھوا اُٹھتا ھے۔ صالح اندر داخل ھوتا ھے اور کتابیں بائیں ھاتہ میں لیکر دائیں ھاتہ سے وسیم سے ھاتہ ملاتا ھے۔ جھینپ مٹانیکے لئے مذاق کرنیکی کوشش کرتے ھیں۔]

وسیم :— اخاہ صالح صاحب کلاس ہوجانیکے بعد اب آپ مشتے بعد از جنگ کی طرح تشریف لائے۔

صالح :— اور آپ مشتے نمونہ از خروارے کی طرح باقی رہ گئے۔

[مجیب پیچھے مڑتا ہے اور صالح سے مصافحہ کرتا ہے اسکا چہرہ بالکل اترا ہوا ہے)۔

صالح :— خیر تو ہے مجیب آج تو تمہارا رنگ روپ کچھ اور ہے۔

مجیب :— نہیں کوئی خاص بات نہیں۔

صالح :— کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔

مجیب :— نہیں بھئی (گفتگو کا رخ بدلنے کے لئے) اچھا اب اسکے بعد کونسی کلاس ہے۔

وسیم :— یہ تو انٹرول ہے۔ اچھا مجیب صاحب میں آپ سے ایك بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ Co-education. کے متعلق آپکا کیا خیال ہے

مجیب :— میں تو کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہیکہ ساتھ تعلیم پانیکی وجہ سے ایك دوسرے کا کیریکٹر نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ آئندہ شریك زندگی کا انتخاب بہت آسان ہوجاتا ہے۔ اور صنفی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔

وسیم :— اور کلاس کی فضا انتہائی آرٹسٹك ہوجاتی ہے۔

مجیب:— بد قسمتی سے میں آپکی طرح آرٹسٹ تو ہوں نہیں...... لیکن میرا نقطۂ نظر بہت زیادہ عملی ہے۔ یعنی میں عملی زندگی کے لئے اس طریق تعلیم کو پسند کرتا ہوں۔ ہماری قومی ترقی کو پردے نے بہت سخت نقصان پہنچایا۔ کیا خیال ہے آپکا صالح صاحب؟

صالح :— جناب میرا تو خیال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی خیال صحیح نہیں۔

وسیم :— جی صاحب ...... یعنی ......

صالح :— یعنی دنیا احساس بے خیالی کا دوسرا نام ہے ۔

مجیب :— پھر آپ فلسفے میں غوطے لگانے لگے ...... یہ بتائیے جناب کہ کوایجوکیشن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

صالح :— اگر ہو تو کوئی نقصان نہیں اگر نہ ہو تو کوئی نقصان نہیں ۔

مجیب :— معلوم ہے کہ آپ بہت بڑے فلسفی ہیں لیکن ذرا صاف صاف الفاظ میں تشریح کیجئے

صالح :— بھائی صاحب میں تشریح نہیں کر سکتا ۔ کوئی شخص زندگی کی کسی چیز کی تشریح نہیں کر سکتا زندگی اپنی تشریح خود کرتی ہے یا زیادہ واضح الفاظ میں آپ کو برنرڈ شا کا وہ قول تو یاد ہو گا ۔

The Golden rule is that there are no golden rules. بہترین قانون یہی ہے کہ بہترین قانون کوئی نہیں

[مج]یب :— خوب لیکن اگر اس قول پر عمل کیا جائے تو دنیا کے تمام کام بند ہو جائیں ۔

صالح :— اور اب کون سے چل رہے ہیں ۔ کیا اب بھی دنیا کے ہر قانون میں خامی نہیں ؟

مجیب :— خامیوں سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کم خامیاں زیادہ خامیوں سے بہتر ہیں ۔

صالح :— یہی سوال تو دنیا آج تک حل نہ کر سکی کہ با اصول طریقہ زیادہ مفید ہے یا بے اصول طریقہ ۔

مجیب :— تو پھر دنیا اصول کی پابندی کیوں کرتی ہے ۔

صالح :— یہ آپ کا خیال ہے دنیا مطلق اصول کی پابندی نہیں کرتی ۔ دنیا دوسروں کو اور اپنے آپ کو یہ دھوکا دینا چاہتی ہے کہ وہ اصول کی پابندی کرتی ہے ۔

[ظفر آتا ہے]

ظفر :— اخاہ صالح صاحب آپ بھی آخر مغرب کی جانب سے طلوع ہو ہی گئے ۔ اچھا وسیم صاحب اب آپ کو تخت سلیمان کی قسم میرا قصور معاف فرمائیے ورنہ میں پرنسپل صاحب سے آپکی شکایت کر دونگا ۔

صالح :— کیا شکایت بھئی؟

ظفر :— وہ یہ کہ جناب وسیم صاحب ہماری یونیورسٹی میں دارالمجانین کی فضاء پیدا کر رہے ہیں۔

صالح :— کیا بات ہے بھئی وسیم آخر یہ قصہ کیا ہے۔

وسیم :— ارے کچھ بھی نہیں یار بیوقوف ہے وہ۔

مجیب :— اور انکا آپکے متعلق بھی یہی خیال ہے۔

وسیم :— درست ہے آپ بھی اور ہم سگ زرد برادر سفال نکلے ..... جی صاحب .....

جی صاحب .....(جاتا ہے)

صالح :— بیٹھئے بیٹھئے ظفر صاحب بیٹھئے۔

ظفر :— ابھی آتا ہوں ذرا جنرل کریک کو اور ستا لوں۔ جان بےری مور کا ڈرامہ جنرل کریک

آپ نے دیکھا ہوگا وسیم صاحب، پھر کیسا پھبتا ہوا خطاب ہے (جاتا ہے)

مجیب :— ان لوگوں کی زندگی کس قدر با مسرت، زندگی ہے۔ انکے نزدیک زندگی ہنسی کا

نام ہے اور ہمارے نزدیک بےلطفی کا۔

صالح :— کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے؟ صرف مسرت ھی تو وہ چیز ہے جو زندگی میں

حاصل نہیں ہو سکتی۔

مجیب :— اچھا صالح صاحب ایک نہایت ھی ضروری امر میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ میں

آپ کے یہاں آج ھی کسی وقت حاضر ہونگا۔

صالح :— بہت بہتر آج ھی۔

[جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے]

دوسرا منظر

[صالح کا مکان ایک صاحب ہارمونیم پر گاتے نظر آتے ہیں۔ گانیکے بعد

وحید کہتا ہے]۔

وحید :— موسیقی تو غذائے روحانی ھے۔

صالح :— ھاں اسوجہ سے کہ موسیقی غذائے روحانی ھےاور اب دنیا کو اسکی پروانہیں
رھی۔ آج کل لئے سے پڑھنے کا رواج عام ھوتا جارھا ھے۔ اور ھمارا قدیم علم
موسیقی زوال پذیر ھو رھا ھے۔ میں نے باضابطہ موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

وحید :— خوب

صالح :— ھاں زمانہ ھوا۔ میں نے انتہائی شوق سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایك
قدیم استاد سے ...... لیکن اسکے بعد جھاں اور تمام باتیں چھوٹیں موسیقی
بھی چھوٹی۔

وحید :— کیا پہلے آپ شاعر بھی تھے۔

صالح :— نہیں [اپنی نشست سے اٹھکر وحید کے پاس آکر کھڑا ھوتا ھے اور وحید کے
شانے پر ھاتھ رکھکر کھتا ھے] کیونکہ موسیقی اور شاعری کبھی ایك شخص
میں جمع نہیں ھوسکتیں باوجود ایك دوسرے سے قربت کے ان دو نوفنون لطیفہ
کا ایك ھی شخص میں یکجا ھونا ناممکن ھے۔

وحید :— تعجب ھے۔

[ایك صاحب شملہ باندھے ھوئے کوٹ پہنے ھوئے اندر داخل ھوتے ھیں
صورت سے کسیقدر دھقانیت پائی جاتی ھے انکا نام ابراھیم ھے]۔

ابراھیم :— اجی السلام والیکم حضرت [صالح پیچھے پلٹ کر دیکھتا ھے اور پھر اخلاق
سے ھاتھ ملاتا ھے۔

صالح :— وعایکم السلام جناب آئیے بیٹھیے۔

ابراھیم :— اجی حضت، وہ کتاب آپ دیتاؤں بول کے بولے تھے نا؟ وہیچ کتاب
لینے کو میں آیا ......

وحید :— آپ کا اسم شریف

صالح :— آپ ابراھیم صاحب ھیں لاتور کے رھنے والے ھیں ، اسی سال فرسٹ ایر میں
آ کر شریك ھوئے ھیں ۔

ابراھیم :— جی ھا وحضت میرا نام ابراھیم ھے ۔

[وحید ھنستا ھے اور صالح نہایت سنجیدگی سے وحید کی طرف دیکھتا ھے] ۔

صالح :— معاف کیجئے جناب اگر اس فضاء میں آپ پرورش پاتے تو آپ کا لھجه اور
طرز گفتگو یہی ھوتا ۔

ابراھیم :— بھوت بھوت شکریه زناب آپ کاپن وکتاب ذرا زلدی دیدئے تو ٹھیك ھے ۔
کیونکه میرےکو اور ایك جائے جانا ھے ۔

صالح :— بہت اچھا ابراھیم صاحب لیجئے وہ کتاب یہی ھے ۔ اسکو ذرا غور سے پڑھئیگا
اور اسکی مدد سے اپنا تلفظ ٹھیك کیجئیگا ۔

ابراھیم :— ضرور ۔ ضرور ۔ حضرت ضرور ۔ اچھا اب خدا حافظ حضت ۔ آپ کا
بھوت بھوت شکریه ۔ پھر ملاقات ھوئیگی ۔

(صالح اور وحید دونوں سے ھاته ملاکر جاتا ھے ۔ وحید ھنستا ھے صالح
کچھ دیر تك غور کرتا رھتا ھے اور اسکے بعد ایك کرسی پر بیٹھ جاتا ھے)

وحید :— آپ نے بھی عجیب دوست پائے ھیں ۔

صالح :— زبان اور لہجہ بھی سوسائٹی کے تمامتر معیاروں کی طرح کتنا بے تکا
معیار ھے ۔ ایك شخص اگر آپ کی زبان نه جانتا ھو اور آپ سے اپنی مادری
زبان یعنی انگریزی ۔ فرانسیسی یا فارسی میں گفتگو کرے تو آپ مرعوب
ھوجاتے ھیں ۔ اور ایك دھقانی انتہائی سادگی سے اپنے اصلی لب
ولہجے میں بات کرے تو آپ ھنستے ھیں ۔

وحید :— خوب لیکن جس زبان میں وہ بات کررہا تھا وہ غالباً آردو ھی تھی ۔ فرانسیسی یا جرمن زبان نہ تھی ۔ وہ اگر غلط آردو بولے اور اسکی غلط اردو کی ہنسی اڑائی جائے تو آپ سوسائٹی کی ذہنیت کا خواہ مخواہ ماتم کرتے ہیں ۔

صالح :— درست ۔ وہ اگر غلط آردو بولے تو آپ ہنستے ہیں اور کوئی انگریز غلط سے غلط اردو بولے اس پر آپ ذرا ہنس لیجئیے تو میں جانوں ۔

وحید :— اچھا صاحب آپ خواہ مخواہ گرم ہوئے جارہے ہیں ۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے مہمان کی توہین کی ۔

صالح :— کیا خوب ۔ جب خون کرچکے تو خونبہا ادا کردیا ۔ جب ذلیل کرچکے تو معافی مانگ لی ۔ پھر یہ کہ قتل ایک شخص کیا جاتا ہے ۔ اور خونبہا دوسرے لوگ پاتے ہیں ۔ اسی طرح ذلیل آپ نے ایک آدمی کو کیا اور معافی دوسرے سے چاہ رہے ہیں ۔ یہ ہمارے انصاف کا معیار ہے ۔

وحید :— اتنی معمولی معمولی باتوں سے اسقدر خوفناک نتائج نکالنا آپ ہی کا کام ہے ۔

صالح :— معاف کیجئیگا جناب نہ دنیا کی کوئی بات معمولی ہے نہ کوئی نتیجہ خوفناک ۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی ہربات معمولی ہے اور ہر نتیجہ خوفناک ۔

وحید :— یا تو میں ہی آپ کے اس جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکا یا آپ کے اس جملے کا کوئی مطلب ہی نہیں ۔

صالح :— خیر میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں ۔ فی الحقیقت دنیا کے کسی بڑے سے بڑے کام کو باعتبار اہمیت کسی چھوٹے سے چھوٹے کام پر کوئی فوقیت نہیں ۔ صرف تخئیل کسی چیز کی اہمیت کو گھٹاتا یا بڑھاتا ہے ۔ ایک درخواستگذار

کسی با اختیار حاکم کے پاس ایك درخواست لیکر جاتا ھے جسکی منظوری یا
نامنظوری اسکی زندگی اور موت کا سوال ھے ۔ لیکن حاکم اسکی ضروریات
کا خیال کئے بغیر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا ھے ۔ یه کیا ھے دونوں کے
تخئیل اور تخیل اھمیت کا فرق .... اب تو غالباً سمجھگئے ھونگے آپ ۔

وحید :۔ جی ھاں سمجھ تو گیا ۔ مگر سر میں درد بھی ھونے لگا ۔ اگر کسی کو دردسر کی
ضرورت ھو تو کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ جائے ....

[مجیب بہت آھسته آھسته آتا ھے گویا کسی خیال میں غرق ھے ۔ اور بغیر
رسمی طور پر ھاته ملانے یا سلام تك کرنیکے ایك کرسی پر بیٹھ جاتا ھے]

صالح :۔ [وحید سے مخاطب ھوکر] وحید صاحب آپ جانتے ھیں که میں اخلاق کو بالکل
جھوٹ اور ریاکاری کے برابر سمجھتا ھوں ۔ اسلئے میں انتہائی صاف گوئی
سے آپ سے کہے دیتا ھوں که اسوقت مجھے مجیب صاحب سے ایك خاص
معاملے میں گفتگو کرنا ھے ۔ باوجود مجیب صاحب سے آپکے اسقدر مراسم
ھونیکے ، آپ کے سامنے وہ گفتگو نہیں کیجا سکتی ۔ اگر آپ اسوقت تشریف
لیجائیں تو ھمارے لئے سھولت کا باعث ھوگا ۔

وحید :۔ آپ کی صاف گوئی کا شکریه ۔ صالح صاحب آپ کی یہی بات تو مجھے سب
سب سے زیادہ پسند ھے ۔

[صالح سے اور پھر مجیب سے ھاته ملاتا ھے ۔ مجیب اسطرح گویا اچانك
نیند سے چونك پڑا ھو ۔ اٹھکر کہتا ھے ۔ " مزاج شریف " پھر اسی طرح بیٹھ جاتا ھے ۔
وحید چلا جاتا ھے ۔ صالح ، مجیب کی کرسی کے قریب ایك کرسی گھسیٹ کر بیٹھ
جاتا ھے]

صالح :۔ ھاں مجیب صاحب اب اپنی داستان عشق سنائیے ۔

مجیب :۔ (چونک کر) عشق کی داستان ؟ تم کو غیب کی باتیں کیسے معلوم ھو جاتی ھیں؟

صالح :۔ آپکا چھرہ ، آپ کی آنکھیں یہانتک کہ آپ کی نقل وحرکت ظاھر کر رھی ھے کہ آپ جنون کی پہلی منزل میں ھیں جسکو عشق کہتے ھیں ۔

مجیب :۔ (دلچسپی کے ساتھ دھراکر) جنون کی پہلی منزل جسکو عشق کہتے ھیں ...... اسکے بعد جنون کی اور کتنی منزلیں ھیں ۔

صالح :۔ صرف ایک منزل جسکو فلسفیت کہتے ھیں ۔ یعنی وہ زمانہ جب ناکامیوں سے تنگ آکر یا کامیابیوں سے اکتاکر ساری دنیا کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم تصور کرتا ھے ۔ یہ جنون کی دوسری منزل ھے جس مین غالباً میں ھوں ۔

مجیب :۔ (کسیقدر مذاق اور کسیقدر سنجیدگی لیکن دلچسپی سے) اچھا تو پھر کپڑے پھاڑنا پتھر مارنا اور دارالمجانین کو آباد کرنا جنون کی تیسری منزل ھے؟

صالح :۔ نہیں وہ جنون نہیں بلکہ عین خرد مندی ھے ۔ آپ ان دیوانوں کو دیوانہ سمجھتے ھیں اور وہ آپ کو دیوانہ سمجھتے ھیں ۔

مجیب :۔ (ھنس کر) اچھا بھئی اب خدا کیلئے اپنی بکواس ختم کرو ۔ جب میں یہاں آیا تو کسیقدر مغموم تھا ۔ لیکن تمھاری باتوں میں خواہ مخواہ جی لگ جاتا ھے تمھاری باتوں میں حقیقت نام کو بھی نہیں ھوتی ۔

صالح :۔ اچھا خیر اب اپنی داستان سناؤ ...... (انتہائی سنجیدگی سے اٹھکر چند سکنڈ تک ٹہلتا ھے ۔ یہ مہلت وہ محض اسلئے دیتا ھے کہ گفتگو میں جو زندہ دلی پیدا ھو گئی تھی ۔ اسکا اثر زائل ھوجائے ۔ چنانچہ مجیب کا چھرہ اس اثنا میں پھر وھی غم کی کیفیت پیدا کرلیتا ھے ۔ صالح پھر اسی کرسی پر بیٹھ جاتا ھے اور آگے کی طرف اسطرح جھک جاتا ھے جیسے کوئی پیشہ ور وکیل اپنے موکل کی گفتگو سننے پر آمادہ ھو ۔ اسکے بعد وہ آھستہ سے کہتا ھے ,,ھاں،،

مجیب :۔ قصه یه هےکه جس زمانه مین کالج شروع هوا.....

صالح :۔ بس کافی هے پورا قصه میری سمجھ میں آ گیا۔

مجیب :۔ (انتہائی تعجب اور بے یقینی سے) کیا ؟

صالح :۔ ایك جملے سے پورا قصه میری سمجھ میں آ گیا۔ اس جملے کا مطلب یه تھا که تم کو کسی ایسی لڑکی سے محبت هے جو اسی کالج میں شریك هوئی هے۔ اچھا اب یه بتاؤ که وه آرورا هی هے نا ؟

مجیب :۔ (انتہائی تعجب سے) هاں۔ لیکن میں نے آج تك کسی سے ذکر نہیں کیا۔

صالح :۔ هاں لیکن تمهاری خوش مذاقی سے مجھے توقع تھی که تمهاری نگاه انتخاب آرورا هی پر پڑیگی۔ اچھا اب ایك بات اور سنو۔ تمهاری محبت میں زیاده هیجان آج هی سے برپا هوا جسکے معنی یه هیں که آج کوئی نہایت هی معمولی واقعه پیش آیا هوگا۔

مجیب :۔ هاں بالکل یہی بات هے کلاس میں وه کتابیں بھول گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد انکو واپس لینے آئی۔ لیکن کتابیں پھر اسکے هاتھ سے گر کر زمین پر بکھر گئیں میں نے انکو یکجا کرنے اور اٹھانے میں مدد دی۔ وه شکریه ادا کر کے چلی گئی۔ بات نہایت معمولی تھی۔ لیکن اسکا میرے قلب پر جو اثر هوا وه بیان نہیں کیا جا سکتا۔

صالح :۔ تو اب کیوپڈ نے تیراندازی کے لئے کوایجوکیشن کو ایجاد فرمایا هے۔ اچھا هے تعلیم کے ساتھ درس عشق بھی سہی۔ تعلیم هی کیا کم تباه کن تھی۔ اب عشق اور بھی مٹی پلید کردیگا۔ (انداز گفتگو بدلکر سنجیدگی سے) آپ مرض کے دوسرے درجے مین هیں۔

مجیب :۔ دوسرا درجه کیا ؟

صالح :— یعنی جب عاشق محض تفریحاً عشق کرنیکی کوشش سے گذر کر اس خام خیالی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اسے فی الحقیقت عشق ہے ۔

مجیب :— میں تم سے سچ کہتا ہوں صالح ، میں ایک مدت سے اس آگ کو دل میں چھپائے ہوئے ہوں اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا دل ، میرا دماغ ، یہاں تک کہ میری روح ، محبت کے گداز سے پھنک رہی ہے ۔ مجھے دنیا کے کسی کام میں لطف نہیں آتا ۔ اب مجھکو اس کا احساس ہو رہا ہے کہ میری ہستی کی خلقت کا مدعا کیا ہے ۔ دنیا کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت محبت ہے ۔ خصوصاً جب کہ پاک اور شریفانہ محبت ہو ۔

صالح :— تو آپ افلاطون کے فلسفۂ محبت کی پیروی کر رہے ہیں ۰۰۰۰۰مگر خیر ۰۰۰ جو خیالات اس روانی اور اس خوش الحانی کے ساتھ تم نے میرے سامنے ظاہر کئے، انکو کسی نظم میں ظاہر کرتے تو لطف بھی آتا ۔

مجیب :— دیکھو صالح یہ موقعہ مذاق کا نہیں ۔؟؟ میرے بولنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے ارادے ہر طرح شریفانہ ہیں ، میں شادی کی درخواست کرنا چاہتا ہوں اور اس معاملے میں میں تم سے مشورہ لینے آیا ہوں ۔

صالح :— قبل اسکے کہ میں آپ کو مشورہ دوں میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ رازداری کے لئے آپ نے مجھے کیوں انتخاب کیا ؟

مجیب :— کیونکہ دوسروں کی زبانیں بہت شیریں ہیں مگر دلوں میں زہر بھرا ہوا ہے ۔ تم ظاہرا مذاق اڑانیکی کوشش کرتے ہو مگر تمہارا خلوص تمہاری سچی انسانی ہمدردی چھپ نہیں رہ سکتی ۔ تم اسکی کوشش کرتے ہو کہ لوگوں کو تمہارے متعلق غلط فہمی ہو اور اس کوشش میں تم انکو

برا بھلا کھتے ھو - تمہارے پہلو مین ایك دل ھے، جو ماضی کی ایك داستان رکھتا ھے - تمہاری باتین بعض اوقات حقیقی معنون مین زندگی کا عکس ھوتی ھین - گو کہ کبھی کبھی تم بھٹك بھی جاتے ھو .... اب مجھے زیادہ پریشان نہ کرو - تمہارے سوا کوئی اور شخص مجھے صحیح رائے نہین دے سکتا -

صالح :— معاف کرنا بھئی مجیب - ادھر ادھر کی باتین چھیڑ کر تمہاری ذھنی کفیت اور تمہاری محبت کی حالت کااندازہ لگا رھا تھا - اس موقع پر میری ٹیڑھی ترچھی باتون سے تمکو تکلیف تو ھوئی ھوگی ...... اچھا اب غور سے سنو - صرف خیالی عمارتین تعمیر کرنے سے حاصل نہین، امکانات اور واقعات کا خیال ضروری ھے ..... پہلی بات یہ ھے کہ اس لڑکی کی نسبت سیموئیل جیوفرے کے ساتہ ھوچکی ھے - تمکو معلوم ھے -

مجیب :— ھان -

صالح :— اب اسکے بعد اپنی کامیابی کے امکانات پر غور کرو - دوسری بات جو مین تم سے کہنا چاھتا ھون وہ یہ ھے کہ ابھی تو جذبات کے زور سے مغلوب ھوکر ایك رو مین تم بہے چلے جارھے ھو - مگر جب شادی کے بعد عملی زندگی کا سوال آئیگا تو کس حد تك تمہاری زندگی مسرت بھری زندگی ھوگی - مثلاً یہی ایك بات کہ تم کیونکر کہہ سکتے ھو کہ اس کا چال چلن قابل اطمینان ھے -

مجیب :— (ترشروئی سے) صالح تمکو کسی شریف لڑکی کے چال چلن پر حملہ کرنیکا کوئی حق نہین -

صالح :— مین نے چال چلن پر کسی قسم کا حملہ نہین کیا - مگر شاید تم شکسپیر کا وہ قول بھول گئے جسکی صداقت کے تم خود بہت معترف تھے -

Frailty thy name is Woman.

مجیب :— (ناخوشگوار لہجے میں) میں آپ سے نصیحتیں سننے نہیں آیا ہوں۔ اگر مجھے صرف نصیحتیں ہی سننے کا شوق ہوتا تو میں والد صاحب سے سن سکتا تھا۔

صالح :— معاف کرنا بھئی۔ مگر تمہارے والد کی نصیحتوں اور میری نصیحتوں میں بڑا فرق ہوگا۔ انکو تمہارے جذبات کا زیادہ خیال نہوگا اور مجھے تمہارے جذبات ہی کا خیال ہے۔

مجیب :— بس میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا (اٹھکر جانیکی کوشش کرتا ہے۔ صالح تیزی سے راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ صالح ایک لمحے تک غضبناک نظروں سے اسکو دیکھتا ہے، پھر کچھ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے)

صالح :— میاں تم ابھی بچے ہو۔ جذبات پر اتنا قابو نہیں تو آگے بڑھ کر کیا کرسکوگے۔ آؤ بیٹھو (مجیب کا ہاتھ پکڑ کر ایک آرام کرسی پر بیٹھا دیتا ہے۔ اور پھر خود قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے) اچھا اب اپنا غصہ تھوکدو اور غور سے سنو۔ محبت دو طرح سے کی جاتی ہے۔ ایک دل سے محبت کرنیکا طریقہ ہے اور ایک دماغ سے محبت کرنیکا طریقہ (مجیب کی استفہامی نظروں کا مطلب سمجھ کر) غالباً دل سے محبت کرنا اور دماغ سے محبت کرنا تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟ اچھا سنو۔ دل سے محبت کرنا یہ کہ اپنے کو محبت کے حوالے کر دینا محبت جسطرح رہنمائی کرے اسیطرح چلنا اور محبت جس رخ بہائے اسی رخ بہنا۔ اسکا نتیجہ زیادہ تر ناکامی ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو محبت کے حوالے کر دینا ایسا ہی ہے جیسے اپنی کشتی کو طوفان کے حوالے کر دینا۔ محبت کرنیکا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عقل و شعور کے ساتھ محبت کرو۔ اپنی محبوبہ کی نفسی کیفیت کا اندازہ کرو اور اسکے بعد پھونک پھونک کر قدم رکھو۔ یہ سمجھ کر محبت کرو کہ تم کسی ڈرامے میں عاشق کا پارٹ کر رہے ہو۔ دفعتاً اظہار محبت مت کرو آہستہ آہستہ جال پھیلاؤ۔ اسکے منگیتر کو

مذاق مذاق میں سب کے سامنے یہانتک کہ اسکے سامنے ذلیل کرو۔ پوری طرح روبیو بننے کی کوشش کرو۔ تب کہیں کامیابی کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ اور ان کوششوں کے بعد اگر ناکام بھی رہوگے تو کم از کم جگ ہنسائی تو نہوگی۔ دنیا مکر و فریب کا گھر ہے۔ اس کی امید مت رکھو کہ تم اس سے کچھ فائدہ حاصل کرسکوگے۔ دنیا اسوقت تک تمکو کچھ ندیگی جب تک تم اس سے زبردستی کچھ چھین کر نہ لوگے۔ تنازع للبقاء کی صحیح تعریف یہی ہے۔

مجیب :— اس تمام بحث سے آپکا مدعا کیا تھا؟

صالح :— یہی کہ ہر جائز و نا جائز طریقے سے اپنے مقصد براری کی کوشش کرو۔ دنیا میں انصاف کا وجود نہیں۔ میں نے تمھاری محبوبہ کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس سے میرا مقصد محض یہی تھا کہ تم ابتک اسکو فرشتہ سمجھتے رہے ہو اب اسکو انسان سمجھو۔ محبت کی سب سے خطرناک قسم افلاطونی محبت ہے۔ بد قسمتی سے تم پر اسکا اثر زیادہ ہے۔ لیکن اگر تم کامیابی چاہتے ہو تو ہر قسم کی چالاکی مکاری عیاری اختیار کرو۔

مجیب :— کیا خوب نصیحت ہو رہی ہے۔ سنو میں آرورا کو پہلے بھی فرشتہ سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سمجھتا رہوں گا (طنزیہ بتسم کے ساتھ) اب مجھکو آپ کے مشورے کی مطلق ضرورت نہیں رہی۔ میں آپ سے مکاری کا سبق لینے نہیں آیا تھا۔ میں آرورا سے اظہار محبت کروں گا (جوش میں آکر) اور ضرور کرونگا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس جاودانی محبت سے روک نہیں سکتی۔۔۔۔ (غصے سے) مگر اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنی محبت کا راز آپ سے کہنے میں میں نے کتنی بڑی حماقت کی۔

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

صالح :— سبحان اللہ برین عقل و دانش بباید گریست۔آپ ناحق مجھے اپنی رقابت کا مرتبہ دیتے ھیں۔ سموئیل ھی آپ کی رقابت کے لئے بہت کافی ھے۔ ھمارے شعرا نے جھاں اور بہت سی خرافات کو نظم کیا ھے، وھاں ایك حقیقت کو بھی بیان کیا ھے کہ واقعی محبت میں انسان اندھا بھی ھو جاتا ھے۔

مجیب:— شکریہ آپ کے الفاظ کا۔ (اٹھکر صالح پر ایك حقارت کی نظر ڈالتا ھے اور پھر حقارت کے لہجے میں کہتا ھے) اب میں اجازت چاھتا ھوں لیکن جانیسے پہلے آپ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کئے دیتا ھوں۔ ابتك میں آپ کو خدا جانے کسقدر عزت کی نظروں سے دیکھتا تھا اور اب مجھے محسوس ھوا کہ

One may Smile and Smile and be a villain.

(مجیب جاتا ھے۔ صالح ھنستا ھے پھر کمرے میں ٹھلنے لگتا ھے۔

پردہ آھستہ آھستہ اس منظر کو نظر سے چھپا دیتا ھے)۔

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

[آروورا کا نہایت آراستہ ڈرائنگ روم۔ دیواروں پر تصویریں۔ زمین پر نہایت عمدہ فرش اور فرش پر صوفے۔ جسوقت پردہ اُٹھتا ہے آروورا اپنی ہم کلاس سہلی لارا کے ساتھ بیٹھی ہوی نظر آتی ہے۔ سامنے میز پر ہارمونیم رکھا ہوا ہے]۔

آروورا:— لارا کچھ بھی سہی لیکن انگریزی موسیقی میں وہ نغمہ نہیں ہوتا جو ہندوستانی موسیقی میں پایا جاتا ہے۔ یہاں فن موسیقی بہت پرانا فن ہے۔

لارا:— ہاں مگر وہاں آواز کے اتار چڑھاؤ سے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

آروورا:— یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مغربی موسیقی میں اب بھی کسیقدر وحشیانہ پن ہے۔ موسیقی سلاد ینے والی چیز ہے، جگانے والی نہیں۔

لارا:—اچھا خیر آروورا تم اسوقت کچھ سناؤ گی بھی یا باتیں ہی کرتی رہوگی۔

آروورا:— اچھا۔ اچھا (اپنی جگہ سے اُٹھتی ہے۔ اور میز کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہارمونیم کھولتی ہے اور تھوڑی دیر تک کمال فن سے محض ہارمونیم ہی بجاتی رہتی ہے۔ پھر غزل گانا شروع کرتی ہے)۔

[آروورا گانا ختم کرتی ہے۔ اسکے بعد دفعتاً سیموئیل داخل ہوتا ہے۔ سیموئیل سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ داخل ہوکر وہ پرجوش اسپنیش (ہسپانوی) طریقہ پر ہیٹ اتار کر جھکتا ہے اور اپنے ہاتھ کو گھماتا ہے۔ آروورا مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتی ہے۔ سیموئیل ایک کرسی گھسیٹ کر دونوں سے بہت کافی فاصلے پر بیٹھ جاتا ہے]۔

سیموئیل :— یہاں آتے ہوئے میں نے میوزک کی پلیزنٹ آواز سنی تھی - یا تو میں لیٹ پہنچا یا میرے آتے ہی آپ نے گانا فنش کر دیا -

آرورا :— دونو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ تم دیر سے آئے - دوسرے یہ کہ تمکو گانے کی تمیز نہیں اسلئے گانا ختم کر دیا - [یہ کہکر آرورا ھنستی ہے - لارا مسکراتی ہے اور سیموئیل بھی چہرے سے خوشی کا اظہار کرتا ہے] -

سیموئیل :— میوزک بھی کیا Marvellous چیز ہے جسکے Effect سے Soul بھی Fresh ہوجاتی ہے .... لیکن میں آرورا مجھے اسوقت آپ سے ایک Unpleasant topic پر گفتگو کرنا ہے -

لارا :— کیا میں مخل ہوں -

آرورا :— نہیں - مطلق نہیں - تم سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے - ہاں سیموئیل - اب کہنا شروع کرو -

سیموئیل :— (بہت زیادہ تکلف سے) ہاں - ہاں ...... میرا مطلب ہے I mean no offence

آرورا :— بات کرنے سے پہلے آپ نے معافی مانگنا شروع کر دی -

سیموئیل Well, you see we are betrothed and we shell bave to pass the rest of cur lives together;......So you see......I mean...... I mean......we should make the matters clear......

آرورا :— اچھا اس لمبی چوڑی تمہید کے بعد کچھ کہنا بھی ہے -

سیموئیل :— ہاں ...... I mean ...... I mean آپ مجیب نامی کسی اسٹوڈنٹ سے واقف ہیں -

آرورا :— [جسکے چہرے کا رنگ یہ جملہ سنکر متغیر ہو جاتا ہے - لیکن پھر وہ فوراً اطمینان قلب سے جواب دیتی ہے] نہیں -

سموئیل :— نہیں ''But your face was telling a diffrent tale...'' You say ''No'' ..

آرورا:— کیا؟......تم ان الفاظ سے میری توہین کر رہے ہو۔

سموئیل:— [دفعتاً بہت انکساری سے معافی چاہتے ہوئے]

By your pardon Aurora...I'msorry......I'm sorry

......but, but......I did'nt mean to offend...... کیا واقعی آپ اس سے
واقف نہیں ؟۔

آرورا:— اگر واقف ہوں بھی تو کیا؟

سموئیل:— تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ.........کہ.........کہ........

آرورا:— [بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے]........کیا؟........

سموئیل:— یہ.......یہ کہ......[ھمت کر کے] اس نے آپ کو خط لکھا یا آج آپ سے
اس سے ملاقات ہوئی۔

آرورا:— [بے چینی اور بےصبری سے] میں تمھاری آلٹی سیدھی باتوں کا مطلب نہیں سمجھی۔

سموئیل:— اسکے معنی یہ ھیں کہ —

Your'e going to abnadon me for him...That...means...That means...

[آرورا کا چھرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو جاتا ھے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی
ھے۔ لارا دلچسپی کی نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگتی ھے، آرورا
رنجیدہ اور تکلیف رسیدہ آواز میں کہتی ھے]

آرورا:— میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کی شرافت صرف کپڑوں تك
محدود ھے تو میں نے آپ کو پہچاننے میں سخت غلطی کی۔ اس کے معنی یہ ھیں
کہ........(کچھ کہنا چاھتی ھے۔ لیکن غصے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی
پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ھے)

سموئیل:—[تکلّف سے معذرت خواھی کے لہجے میں] How difficult it is to pleaseyou
اچھا۔۔۔۔اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن میں آپ کی گفتگو سے کیا Conclusion نکال سکتا ھوں۔

آرورا:— [کسیقدر آھستگی کے ساتھ نرم اور آھستہ لہجے میں سموئیل کو بھلانیکی کوشش کرتے ھوئے]۔ اچھا بس یہ سمجھ لوکہ کوئی بات پیش نہیں آئی۔

سموئیل:—[بر افروختہ ھوکر] Well ۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے doubts کو Clear کردینا آپ کا فرض ھے۔

آرورا:— Nonsense Samel تم ناحق اسقدر بر افروختہ ھو میں تم سے پورا واقعہ بیان کئے دیتی ھوں۔

سموئیل:— On your word of honour Aurora?

آرورا:— On my word of honour ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سنو واقعہ صرف اتنا ھے کہ اسنے ایك خط میں اظہار محبت کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سموئیل:— And where the dickens that letter is?

آرورا:— In my waste-paper basket.

سموئیل:—مگر آرورا تمکو اسکے خلاف Steps لینا چاھئے تھے۔

آرورا:—یعنی؟

سموئیل:— That young devil requires sound punishment

آرورا:—اس سے تمھارا مدعا کیا ھے۔

سموئیل:— To see the scourdral rusticated

آرورا:— Behave Yourself آپ دیکھتے ھیں
His intentions were honourable. He offered to marry me.

سموئیل:— ?Good! And you are going to marry him

آر ورا :— .Always jumping at wild conclusions ······ تمہارے رشك و حسد کی کوئی انتہا نہیں۔

سموئیل :— Feminine Frailty is capable of anything

آر و را :— Thank you ۔ اور کوئی ذلت کی بات ۔ سوائے ذلت کے آپ سے کیا توقع کی جا سکتی ھے۔

سموئیل :—[پھر جھك کر اسیقدر تکلف سے] I'm Sorry میں نے آپ پر personal attack نہیں کیا ۔ آپ کی Sex ھی بہت زیادہ Inconstant واقع ھوی ھے·······

آر ورا :—آپ میری صنف کی توھین کر رھے ھیں جو میں ھرگز برداشت نہیں کر سکتی····
آخر آپ کا مقصد کیا ھے········

سموئیل:—کچه بھی نہیں·······Of course·······کچه بھی نہیں·······

آرورا:— (عاجز آ کر) اچھا خیر·······[دفعتاً مڑ کر]·······لارا اگر میری جگه تم سے اظہار محبت کیا جاتا تو تم کیا کر تیں ؟

لارا :—[اس اچانك سوال پر کسیقدر چونك کر ، کسیقدر ھچکچا کر] میں···میں····
(کچه سونچکر) یا تو میں اس سے شادی کر لیتی یا اسے محض رسمی دوست بنا لیتی۔ کیونکه خط سے معلوم ھوتا ھے که Sensible آدمی ھے۔

آرورا:— ان میں سے پھلا طریقه میرے لئے نا قابل عمل ھے۔

سموئیل:—?Why

آرورا:—For you are a better fool

سموئیل:— خیر آپ کو اختیار ھے جو چاھیں کھیں ۔ لیکن مجھے Satisfy کر دیجئے که آپ کا Finel decision کیا ھے۔

آرورا:—[اسکی باتوں کی طرف توجه کئے بغیر لارا سے] شادی کیلئے تو مین نے Samel کو انتخاب کر لیا ھے کیونکه اس سے زیادہ خردماغ شریف آدمی مشکل سے ملتا، میرا عقیدہ ھے۔

Choose the greatest idiot for your husband.

اسکے معنی یه هیں که میری زندگی آرام سے گذرے گی، باقی رھا دوسرا طریقه میں اس شخص کو اپنا دوست نہیں بنا سکتی......

There is something about him Idon't like.

سیموئیل:—[خوش هوکر] Then

آرورا:— میں نے ایك بہت اچھی تجویز سونچی ھے۔

سیموئیل:—To marry him and me at the same time.

[اس پر آرورا اور لارا دونوں هنستی هیں]

آرورا:— میں پرنسپل سے جا کر شکایت کروں گی که اس شخص نے میری توهین کی ھے اسکا سدّباب کیا جائے۔

لارا:—اس سے فائدہ؟

آرورا:—لڑکوں کے attitude میں تبدیلی هو جائے گی۔ ان کے سلوك میں شرافت پیدا هو جائے گی جو کوایجوکیشن کے لئے بہت ضروری ھے—ٹھیك ھے نا؟

سیموئیل:—بالکل ٹھیك۔

[پہلے آرورا اور اسکے پیچھے سیموئیل اور لارا باھر جانے لگتے هیں مگر پردہ پہلے هی گر کر ان کو نظروں سے پوشیدہ کر دیتا ھے]۔

دوسرا منظر

[پرنسپل کا آفس۔ درمیان میں ایک بہت اچھی میز اس پر کتابیں اور کاغذات۔ آفس چیر اور آس پاس کچھ اور کرسیاں۔ پردہ اٹھتا ہے اور پرنسپل کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آرورا اندر داخل ہوتی ہے اور پرنسپل اسکی طرف دیکھنے لگتا ہے]۔

ارورا۔میں۔۔۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔۔[کچھ اور کہنا چاہتی ہے مگر ادا نہیں کر سکتی

پرنسپل:۔ اسکی طرف مہربانی کی نظروں سے دیکھکر ہمت افزائی کرتے ہوئے کہتا ہے]۔

پرنسپل:۔ ہاں کہو کہو۔۔۔۔۔ تم کو کیا کہنا ہے۔

اورا:۔ آج ایک طالبعلم نے میری توہین کی ہے۔

پرنسپل:۔ توہین

ارورا:۔ جی ہاں توہین۔۔۔۔۔ میرے نام ایک اہانت آمیز خط آیا ہے۔

[پرنسپل دلچسپی اور غور سے اسکی گفتگو سنتا ہے اور اطمینان کے لئے تیز لہجے میں پوچھتا ہے]

پرنسپل:۔ تمہارا نام کیا ہے؟

ارورا:۔ ارورا سمائلیز

پرنسپل:۔ کس جماعت میں تعلیم پا رہی ہو۔

ارورا:۔ بی۔ اے۔ سینیر۔

پرنسپل:۔ اسی سال یہاں آکر شریک ہوئیں؟

ارورا:۔ جی اسی سال۔

پرنسپل:۔ اس سے قبل؟

ارورا:۔ کیننگ کالج لکھنو۔

پرنسپل:— مضامین کیا کیا ھیں ؟

ارورا:— اردو۔فارسی ۔

پرنسپل:— تعجب ھے۔تم نے یہ مضامین کیوں انتخاب کئے ۔

ارورا:۔ انھی مضامین کے لئے میں یہاں آکر شریک ھوئی۔مجھے مشرقی ادب سے بہت دلچسپی ھے۔

نسپل:— [مطمئن ھوکر] اچھا اب تم ایک کرسی پر بیٹھ سکتی ھو [آرورا بیٹھ جاتی ھے] اچھ
اب کہو تم کو کیا کہنا ھے ۔

ارورا:— ایک خط کے ذریعہ میری اھانت کی گئی ۰۰۰۰۰ یہاں میں نے محسوس کیا کہ طالب علموں
کا طرز عمل بہت زیادہ اچھا نہیں ۔

پرنسپل:— ابھی تو ھمارے یہاں کو ایجوکیشن کی ابتدا ھے ۰۰۰۰۰ [بالکل کاروباری لہجے میں]
ھاں تم کو کیا شکایت ھے ۔

رورا:— یہی کہ بعض ایسے جملوں سے میری اھانت کی گئی ھے جنکو عام حالات میں کوئی لڑکی برداشت
نہیں کرسکتی۔

پرنسپل:— کیا اس کے ثبوت میں وہ خط مجھکو دیا جا سکیگا ۔

ارورا:— جی ھاں [خط دیتی ہے پرنسپل دل ھی دل میں خط پڑھتا ھے اس کے بعد اسکو اسیطرح
بند کر دیتا ھے] ۔

پرنسپل:۔ اچھا مس اسمائلیز میں اس پر غور کرونگا اور پروفیسروں کی ایک میٹنگ میں
اس پر غور کیا جائیگا ، اچھا اب تم جا سکتی ھو۔

[آرورا جاتی ھے، پرنسپل گھنٹی بجاتا ھے چپراسی اندر داخل ھوتا ھے]۔

پرنسپل:— ادریسی صاحب ھیں یا جا چکے ۔

چپراسی:— جی ھاں ھیں صاحب ۔

پرنسپل:— انکو ذرا یہاں بلاؤ [چپراسی جاتا ھے، اور چالیس سکنڈ تک خاموشی طاری رھتی ھے]۔

اس اثناء میں پرنسپل ادھر ادھر کاغذات دیکھتا رھتا ھے پروفیسر صاحب داخل ہوتے ھیں۔ پرنسپل صاحب ان سے ھاتھ ملا کر ایک کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ھیں]۔

پرنسپل :— آپ مس اسمائاز کو جانتے ھیں؟

پروفیسر :— جی ھاں ہمارے یہاں تورتھ ایر میں ھیں .... کیوں کیا کوئی خاص بات۔؟

پرنسپل :— جی ھاں ادریسی صاحب آج ایک اھم واقعہ پیش آیا ھے، جسکا آپ سے ذکر ضرروی ھے۔

پروفیسر :— [دلچسپی اور فکر کا اظہار کرتے ہوئے] جی۔

پرنسپل :— آج اسی لڑکی سے ایک طالبعلم نے اظہار محبت کیا ھے، خط کے ذریعے۔ طالب علم کا نام مجیب ھے۔ آپ جانتے ھیں؟

پروفیسر :— اچھی طرح سے ...... بہت ذھین اوسمجھدار طالب علم ھے۔

پرنسپل :— اب اس واقعہ کی نسبت آپ کا کیا خیال ھے۔ اسنے صرف شادی کی درخواست کی ھے۔

پروفیسر :— بالکل درست۔ لیکن ابھی ھندوستان اس قسم کے واقعات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

پرنسپل :— امیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

پروفیسر :— اس قسم کے واقعات کالج کی بدنامی کا باعث ہوتے ھیں۔

پرنسپل :— لیکن اس نے صرف شادی کی درخواست کی ھے۔

پروفیسر :— معاف کیجئے گا صاحب آپ ابھی ابھی یورپ سے واپس آرھے ھیں۔ وھی فضا آپ کے دماغ میں بسی ہوی ھے یہ ھندوستان ھے۔

پرنسپل :— کیا آپ کا خیال ھے کہ اس طالب علم کا مدعا غیر شریفانہ تھا؟

پروفیسر:— ممکن ہے کہ اسکا مدعا شریفانہ ہو۔ سوال اسکے مدعا کا نہیں ہے، اسکے مدعا کے
اثرات کا ہے۔

پرنسپل:— اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ ملک میں ابھی تعلیم کی کمی ہے۔ ادریسی صاحب خیال
تو کیجئے کہ کوایجوکیشن سے ہمارا ایک مدعا یہ بھی تو ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں
باہم میل جول اور رسا بقے کے بعد اپنے شریک زندگی کو انتخاب کرسکیں۔
پھر اس حد تک تو ہمکو تیار رہنا چاہیئے۔

پروفیسر:— میں پھر یہی عرض کرونگا کہ یہ ہندوستان ہے۔

پرنسپل:— اچھا تو اسکا تصفیہ ہم پروفیسروں کی ایک میٹنگ میں کرین گے۔ مگر اس سے قبل
اس لڑکے سے چند سوالات کر لینا چاہیئے۔

پروفیسر:— بہت بہتر۔ [پرنسپل گھنٹی بجاتا ہے۔ چپراسی آتا ہے]

پرنسپل:— [ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھکر چپراسی کو دیتا ہے]۔ یہ پرچہ مجیب احمد
طالب علم سال چہارم کو لیجا کر دو [چپراسی جاتا ہے] اس وقت چھہ بج رہے ہیں
آج میں بہت دیر تک ٹھہرا رہا۔ میرے خیال میں اس وقت تو کوئی پیریڈ نہ ہوگا۔
ممکن ہے کہ سب لڑکے گھروں کو جا چکے ہوں۔

پروفیسر:— جی نہیں۔ چھ سے سات تک میں فورتھ ایر کی اکسٹرا کلاس لیتا ہوں۔ غالباً لڑکے
موجود ہونگے اور وہ بھی ہوگا [چپراسی، مجیب کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔
مجیب پرنسپل کو سلام کرتا ہے۔ چپراسی چلاجاتا ہے]۔

پرنسپل:— تمہارا نام مجیب ہے؟

مجیب:— جی ہاں۔

پرنسپل:— تمہارے خلاف چند شکایات کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تمہارا چال چلن
قابل اطمینان نہیں۔

یب:— [تعجب کا اظہار کرتے ہوئے] میرا چال چلن؟

پرنسپل :— تمہاری کلاس کی ایک لڑکی مس اسما ناز نے شکایت کی ھے کہ تمنے اسکی اھانت کی ھے۔

مجیب :— اھانت!

پرنسپل :— ھاں اھانت اس طرح کہ تمنے اس سے محبت کا اظہار کیا ۰۰۰۰۰۰۰ میری ذاتی رائے یہ ھے کہ تمہاری شادی کی درخواست بالکل شریفانہ تھی ۰۰۰۰

پروفیسر :— اھم۔

پرنسپل :— لیکن ادریسی صاحب کہہ رھے ھیں کہ یہ ھندوستان ھے۔ یہاں اظہار محبت، اھانت ھے۔ اور چال چلن کی کمزوری کی دلیل ھے۔

مجیب :— میں آپ کو یقین دلاتا ھوں کہ میرا ارادہ بالکل شریفانہ تھا۔

پرنسپل :— مین کب کہہ رھا ھوں کہ تمہاری نیت خراب تھی۔ سوال تمہارے ارادے کا نہیں۔ سوال اس نتیجے کا ھے جو تمہارے ارادے سے پیدا ھوا۔

مجیب :— میرا مقصد تھا ۰۰۰۰ اور اب بھی ھے کہ صرف ۰۰۰۰۰ شادی ۰۰۰۰۰۰ میں نے ھرگز ۰۰۰۰۰۰ میری مالی حالت مجھے طالب علمی کے زمانے میں شادی کرنیکی اجازت دیسکتی ھے۔ میرے والد کو کوئی اعتراض نہیں۔

پرنسپل :— یہ سب صحیح۔ لیکن تم اس کے جذبات کا بھی تو خیال کرو جس سے تم نے محبت کا اظہار کیا — اگرچہ کہ عورتوں میں خود پسندی ھوتی ھے۔ مگر ایک حد تک ۰۰۰۰۰۰ تم نے بہت جلد بازی کی ۰۰۰۰۰۰۰۰۰ تم اس لڑکی کو پہلے سے جانتے تھے۔

مجیب :— صرف صورت آشنا تھا۔ لیکن میں اسکی روح کی گہرائیوں سے اس قدر واقف ھوں کہ بڑے سے بڑا محرم راز بھی واقف نہیں ھوسکتا ۰۰۰۰۰۰۰۰۰ محبت کی طاقت کا اثر ۰۰۰۰۰

پرنسپل :— [تیز لہجے میں] اس قدر جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ۔ اس کا خیال رکھو کہ تم میری موجودگی میں گفتگو کر رہے ہو .... طالب علمی کا زمانہ سیکھنے کا زمانہ ہے ۔ تم کو آدمی بننا ہے ۔ تم کو آگے چل کر دنیا میں کچھ کرنا ہے ...... طالب علمی کا زمانہ عشق بازی کے لئے نہیں ..... آیا تمہاری سمجھ میں .... تمہارے مقاصد بلند تر ہونا چاہئے ...... تم کو ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے ۔ یہ تحصیل علم اور تحصیل انسانیت کا زمانہ ہے ...... کم از کم اسی لحاظ سے تم مجرم ہو ۔

مجیب :— جی ۔

پرنسپل :— اور اپنے جرم کی سزا تمکو معلوم ہے ؟ بہت سخت ۔ غالبا Rustication ..... ذاتی طور پر مجھے تم سے ہمدردی ہے ۔ مگر آئین و ضوابط بھی کوئی چیز ہیں ۔ کل کمیٹی میں تمہارے معاملے پر غور کیا جائے گا اور جس حد تک تمہاری خطا ثابت ہوگی ۔ تمکو سزا دی جائے گی ۔ اچھا (پروفیسر سے مخاطب ہو کر) ادریسی صاحب میں ایک چکر لگا کر ابھی آتا ہوں (اٹھتا ہے) آپ بھی چلتے ہیں ساتھ ؟

پروفیسر :— جی میں ابھی آیا (پرنسپل جاتا ہے ۔ پروفیسر، مجیب کی طرف رحم اور خلوص کی نگاہوں سے دیکھتا ہے) مجیب ۔

مجیب :— جی ۔

پروفیسر :— میں تمکو ہمیشہ تمہارے ساتھیوں پر ترجیح دیتا رہا ۔ تمہاری ذہانت سے میرے خیال میں ادب کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔ یہ تمکو کیا سوجھی ؟

مجیب :— (بےخیالی کے انداز سے) جی

پروفیسر :— تمہارا فرض ہے کہ اپنی ساتھی طالبات کو بہنوں کے برابر سمجھو تم نے بہت

برا کیا۔ تمہارا یہ طرز عمل ایک بڑی حد تک قابل اعتراض ہے ۔

مجیب :— (توجہ کے ساتہ) میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ کوئی طاقت مجھے مجبور کر رھی تہی کہ میں اپنے دل کی کیفیت اسے تحریر کردوں۔ اور اسکے بعد انتہائی شرافت سے شادی کی درخواست کروں۔ میں تخیل میں بہی گناہ گار نہیں آپ کو معلوم ہے ھمیشہ مجھے نا زیبا باتوں سے کس قدر نفرت رھی .....

پروفیسر :— خیر محبت کا اظہار تو تمہاری عمر اور شباب کا تقاضا تہا۔ لیکن عقل اور سمجھہ بہی کوئی چیز ہے ۔

مجیب :— آپ کی عنایتوں کا بہت بہت شکریہ۔ کاش آپ کو معلوم ھو تاکہ میرے قلب میں عقل و محبت کا کتنا سخت معرکہ رہ چکا ہے۔ اور ....

پروفیسر :— وھی شباب کا بہوت — اچھا تمکو یہ معلوم ہے کہ تمہارا خط یہاں کیونکر پہونچا ۔

مجیب :— آرورا کے والد یا منگیتر کے ذریعے ۔

پروفیسر :— نہیں خود آروارا کے ذریعے۔ آس نے خود پرنسپل صاحب سے شکایت کی ۔

مجیب :— (جسطرح کوئی زخم کہا کر بے نصیبی کے احساس کے ساتہ چونک پڑے)۔ ارورا نے ؟

پروفیسر :— ھاں اسی آرورا نے جس سے تمکو محبت ہے۔ آسی نے یہ خط پرنسپل صاحب کو دیا اور شکایت کی اور تمہاری تباھی کا پیش خیمہ تیار کردیا۔ (آگے بڑہ کر مجیب کے شانے پر ھاتہ رکہکر کہتا ہے) ابہی تمہارا بچپن ہے۔ تم نہیں جانتے کہ دنیا کیا بلا ہے ۔

[پروفیسر مجیب کی طرف رحم کی نظر سے دیکہکر چلا جاتا ہے ، مجیب سر جکائے اکیلا کہڑا رہ جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد آرورا داخل ھوتی ہے اور یہ دیکہکر

کہ آفس میں صرف مجیب ھے ٹھٹك جاتی ھے۔ وہ واپس جانیکے لئے مڑتی ھے۔ لیکن مجیب تیزی سے آگے بڑہ کر راستہ روك کر کھڑا ھو جاتا ھے]

آرورا :— میرا راستہ فورا چھوڑ دیجئے ...... ورنہ میں چلاؤنگی ..... کیا شرافت اسی کا نام ھے؟

مجیب:—[کسیقدر افسردہ آواز میں لیکن جوش کے ساتہ]میرا مقصد محض آپ سے ایك بات دریافت کرنا ھے۔ آسکا جواب دیدیجئے۔

آرورا :—[آسی قدر خفگی کے لھجے میں] کیا؟ جلدی کھئے۔

مجیب:— آپ نے میرا خط پرنسپل کو کیوں لا دیا۔ کسی نےمجبور کیا یا آپ خود لے آئیں؟

آرورا :— ترشروئی سے] میں خود لائی ...... کیونکہ [انتہائی حقارت کے ساتہ] مجھے تم سے نفرت ھے۔

[مجیب یك لخت کانپ آٹھتا ھے۔ آرورا اسی بے پروائی سے چلی جاتی ھے۔ مجیب کے چھرے سے انتھائی ناکامی اور ناکامی کے احساس کا اظھار ھوتا ھے وہ اپنا سر دونوں ھاتھوں میں پکڑلیتا ھے]

[پردہ]

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر

[کالج کی عمارت کے سامنے صحن میں کچھ طالب علم باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ انکے ھاتھوں میں کتابیں ھیں۔ ایک آدہ سیکل لئے ہوئے ھے۔]

ایک:— آج کلاس تو غالبا نہوگی۔ اکثر پروفیسر میٹنگ میں گئے ہوئے ھیں۔

دوسرا:— میٹنگ کیسی؟

ایک:— وھی کل والا قصہ۔ مجیب صاحب نے آرورا کے نام ایک نامئہ محبت لکھا اور اسنے پرنسپل صاحب کو لیجا کر دیدیا۔

دوسرا:— ارے رے۔

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ یہ کیا کیا؟ کہ دوست کو دشمن بنا دیا

ایک:— اس میں کالج کی بدنامی ھے۔ کو ایجوکیشن کے مخالقین کو تالیاں بجانیکا موقع مل جائیگا۔

[ابراھیم شملہ باندھے ہوئے کوٹ پہنے ہوئے آتا ھے۔ آسکے ساتھ شمس الدین بھی ھے]

ابراھیم:— السلام والیکم حضت

کئی طالبعلم:— وعلیکم السلام بزرگوار

شمس:— السلام وعلیکم یا جمیع الحاضرین۔

ایک طالبعلم:— ابھی کتنی مرتبہ وعلیکم السلام کھوں حضت۔ اچھا [اپنے پاس کے ایک طالبعلم سے] آپ ان دونوں اصحاب سے واقف ھیں؟ [ابراھیم

کی ظرف اشارہ کر کے] آپ تازہ بتازہ نوبنو گاؤں سے تشریف
لائے ھیں [شمس الدین کی طرف اشارہ کرکے] اور آپ کو
یہاں آکر دو برس ھوگئے ھیں۔ اور دو برس سے آپ ھمارے
شعبئہ فنون مین تعلیم پارھے ھیں۔

ابراھیم :۔ اجی حضرت دس پندرہ منٹاں گذر گئے ابتک آپ لوگاں یا ئینچ کھڑے ھیں۔

ایک طالبعلم :۔ آپ کا انتظار کر رھے تھے۔ حضرت۔

ابراھیم:۔ اج میٹنگ ھے نا کتیں ؟ وہ چھوکری ھے نئیں جی سال چھارم میں۔ آرورا اسمائز
بولتیں سو۔ میں سنا اس کو کوئی عاشخی کا خط لکھیا۔ اور انیں پرنسپل صاحب
سے شکایت کی۔

شمس :۔ واللہ کہ کسقدر مھمل بلکہ لغو بلکہ لاغی اردو اپنی زبان سے ارشاد فرماتے
ھو۔ جو بات کہ رگھائے لبان سے لبوں پر رونق افروز ھو اس میں انتھائی
حلاوت و متانت و لطافت ھونا چاھئے۔ کس قدر کس درجہ بلکہ کس دقیقہ
افسوس اور تاسف بلکہ تاسفات کی بات ھے یعنی افسوس کا محل ھے،
تاسف کا مقام ھے کہ کلیۂ دارالعلوم والفنون میں پڑھنے کے باوجود صحیح
وفصیح وملیح زبان میں اپنی قوت گویائی نہیں صرف کرسکتے۔
حیف صد حیف۔ فاعتبرو یا اولا البصار۔

ابراھیم :۔ اجی کیا ٹنغ ٹنغ لگائیں حضت۔ تمھارے کو کیا آتا جاتا چیچ دوسروں
کو بولتیں حضت۔

ایک طالبعلم :۔ اجی بزرگوار میں نے سنا ھے کہ ارورا کو اپ ھی نے خط لکھا ھے۔

ابراھیم:۔ میں ؟ اجی نہیں حضت۔ کون بولیا بھلا اپ سے۔ یہ جوتے کھانیکی باتاں ھیں۔
میرے کو بھلا عاشخی کرکے کیا کرنے کا ھے۔

دوسرا:— نہیں ابراھیم صاحب نوٹس بورڈ پر تو اپ ھی کا نام ھے۔ پرنسپل صاحب
تو اپ ھی سے بہت ناراض ھیں۔

ابراھیم:—[خوفزدہ ھو کر] اجی سچی کیا جی حضت۔ پر میں خسم کھا توں۔ جسکی بولے
اسکی خسم کھا توں۔ میں کچہ بھی نہیں بولیا۔ کوئی تو بھی میری دشمنی میں
جا کو بولیا ھوگا۔

[سب ھنستے ھیں]

شمس:— افسوس اور تاسف اورصدافسوس اور صد ھزاروں افسوس بر این جہالت
و این ناسمجھی۔ اے مرد عاقل خدا نے تجھے نعمت تمیز سے مالا مال
فرمایا ھے۔ پس تیرا فرض بلکہ فرض العین یہ ھے کہ اپنے عقول کو کام میں
لا۔ فاعتبروا یا اولاالبصار (جاتا ھے)

ایک طالبعلم:— واہ خدا کے فضل سے ھمارے یہاں ایک سے بڑہ کے ایک بزرگ موجود
رھتے ھیں۔[سب ھنستے ھیں]

[وسیم صاحب داخل ھوتے ھیں جن کو پہلا خیال یہ ھوتا ھے کہ سب
لوگ مجھہ پر ھنس رھے ھیں۔ ان لڑکوں سے بچکر گذر جانے کی کوشش کرتے ھیں۔
مگر ان میں سے ایک پکارتا ھے]

طالبعلم:— اجی آداب عرض ھے وسیم۔ ھم لوگوں نے کیا گناہ کیا۔

وسیم:— معاف کرنا ...... جی صاحب ...... جی صاحب[وسیم صاحب بےترشی
سے ھر ایک سے ھاتہ ملاتے ھیں۔ اور اسی کوشش میں ان کی کتابیں
زمین پر گرپڑتی ھیں جن کو وہ بڑی کوشش سے فراھم کرنے اور اٹھانیکے
لئے جھکتے ھیں۔ لڑکے ھنستے ھیں تو وسیم صاحب فی البدیہ یہ مصرع پڑہ کہ

جھنیپ مٹانے کی کوشش کرتے ھیں -]

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

[ظفر اور وحید آتے ھیں - بالکل آھستہ اور بڑے اطمینان کے ساتہ]

ظفر :— آداب عرض ھے - آ - آ - آ - آداب عرض ھے جناب وسیم صاحب (ظفر ھر ایك سے ھاتہ ملاتا ھے اور وحید بھی اس کے ساتہ) کیا قصہ ھے بھئی - وسیم صاحب آپ خیریت سے تو ھیں ؟ -

وسیم :— کیوں، خیریت سے ھوں کیا معنے ؟ ظفر صاحب کاش آپ میں ذرا انسانیت ھوتی ...... جی صاحب -

ظفر :— دعا کیجئے - دو رکعت نماز کی منت مانئے -

وسیم :— کیوں ......

ظفر :— تاکہ آپ کو تھوڑی عقل اور مل جائے .... اچھا ھمارے وحید صاحب آپ نے سنا ھمارے وسیم صاحب شاعر بھی ھیں -

وحید :— اچھا -

ظفر :— یہ آپ ھی کا مصرع ھے - کوا اندھیری رات میں دن بھر اڑا کیا (سب ھنستے ھیں)

وحید :— واہ وسیم صاحب واہ -

وسیم :— ارے اس کی باتیں کیا سنتے ھو جی - میں اور ایسے مھمل شعر لکھوں -

ظفر :— وسیم صاحب آپ ناحق اس قدر انکساری کر رھے ھیں .... اچھا وحید صاحب اور سنئے ھمارے وسیم صاحب کا تازہ ترین شعر یہ ھے -

اغیار بنڈے پھینك کے مارین نہ اے وسیم معشوق کی گلی میں سگ دم بریدہ ھوں

[سب لڑکے بڑے زور سے ھنستے ھیں - وسیم صاحب بگڑ کر کھتے ھیں] -

وسیم :— لعنت اللہ علی الکاذبین -

[چپراسی گذرتا ھے ۔ ظفر پکارتا ھے]

ظفر :— چپراسی او چپراسی ھمارے لئے ایک گلاس میں پانی ۔ ٹھنڈا پانی ۔ جلدی لاو

[آخری الفاظ حلق سے نکال کر مسخرے پن سے ادا کرتا ھے ۔ چپراسی جاتا ھے]

وحید :— اچھا بھئی وہ قصہ کیا ھے ۔ میں نے سنا ھے کہ مجیب صاحب نے آرورا سے اظہار محبت کیا اور اس نے پرنسپل صاحب سے شکایت کی ۔

ابراھیم :— [دفعتاً بہت غصے سے] دیکھیے حضت دیکھیے آپ ۔ چپچ آپ میرے کو بول رئے تہے ۔ مجیب صاحب تو ھیں کتے ، آپ میرے کو ییچ بول رہے تہے ۔ بڑے شرم کی بات ھے حضرت ۔ [سب ھنستے ھیں]

ظفر :— [ھنستے ھیں] کیا قصہ ھے بھئی ؟

ایک طالبعلم :— یہ ابراھیم صاحب بھی ارورا کے عاشقوں میں ھیں ۔

ظفر :— واہ سبحان اللہ کیا عاشق دل پھینک ھیں ۔ وسیم صاحب اب آپ بھی عاشقی شروع کر دیجئے ۔ بسم اللہ ۔ آپ بھی صورت ھی سے غبی اور کند ذھن آدمی معلوم ھوتے ھیں ۔

وسیم :— [غصّے سے] بس جناب سمجھے آپ ۔ ذرا شرافت کی باتیں کیجئے ۔

ظفر :— اسکے آگے یہ بھی تو کہہ دیجئے کہ نہ ھوی قرولی ورنہ بتادیتے گیدی کو ۔۔ وسیم صاحب آپ میں اور نوجی مین کتنا فرق ھے ۔

وسیم :— جتنا مجھ میں اور آپ میں ھے [پھر اس جملہ پر ھنسنے کی کوشش کرتا ھے ۔ لیکن سب کو خاموش دیکھکر خاموش ھوجاتا ھے ۔ چپراسی ظفر کو پانی لا دیتا ھے ۔ ظفر کچھ پی لیتا ھے ۔ پھر مڑکر آھستہ سے وسیم کے پیچھے جا کر شیروانی کے کالر کے اندر پانی ڈال دیتا ھے ۔ وسیم تقریبا اچھل پڑتا ھے ۔ کتابیں زمین پر آکر منتشر ھوجاتی ھیں ، سب لڑکے ھنسنے لگتے ھیں ۔ وسیم کی غصے میں یہ حالت

ھوتی ھے کہ کچھ دیر تک خاموش رہتا ھے - پھر زمین سے ایک کتاب اٹھا کر ظفر کو کھینچ کر مارتا ھے - ظفر ھٹ جاتا ھے - اور کتاب کچھ دور جا کر گرتی ھے - اس پر پھر وھی قہقہہ شروع ھوجاتا ھے]-

وحید :— ارے بھئی ظفر ناحق بچارے کو ستاتے ھو-

وسیم :— اجی ستانا کیا معنی حضرت - جی صاحب ..... یہ بھی کوئی شرافت ھے .... جی صاحب .... یہ بھی کوئی انسانیت ھے - ابھی جا کر پرنسپل صاحب سے شکایت کرتا ھوں (لڑکے کتابیں اٹھا دیتے ھیں - جنکو لیکر وسیم جاتا ھے - سب لڑکے پھر ھنسنے لگتے ھیں)-

وحید :— نیک آدمی ھے بچارا - جانے بھی دو بچارے کو-
اچھا بھئی اب چلنا چاھیئے - یہاں بیکار ٹھہرنے سے کیا حاصل ؟

ظفر اور طالب علم - اچھا چلئے - [جاتے ھیں - پردہ گرتا ھے]-

دوسرا منظر

[مجیب کے مکان کا ایک کمرہ۔ بیچ میں۔ میز پر کتابیں انتہائی بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی ہیں - چند قیمتی کرسیاں ادھر ادھر پڑی ہوی ہیں۔ مجیب ٹھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر سر کے بال پریشان اور الجھے ہوئے۔ وہ بالکل گھر کے روزمرہ لباس میں ہے۔ لیکن قمیض ایک آدہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ وہ تیزی سے ٹھلتا ہے۔ اور اسکی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ چند چکروں کے بعد یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ دوڑنے لگے گا۔

اسی اثناء میں اسکے بھائی حبیب احمد صاحب اندر داخل ہو کر کچھ دیر تک دروازے کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ حبیب صاحب بہت اچھے لباس میں ہیں۔ اپنے لڑکے کی یہ حالت دیکھکر ان کے رنج کا ان کے چہرے سے اظہار ہوتا ہے۔ وہ پکارتے ہیں ,,مجیب،،۔ مجیب اسطرح ٹھٹک جاتا ہے جیسے کوئی خواب سے چونک پڑے۔ حبیب احمد اسکے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں - سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں اور پھر اسے قریب ترین کرسی پر بٹھاتے ہیں - اور ایک کرسی قریب کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتے ہین]

حبیب :- مجیب یہ تم نے کیا اپنی گت بنائی ہے - [مجیب اسکی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے]

مجیب :- اپنی گت۔ بالکل نہیں - کل سے میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ میں دنیا میں ہوں۔

حبیب :- تمھارے بال پریشان اور الجھے ہوئے ہیں - تمھارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ کیا ھیئت ہے۔

مجیب :۔ مجھے خود نہیں معلوم بس اتنا خیال ھے کہ جب پرنسپل صاحب کے یہاں سے میں
گھر واپس آ رہا تھا۔ تو میرے قلب میں ایک ھیجان سا بپا تھا۔ رات لو مجھے
مطلق نیند نہیں آئی۔

حبیب :۔ میں تمکو ملامت نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمھاری عمر میں جذبات کی اھمیت
کسقدر زیادہ ھوتی ھے۔ جذبات کی تیزی کے آگے تم لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔
لیکن تمھاری سمجھ داری سے مجھے اسکی توقع نہ تھی۔ اس سے اگر شادی نہ
ھو سکی تو اور بھی ھزاروں لڑکیاں ھیں۔ یہ رنج و غم تم کو ھرگز زیب نہیں دیتا۔

مجیب :۔ اگر میری جگہ آپ ھوتے۔

حبیب :۔ بیشک اگر تمھاری جگہ مین ھوتا تو میں بھی یہی محسوس کرتا جو تم کر رہے ھو۔
مگر میرا وہ زمانہ گزر کر مدتیں ھوگئیں۔ تجربے اور دنیا نے مجھے بہت کچھ
سکھایا۔

[صالح داخل ھوتا ھے۔ اور دروازے کے قریب حیران ھوکر رک جاتا ھے۔
اسکی نظریں مجیب پر رک جاتی ھیں اور پھر حبیب پر پڑتی ھیں۔ حبیب کو وہ
جھک کر سلام کرتا ھے]

حبیب :۔ آؤ۔ آؤ میاں صالح آؤ۔ دیکھو مجیب نے اپنی کیا حالت بنائی ھے۔ تم ھی سمجھاؤ ۔۔
میں ابھی چند منٹ میں آتا ھوں [حبیب اٹھکر جاتا ھے اور اسکی خالی کرسی
پر صالح بیٹھ جاتا ھے]

مجیب :۔ صالح تمھارے یہاں آنے کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے تم سے جو سخت کلامی کی
تھی اسکی معافی چاھتا ھوں۔ جو شخص تمھارے ایسے دوست پر اعتماد نہ کرے
اسکے جنون میں کوئی شبہ نہیں۔

صالح :— نہیں۔ اس موقع پر تم نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک تھا۔ اسوقت تک تمکو نیک و بد کی کوئی تمیز نہ تھی۔ لیکن تم نے اب میرے مشورے کی اہمیت کو محسوس کیا ہوگا؟

مجیب :— بہت اچھی طرح سے۔

صالح :— اور تم نے دنیا کے انصاف کا معیار دیکھ لیا۔ اگر تم چالاکی اور مکاری سے اس لڑکی کو حاصل کرنے تو نہ یہ جھگڑے ہوتے نہ شکایت ہوتی۔ نہ رسٹیکیشن کا قصہ درپیش ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدنامی ہوتی۔ تو اس صورت میں کیا کم بدنامی ہے۔ اب پاس عزت کا نتیجہ تم نے دیکھ لیا ـــــــ رسٹیکیشن۔

مجیب :— ہاں بہر حال اب تو میرا مستقبل بالکل تباہ و برباد ہوگیا۔ صالح تم جانتے ہو کے کہ پہلی محبت میں ناکامی کسی قدر تلخ ہوتی ہے .... اسکے علاوہ تعلیم برباد۔

صالح :— اگر تم غور کرو تو کوئی چیز برباد نہیں ـــــ محبت تو بچوں کا کھیل ہے۔ پانسہ تمہارے خلاف پڑا تم ہار گئے ـــــ بس اب بچوں کی طرح رونا کیسا۔ باقی رہی تعلیم اس یونیورسٹی میں نہ سہی کسی اور یونیورسٹی میں سہی۔

مجیب :— تم کو یہ چیزیں بہت معمولی معلوم ہو رہی ہیں۔ لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ خود آرورا نے پرنسپل صاحب سے شکایت کی تو یقین جانو میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک طرف محبت ہو اور دوسری طرف انتہائی نفرت۔ پرنسپل صاحب کے کمرے میں اتفاقاً آرورا سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اسکی ہر بات ہر حرکت سے محسوس کیا کہ اسکو مجھ سے سخت نفرت ہے۔

صالح :۔ خیر اب جو گذر چکا گذر چکا۔۔۔۔۔اب غالب کے کہنے پر عمل کرو۔۔۔۔

وحشت بقید چاك گریبان روا نہیں۔

یہاں سے تم بالکل عملی آدمی بن جاؤ۔ عقل سلیم کو اپنا رھنما بناؤ اور جذبات کی پیروی کبھی مت کرو۔ ورنہ جذبات پھر اس مرتبہ کی طرح کسی خندق میں لیجا کر گرادیں گے۔

مجیب :۔ ھوں۔۔۔۔۔۔۔

صالح :۔ ھر انسان کا جھاں ایك مستقبل ھوتا ھے۔ وھاں ایك ماضی بھی ھوتا ھے۔ ابتك تمھارے سامنے مستقبل تھا۔ اب یہاں سے تمھارے پیچھے ایك ماضی شروع ھوتا ھے۔ ھر شخص پر یہی گذرتی ھے۔ تم آج جس مصیبت میں مبتلا ھو۔ اب سے پہلے میں بھی ان مصیبتوں میں مبتلا رہ چکا ھوں۔

مجیب :۔ بیشك صالح دنیا میں ھر شخص کو کوئی نہ کوئی مصیبت دی جاتی ھے۔ مجھے حسرت رہ گئی کہ آج تك کوئی ایك شخص تو ایسا ملتا جو کامل مسرت اور خوشی سے زندگی بسر کرتا ھو۔ مگر ھر شخص۔۔۔۔۔۔۔۔ھر شخص کا چھرہ مصیبتوں اور ناکامیوں کی ایك زندہ دستاویز ھے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایك ھیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

صالح :۔ یقیناً اس حد تك تمھارا خیال بالکل صحیح ھے کہ خدا نے ھر شخص کو بے انتہا آلام و مصائب عطا کئے ھیں۔ مگر اس سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ھے کہ یہی آلام و مصائب یہی ناکامیاں زندگی کو حقیقی شان عطا کرتی ھیں۔ انسان کی روح اسیوقت جلا پاتی ھے جب اس پر پیہم مصیبتیں پڑتی ھیں۔۔۔۔۔۔۔۔دنیا کے تمام بڑے بڑے رھنماؤں کی زندگی کو لے لو۔ ان میں سے ھر ایك کی زندگی مصیبتوں کا

ایک گہوارہ ہے۔ یہ سب فطرت کے قوانین ہیں۔ فطرت کی سختیاں محبت کو چھپائے ہوئے ہیں۔

مجیب :— یہ سب صحیح۔ لیکن جب مصیبت پڑتی ہے، تب اسکی تلخی کے سوا دنیا کی اور کوئی چیزیں نظر نہیں آتی۔ دنیا کی ہر چیز تلخ اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ اسوقت کی دماغی کیفیت خدا دشمن پر بھی طاری نہ کرے۔

صالح :— یہ دلکی کمزوری ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اگر وہ شکست کھائے بھی تو شکست کا اعتراف نہ کرے۔ اس سے اسکی قوت عمل بر قرار رہتی ہے۔ مجیب زندگی کی مصیبتوں کو راحت سمجھ کر قبول کرنا چاہیئے۔ ان سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ یہ کامرانی اور کامیابی کی نشانی ہے۔

مجیب :— یہ سب صحیح ...... لیکن صالح ..... [چہرے سے انتہائی قلبی اذیت کا اظہار کرتے ہوئے] میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا دماغ بے قابو ہے ...... یہ زندگی کا پہلا موقع ہے .... غالباً یہ جنون نہیں؟.....

صالح :— جنون؟...... جنون ہرگز نہیں۔ یہاں سے تمہاری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ تمہاری زندگی کے ایک موسم کی تبدیلی کی نشانی ہے ..... تمہاری موجودہ ذہنی کیفیت ایک گذرتی ہوئی تیز ہوا ہے۔ جسکے گذر جانیکے بعد دماغ پھر امن وسکون سے آرام پانے لگے گا..... سمجھے ..... اچھا اب اپنی محبت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

مجیب :— [چہرے سے تکلیف کا اظہار اور حرکات وسکنات سے بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے] ایک خوفناک خواب

[جیب دوبارہ اندر داخل ھوتا ھے۔ اس سے ایک قدم پیچھے وحید بھی آتا ھے۔ جیب کے چھرے سے متانت و سنجیدگی اور وحید کے چھرے سے مسرت کا اظہار ھوتا ھے]

مجیب :۔ مجیب تمھارے دوست وحید صاحب آئے ھیں۔ اور تمھیں ایک خوشخبری سنائیں گے۔

[مجیب کچھ کہنا چاھتا ھے .... لیکن وحید جلدی سے آگے بڑھکر کھتا ھے]۔

وحید :۔ مبارک مجیب تمھارے رسٹیکیشن کی تجویز مستر دھوگی[مجیب حیرت و حسرت کی ملی جلی نظروں سے اسکی طرف دیکھتا ھے]۔

صالح :۔ کیا ؟

وحید :۔ میٹنگ میں بڑی زبردست بحث ھوئی۔ بالآخر تمھارے حق میں فیصلہ ھوا۔ رسٹیکیشن کی تجویز مسترد ھوگی۔

[صالح ایک اطمینان کی سانس لیکر کرسی کا سہارا لگا کر آرام سے بیٹھتا ھے۔ مجیب وحید کی طرف کھوئی ھوئی نظروں سے دیکھتا ھے پھر رفتہ رفتہ مسرت کے جذبات اسکے چھرے سے ظاھر ھونے لگتے ھیں]۔

حبیب :۔ [مسکرا کر پہلے مجیب سے اور پھر صالح سے مخاطب ھوکر] ایک عجیب تر بات یہ ھیکہ ابھی ابھی آر وراا سبا ئلزکی ایک چٹھی مجھے ملی۔ جس میں مجھ سے ملنے کی خواھش ظاھر کی گئی تھی ....۔

[سب کے سب تعجب کی نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگتے ھیں] ۔

حبیب :۔ اور میں نے جواب میں لکھدیا کہ اسوقت میں گھر ھی پر ھوں اور وہ یہاں آکر مجھ سے مل سکتی ھیں۔ غالباً کچھ دیر میں وہ یہاں آجائیں گی۔

[مجیب کے چہرے سے پے در پے مسرت، تعجب اور پریشانی کا اظہار ہوتا ہے۔ صالح تعجب سے حبیب کی طرف دیکھنے لگتا ہے، جو مجیب کی کرسی پر ایک ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہتی ہے۔ اور حبیب باہر چلا جاتا ہے۔ مجیب کی آواز اس خاموشی کو توڑتی ہے]۔

مجیب:— واقعات کس تیزی سے پے در پے رنگ بدل رہے ہیں۔ میرا دماغ بالکل بیکار ہوتا جا رہا ہے چوبیس گھنٹے کے قلیل عرصے میں حالات کس تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں (وہ بیٹھے بیٹھے آگے کی طرف جھکتا ہے اور دونوں ہاتوں سے اپنا سر پکڑ لیتا ہے)۔

وحید:— مجھے خود انتہائی حیرت ہو رہی ہے۔

صالح:— حیرت کی کوئی بات نہیں۔ محبت اور نفرت کے جذبات باہم اسقدر ملے جلے ہیں کہ اکثر وہ آپس میں بدلتے جاتے ہیں۔ اور پھر عورتوں کی طبیعت کا تلون تو معلوم ہی ہے۔

وحید:— محبت اور نفرت کے جذبات کی یکسانی میری سمجھ میں نہیں آتی۔

صالح:— محبت کی طرح نفرت بھی ایک تعلق ہے۔ نفرت اور بے تعلقی میں زمیں و آسمان کا فرق ہے۔ اگر نفرت ہی ہو تو وہ بھی ایک تعلق ہے۔ غالب کا وہ شعر ہے نہیں؟

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو   کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ہمارے شعراء میں زندگی کو سب سے زیادہ غالب ہی سمجھ سکا اور یہاں اس شعر سے بھی یہی مطلب ہے۔ عداوت اگرچہ کہ منفی تعلق ہے لیکن تعلق ضرور ہے۔ اگر ہمکو کسی چیز کی ممانعت میں دلچسپی ہے۔ تو اسکے معنی یہ ہیں کہ ہمکو اس چیز سے دلچسپی ہے اور بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ہماری دلچسپی رخ بدل دیتی ہے۔ یعنی بجائے اسکی مخالفت

میں دلچسپی لینے کے خود اس چیز سے دلچسپی ہو جاتی ہے۔ اسطرح نفرت، محبت سے بدل جاتی ہے۔

وحید:۔ ٹھیک ہے اور غالباً یہی قصہ یہاں بھی در پیش ہے۔

صالح:۔ بالکل یہی۔

وحید:۔ مگر واہ تاسف بھی ہوا تو کب۔

کی مرے قتل کے بعد اسنے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

[حبیب تیزی سے قدم اٹھاتا اندر آتا ہے۔ صالح اور مجیب دونوں سے مخاطب ہوکر کاروباری اور رازدارانہ لہجے میں باتیں کرتا ہے]۔

حبیب:۔ وہ لڑکی یہیں آگئی ہے۔ میں اس سے باتیں کر رہا تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مجیب:۔ ہوں۔ صاله هم

حبیب:۔ اس کی گفتگو سے اس کا منشا کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔ وہ اپنے کئے پر متاسف ہے کہ اس کی وجہ سے مجیب کو اس درجہ ذہنی اور قلبی تکلیف ہوئی رسٹیکیشن کی تجویز کے مسترد ہو جانیکا قصہ سنکر وہ بہت خوشی ہوئی۔

صالح:۔ جی۔

حبیب:۔ وہ اپنے کئے پر متاسف ہے۔ اور باوجود یکہ اس نے صاف الفاظ میں نہیں کہا تاہم اس نے اپنا ما فی الضمیر ادا کر دیا کہ تلافی مافات کے لئے وہ مجیب سے شادی کر لینے پر تیار ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

[مجیب چونک پڑتا ہے۔ اور کرسی کے بازو کا سہارا لیکر اٹھکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حبیب اس کے شانے پر ہاتھ رکھکر پھر اس کو بٹھا دیتا ہے]۔

حبیب :— میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ خود مجیب سے اس معاملے میں گفتگو کرلے [صالح اور وحید سے] چنانچہ آپ دونوں دوسرے کمرے میں تشریف رکھئے۔ میں آرورا کو یہیں بلائے لیتا ہوں۔

[صالح اور وحید جاتے ہیں اور ان کو پیچھے حبیب۔ ایک لمحے تک کامل خاموشی میں مجیب تنہا رہتا ہے۔ اس کے بعد حبیب آرورا کے ساتھ واپس آتا ہے]۔

حبیب :— (اورورا سے معذرت کے لہجے میں) اس کمرے کی ظاہری حالت دیکھکر آپ کو تکلیف ہورہی ہوگی لیکن کل سے ...... کل سے .... (آرورا کے چہرے کا رنگ فق ہوجاتا ہے) میرا مطلب ہے کہ مجیب کی طبعیت ذرا پریشان رہی۔ اور اسی وجہ سے سامان اس قدر تتر بتر ہے۔

رورا:— [آسان اور کمزور لہجے میں] جی کوئی بات نہیں۔

حبیب:— میں سمجھتا ہوں کہ میری موجودگی ضروری ہے۔

آرور:— جی۔

حبیب :— معاف کیجئیے گا مس اسمائاز بھائی ہونیکی حیثیت سے مجھ پر چند اہم ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے مین نے اپنے بھائی کو بہت زیادہ آزادیاں دے رکھی ہیں۔ پھر بھی میرے کچھ فرائض ہیں۔

آرورا :— جی۔

حبیب :— [اکتا کر] میری وجہ سے آپ مطاق تکلف نہ کیجئیے۔ جو کچھ آپ کو کہنا ہے مجیب سے صاف صاف بیان کردیجئیے۔ [حبیب کمرے کے انتہائی سرے پر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور مشغلتاً ایک کتاب اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے]۔

مجیب :— میں اسمائاز میں آپ کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آرورا :۔ مطلق نہیں [اس کے چہرے سے جذبات کی رقت کا اظہار ہوتا ہے] میں
یہاں ایک خاص بات کہنے آئی تھی ۔

مجیب :۔ جی کیا ؟

آرورا [پہلے کچھ ہچکچاتی ہے ۔ اس کے بعد کہتی ہے] کیا آپ میرے ناخوشگوار طرز عمل
کو معاف فرمائیں گے ۔

مجیب :۔ آپ کا طرز عمل ہرگز ناخوشگوار نہ تھا ۔ آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا
چاہئے تھا ۔

آرورا :۔ ہرگز نہیں ۔ مین جانتی ہوں اپ کو کس قدر قابی اذیت ہوئی ہوگی ۔ یقین
مانئے مجھے یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے رسٹیکیشن کی تجویز مسترد
ہو گئی ۔

مجیب :۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ۔

[اس کے بعد خاموشی چھا جاتی ہے ۔ ارورا کچھ کہنا چاہتی ہے مگر نہیں
کہ سکتی ۔ حبیب اس حالت کو محسوس کر کے اپنی جگہ سے اٹھتا ہے] ۔

حبیب :۔ مس اسمائاز میرا خیال ہے کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں ۔ اس کو ادا کرنے
میں آپ کو زحمت ہو رہی ہے ۔

[آرورا سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیتی ہے] ۔

حبیب :۔ غالباً میں آپ کا مافی الضمیر ادا کر سکوں گا ۔ میرے خیال میں آپ یہ
بولنا چاہتی ہے کہ آپ کو مجیب کی درخواست منظور ہے ؟

[آرورا کے چہرے سے شرم اور سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے ۔ سر کے
اشارے سے وہ پھر اثبات میں جواب دیتی ہے]

حبیب :— [نرم لھجے میں سنجیدگی سے] جسکا مطلب یہ ھے ...... کہ آپ مجیب سے شادی کرنے پر آمادہ ھیں

[اس پیہم اصرار پر آرورا کے چھرے سے تھکن کا اظھار ھوتا ھے ۔ اور وہ آھستہ سے ,, ھاں ،، کھتی ھے ۔ مجیب اس اثناء میں برابر جمی ھوئی نظروں سے سکی طرف دیکھتا رھا ھے] ۔

مجیب :— مس اسما ناز کیا میں دریافت کر سکتا ھوں کہ میرے بھائی نے جو الفاظ کھے وہ اپکے ما فی الضمیر ھیں ؟

آرورا :— [پھلے کسیقدر مسکرا کر پھر مستعدی سے صاف صاف پیرایے میں] جی ھاں ...... میرا خود بولنا ضروری ھے غالباً مجھے صاف صاف الفاظ میں یہ کھہ دینا چاھئے کہ میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف ھوئی مجھے اسکا احساس ھے اور تلافی مافات کا ذریعہ یھی ھے کہ آپ نے جو تحریک کی تھی اسے میں .... مان لوں ۔

مجیب :— [اپنی ساری سراسیمگی اور بدحواسی چھوڑ کر انتھائی صاف اور واضح پیرائے میں] مس اسما ناز آپ کی اس عنایت کا بھت بھت شکریہ ۔ اگر چوبیس گھنٹے قبل میں آپ کی زبان سے یہ الفاظ سنتا تو غالباً مارے خوشی کے زندہ نہ رہ سکتا ۔ لیکن اس چوبیس گھنٹے کے عرصے میں میرے ذھن نے خوفناك ترقی کی ھے ۔ میں یہ محسوس کر رھا ھوں کہ میری عمر میں دفعتاً کئی سال کا اضافہ ھوگیا ھے ۔ مجھے خود اپنی پھلی کیفت پر تعجب ھوتا ھے ...

[آرورا کا چھرہ خلاف توقع جواب سنکر حیرت کی تصویر بنکررہ جاتا ھے ۔ پھر بھی گفتگو کے آخری حصہ اور انجام سننے کا اشتیاق اسکے چھرے سے ظاھر ھوتا ھے ۔ حبیب دونوں ھاتہ جیب میں رکھکر مجیب کی طرف متعجب نظروں سے دیکھتا ھے ۔

مجیب یہ الفاظ ادا کر کے ایک دو سکنڈ کے لئے ٹھہرتا ھے ۔ اور اسکے بعد انتہائی غم ناک لہجے میں وہ آخیری الفاظ ختم کرتا ھے]۔

مجیب :۔ میرے ذھن کو صدمہ پہنچا وہ اسقدر خلاف توقع اور اسقدر سخت تھا کہ میری قوت احساس تقریباً ختم ھوگئی ۔ آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ ۔ لیکن میں اب ایک ایسا انسان ھوں جسکا دماغ ٹوٹی ھوئی کشتی کی طرح سمندر کی لہروں کے رحم پر ھو ۔ اس ٹوٹی ھوئی کشتی پر کسیکو بٹھانا اسکی زندگی کو خطرے میں مبتلا کرنا ھے .... دوسرے الفاظ میں میری ذھنی کیفیت اسکی اجازت نہیں دیتی کہ میں آپ کی عنایت سے فائدہ اٹھا سکوں ۔

حبیب :۔ [انتہائی تعجب کے لہجے میں] اسکے معنی یہ ھے کہ تم شادی سے انکار کر رھے ھو۔

مجیب :۔ جی ھاں [آرورا سے] مس اسمائلز مجھے بہت افسوس ھے کہ میں آپ کے جذبات کو صدمہ پہنچا رھا ھوں ۔

آرورا :۔ [جسکا چہرہ بالکل زرد ھے ۔ بہت پست آواز میں کہتی ھے] مطلق نہیں [اور پھر وہ جانیکے لئے مڑتی ھے ۔ حبیب اسکے ساتھ باھر تک جاتا ھے اور پھر واپس آجاتا ھے ۔ مجیب ایک گہری سانس لیکر اٹھ کھڑا ھوتا ھے ۔ اور ٹہلنے لگتا ھے ۔ حبیب اسکی طرف دیکھتا رھتا ھے]

[اور اسی حالت میں چند خاموش لمحے گذر جاتے ھیں ۔ پھر پردہ گرتا ھے]

PRINTED AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS 1932—C4850

شمارہ چہارم

شمارہ دوم و سوم

جلد چہارم

شمارہ اول

شمارہ دوم

سوم و چہارم

جلد سوم

شمارہ اول

شمارہ دوم

شمارہ سوم و چہارم

جلد دوم

شمارہ اول

شمارہ چہارم

جلد اول

شمارہ اول

شمارہ دوم و سوم

Vol. V, No. 3.

Vol. V, Nos. 1 and 2.

Nos. 2 and 3.

No. 4.

No. 2.

Nos. 3 and 4.

Vol. III, No. 1.

No. 4.

Vol. II, No. 1.

Vol. I, No. 1.

Nos. 2 and 3.

SUCCESSION

LIST OF EDITORS

(*a*) *The English Section.*

1. Mr. S. Fazle Haq, B.A. (*a*).
2. ,, M. Abdul Jalil, B.A. (*b*).
3. ,, M. A. Qayyum Khan, M.A. (*c*).
4. ,, Mehdi Ali Siddiqi, M.A., LL.B. (*d*).
5. ,, B. N. Chobe, B.A.

(*b*) *The Urdu Section.*

1. Mr. S. Ghulam Mohiuddin Qadri, B.A. (*e*).
2. ,, S. Moinuddin Quraishi, B.A. (*f*).
3. ,, M. Jalaludin, B.A., LL.B.
4. ,, S. M. Akbar Wafaqani, B.A. (*g*).
5. ,, Shaikh Chand, B.A. (*h*).
6. ,, Nabiul Hasan, B.A. (*i*).
7. ,, Ghulam Dastagir, B.A. (*j*).
8. ,, S. M. Murtuza, B.A.
9. ,, Raza Husain Khan, B.A.

(*a*) M.A., Lecturer, City Intermediate College, (*b*) Finance Office, (*c*) Research Scholar, (*d*) H. C. S., (*e*) M.A., Ph.D., Assist. Prof., O. U. C., (*f*) M.A., Headmaster, Asafia High School, (*g*) President, Historical Soc., (*h*) M.A., (*i*) Tahsildar, (*j*) Research Scholar.

EDITORIAL

IT is, we believe, the first occasion since the editorship of Mr. Abdul Jalil that it has been possible to bring out five issues of this section of the magazine in one year. It has been a very pleasant duty, and now we take leave of our readers, offering a few suggestions based on our experience.

We think that the work involved in editing the English section might be divided, on the lines indicated in our issue Vol. V, Nos. 1 and 2, between an editor and a sub-editor, the latter to be selected on the recommendation of the former.

While the Urdu section was being printed in lithograph there might have been reason to keep it double the size of the English section; but now, when both sections appear in type, there can hardly be any justification for this. The number of pages thus saved might be equally distributed between the three vernaculars of Hyderabad not represented in the magazine,—Marathi, Kanarese and Telugu. Sufficient space should be allotted to allow each to have an opportunity to contribute on equal terms with Urdu and English.

Of the prizes announced in Vol. IV, No. 4, Prof. E. E. Speight's prize goes to Mr. Syed Vahiduddin, B.A. for his article on Psychical Research which was adjudged the best article during the year.

As we did not receive any article for the special competition announced in the same issue, it is now closed.

In conclusion we have to thank those of our friends who have transformed our labour of love into a lovable labour.

B. N. CHOBE.

PRINTED AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS, 1932—C5705

with mysticism. Their growing tendency to do away with form and to emphasise the content is highly mystical in character. ' How does it come about? When a person who calls himself *I* and refers to himself as *My* or *Me* ponders deeply and earnestly (i.e. contemplates) on who or what, how and why I am, he is bound to arrive at some answers to such questioning of himself. If and when he thinks that those answers are correct and satisfactory, he has a conviction, and this conviction puts his mind into a certain attitude I call Tasawuf, whether Vedantism or Sufism '. But this ignores the important difference between a philosopher and a mystic. While one builds a coherent system and reaches conclusions by a process rationalistic through and through, the other finds the Reality by means of self-purification, self-mortification and intuitive insight. It is sometimes difficult, however, to draw a line of demarcation. The mystical elements in the philosophy of Plato and Bergson are, indeed, preponderating. There are so many sweeping generalisations made in this brief treatise which one would like to be illustrated by referring them back to the original writings of a few eminent mystics. As mystical experience is purely subjective and can only lead to confusion if expressed in words, no final judgment can be pronounced on its validity or otherwise by those who have no access to it. When mystics themselves adopt the sane agnostic attitude symbolised beautifully in that story of the Hindu saint who, on being questioned thrice on the essence of Reality, characterised silence as His essence, it befits us to follow their example.

S. VAHIDUDDIN,
V YEAR (PHILOSOPHY.)

time to devote to the contemplation of the ultimate values of life. Nawab Sir Amin Jung has now given us an opportunity to see for ourselves his brief treatise which was read before the Islamic Association. Glad as we are to know the trend of his thought, inseparable is the gulf that divides us. We should like to see the grounds on which Sufism and Vedantism are completely identified. While there are striking similarities between the two, and while Islamic Sufism might have been influenced by Vedantism they cannot by any stretch of imagination be treated as alike. Prof. Nicholson at least does not treat them as such. Secondly, the psychological basis of religious mysticism is not thoroughly appreciated, and no attempt is made to distinguish mystical experience from the pathological condition of the hysteric and the epileptic. Says the writer: 'I for one believe that Sufism is not inconsistent with science, because the good and evil resulting from the Sufi outlook is in accordance with the psychic discoveries of great psychologists like Freud and his disciples Jung and Adler.' Now such a statement confuses schools that fundamentally are at variance with one another. Jung and Adler are the former disciples of Freud who seceding from the Freudian school differ more or less radically from their master. To us, on the contrary, the trend of modern psychology is distinctly hostile to mysticism and religion. Prof. Leuba, a profound student of religious mysticism, takes by no means a favourable view of mystical phenomena. The distinguished Italian criminologist, the late Lombroso, approvingly cites a passage from Dostoievsky wherein one of his characters describes in a highly mystical vein the feeling of beatitude and harmony that he felt at the approach of his epileptic fits. As the modern psychiatrists approach the subject from the experience accumulated in the course of their vast researches in neurosis and other mental and sexual aberrations their point of view cannot be different. Though we do not see eye to eye with those extremists who find nothing of value in mystical experience save the unrestrained phantasies of sexual perverts or the insane we simply contend that the latest development of psychological thought is not favourable to mystical experience. But mysticism need not despair. All the great religions of to-day are now saturated

subjects as the following: Shaw and Shakespeare, Shaw and America, Shaw and the Actresses, Shaw and the Censor, Shaw's Women, Shaw's Socialism, Shaw's Religion, and Shaw's Future.

In the end there is a Postscript by Shaw, that makes the book a little more interesting. In his typical manner the hero of the biography retaliates upon the biographer, and in spite of paying full tribute to the merits of Harris, quotes an epigram of Oscar Wilde, to do himself justice: 'Frank Harris has been received in all great houses—*ONCE*.'

Considered from all angles, the only conclusion that one can reach, is the same as that of Shaw himself:

'In spite of the fame of his *Life of Oscar Wilde*, it is not really a biography. It is a series of impressions——'.

AZIZ AHMAD,
IV YEAR.

Lucknow University Union Journal

Annual Number 1932.

The paper before us contains three sections—English, Hindi and Urdu, and puts before the world the achievements of the students of the Lucknow University. *The Convocation Address* by Prof. Radhakrishnan, *The Psychology of the Khaddar Movement* by Mr. Shaikh Ehtisham Ali (the President of the Union Society) and *O'Love* by Mr. K. S. Gupta are very good, while some of the pieces are 'poor indeed.' A brief sketch of the University in Hindi and the description of the Mushaira in Urdu are also good. But rare is that element characterised by the motto of the University as spiritual 'Light and Learning.'

B. N. CHOBE.

The Philosophy of Fakirs

[*Notes of Talks on Vedantism* alias *Sufism before The Islamic Association, Theosophical Hall, by Nawab Sir Amin Jung Bahadur.*]

It is highly gratifying to note that even those whose life is chiefly devoted to the affairs of administration should find

REVIEWS AND REVALUATIONS

Bernard Shaw

By

FRANK HARRIS

ONE of the most remarkable contributions of the season to the literature of the year, is an interesting biography of Bernard Shaw by no less a person than Frank Harris. Frank Harris died immediately after finishing the last chapter, and as a very peculiar instance of the irony of life, the proof-sheets were left to be corrected by Bernard Shaw himself. Even Shaw had to admit: 'I have had to do many odd jobs in my time, but this one is quite the oddest.'

This is a portrait of Shaw the man, rather than a criticism of his works. The personality of Shaw the man, who cannot be separated from Shaw the Author, has been handled in a peculiar, yet typical Harrisian manner. Though Harris declares in the very beginning 'I know him to be a far better man than Wilde', yet there can be nothing as different as this biography, from his famous, sympathetic 'Life of Oscar Wilde.' Then he was a friend, the defender of a man who was condemned by society and law; here he plays the prejudiced rival, and takes no pains to hide his feelings. The book contains a few very curious outbursts of sentiment and sensitiveness, that can never be counted as merits in a biographer.

Frank Harris was a very close personal friend of Bernard Shaw, and he has said a few remarkable things about the man. But Shaw the Author deserves better treatment than he has received from him.

There are some very typical Harrisian epigrams, which might amuse the reader very much; such as:

'Our dear Shaw, a man of no principles, swears by many.'

In spite of his anti-Shaw spirit Harris has his 'fits of appreciation'. The various chapters deal with such journalist

Members .... 1. Rajeshwar Rao.
2. Ganpat Rao.
3. Venkat Ram Rao.
4. Govind Rao Pavar.

Games Secretary .... Kishen Rao Manvihar.

Secretary, Dramatic Assocn. .... Bindaprasad Srivastav.

Historical Society

President	.... Mirza Mahmood Ali Beg, B.A.	
Vice-President	.... M. Azam	iv.
Secretary	.... Sheshgir Rao	iv.
Asst. Secretary	.... Raziuddin	iv.
Treasurer	... Daliluddin	iii.
Editor, Khazina	.... S. M. Ahsan	iv.
Members	.... 1. P. Kishen Rao.	
	2. Bashir Husain.	
	3. Govindprasad.	
	4. Naziruddin.	
	5. S. Muslim.	

Law Association

Vice-President .... S. Mahmood Ali (Final).

Secretary .... Ismail Ahmed Meenai (Previous).

Treasurer .... Iftikharuddin (Previous).

Editor, Law Magazine .... Muslihuddin (Previous).

Members .... 1. Bashir Ahmad (Final).
2. Anna Rao (Final).
3. Ramchandra Rao (Previous).
4. Venkab Rao (Previous).
5. Abul Khair Mazharul Haq Siddiqi (Previous).

We have to congratulate Mr. Shanker Rao Jadhav on his praiseworthy success in the M.B.B.S., and Mr. Govinda Rao Deshpande on his selection for Tahsildarship. It is gratifying to note that Mr. Chandrakant Godsey, ex-President of our Sabha, has been selected in the H. C. S. and we take this occasion to congratulate him on his meritorious success.

In conclusion, we have much pleasure in recording our grateful and sincere thanks to our Superintendent, Prof. Shiva Mohan Lal, for the keen interest he evinced in the affairs of the Vidya Prakash Sabha.

P. KISHEN RAO,
Secretary.

ELECTION RESULTS

Union Society

President .... S. M. Murtuza, B.A.
Secretary .... B. Shamsunder, B.A.
Librarian .... Nazar Md. Khan.
Asst. Treasurer .... Abulkhair S. Ibrahim Husain
Members ....
1. Ghous Mohiuddin Razvi.
2. Muslihuddin.
3. Nazir Hasan Afandi.
4. Rashiduddin.
5. Ahsan Aziz.
6. S. Md. Ali.
7. Jamil Ahmad.
8. Azmatulla.

Vidya Prakash Sabha Hindu Hostel

President ...., P. V. R. Narsiah.
Secretary .... Keshav Rao.
Asst. Secretary .... Hiralal Kotecha.
Librarian .... P. Kishen Rao.

On the 16th of August 1931, we had a Hindi recital comprising *Ramcharit Manas*, the *Megh Duth* of Lakshman Singh and a few songs from Behari and Sūr.

Besides the local dailies we were taking *The Bombay Chronicle*, *The Modern Review* and *The Health*, the *Adabi Dunya* in Urdu and *The Bharati* in Telugu. We thank the Superintendent for lending us *the Kalyan* in Hindi and expect a further extension of his kindness towards the Library.

It may be remarked that under the auspices of our Sabha four extraordinary meetings were held during this year. On the 28th of Mehar 1340, Prof. Shiva Mohan Lal delivered a lecture on the *Importance of the Gita.* On the 10th of Dai 1341, Dr. Haridatt Sharma of S. D. College, Cawnpore, delivered a lecture in English on *The East and the West.* On the 11th of Dai Dr. Yusuf Husain Khan delivered a lecture on *Indian Nationalism.* On the 3rd of Mehar, P. Kishen Rao read a paper on *India and Federalism.*

Two meetings of the Association of Economics and Sociology were held in our Hall on the 12th of Mehar and the 3rd of Aban, the subjects respectively being— (1) Political Sovereignty is Necessary for the Economic Development of India, (2) The Purdah System is a Blot on Civilization.

On the 5th of November 1931 in a meeting held under the auspices of the Historical Society in our hall, Mr. Janaki Ram Pant read a paper on *Mussolini the Dictator.*

We had the good fortune to have Mr. Shanker Rao Jadhav, one of the best cricketers, as our Games Secretary, but unfortunately we lost the ground where we formerly used to play. Though our achievements in the field of sports were almost nil, our students got honours in literary activity.

P. Kishen Rao got the second prize in English elocution competition held on the College Day. Mr. V. Bheemiah secured a prize for Chemistry in Junior B.A. and Mr. K. V. Rama Rao obtained a prize in languages in the Junior Intermediate. Mr. P. G. Kulkarni, ex-Games Secretary, stood first in first division in LL. B. Previous.

NEWS AND VIEWS

Annual Report of the Vidya Prakash Sabha, Osmania University Hindu Hostel.

1340-1341 F.

UNDER the presidentship of the Warden of the Hindu Hostel, the election of the cabinet for the year 1340-1341, took place on the 17th of Shahrewār 1340. An attempt will be made in the following lines to show how far we succeeded in realizing the hopes entertained about us by the previous ministry.

On the 29th of Mehar the festival of Janama Ashtami was celebrated with usual splendour and we arranged a lecture on 'Lord Krishna's Life and Teachings' by Mr. Digambar Das Chowdhary. It is with immense regret that we learnt of the sad news of his sudden demise and we offer our sincerest prayers: 'May his departed soul rest in peace.'

The students of the Hostel staged the *Bhishma Pratiggya* in Hindi on the 19th of Aban at the Reddy Vidyalaya Hall. A medal was awarded to the best actor, Mr. Chandrakant Godsey, and a prize was given to Mr. Binda Prasad Srivastava, Secretary of the Dramatic Association, Hindu Hostel. He also secured a prize in the *Forced Marriage* presented on the College Day.

In the course of the *Dipavali Celebrations*, which fell on the 5th of Dai 1341, we enjoyed a gramophone entertainment.

Holika and *Ugadi* which fell, respectively, on the 19th of Ardibahist and the 2nd of Khurdad completed the year's festivals.

It may be noted that on the 25th of Aban 1340, we went on an excursion to Gandipett and Himayat Sagar. Later on some of our members went to the Nizam Sagar also.

Thirteen debates were held during the period under review; seven in Urdu, and six in English.

ಕಾಡು ಕುಸುಮದಂತೆನಕ್ಕು
ನಲಿದು ನೀನು ಸೊಗದಿಬಾಳು
ಮೇಲುಕೀಳು ಎಂಬುದೆಲ್ಲ ಅಳಿದುಹೋಗಲಿ
ನಾಡದೇವಿಗೆಂದು ದೇಹಮುಡುಪದಾಗಲಿ

(May you smile like a flower blooming in a forest—Forget all the differences—May your body be sacrificed to your Motherland.)

Noble sentiments nobly put!

Another poet describes Beauty as follows:

ಪ್ರೇಮಜೀವಿಗಳು ಪ್ರೇಮವನರಸುತ
ಪ್ರೇಮಿಸುವರಮೇಲ್' ಪ್ರೇಮವಸುರಿಸುತ
ತಮ್ಮ ಪ್ರೇಮವನೆರೆನೋಡಿ
'ಸೌಂದರ್ಯವೆ! ಎಂದರು ಹಾಡಿ.'

Two lovers met and loved each other and called their love 'beauty'.

NARSING RAO,
IV YEAR,
Osmania University.

ಸಾವಿನನೋವಿಗೆ
ಕಲಮಲವೆದ್ದು
ನೆಲವನ್ನೆಲ್ಲಾ
ತುತ್ತುವೆನೆಂದು
ಗದರುತ್ತಿಹುದು
ಗರ್ಜಿಸುತಿಹುದು
ಬಡವರ ಬಗ್ಗರ
ತುತ್ತಿನ ಚೀಲದ
ಒಳಗಿನ ಒಳಗಿನ
ಒಳದನಿಯಾದು

From this we can conclude that Kannada poetry is taking a secular form. Humanisn is being introduced by the 'University wits' if I may call them such.

Prof. B.M. Sree Kanthiaya is the father of Kanarese blank verse. He translated some poems from Palgrave's *Golden Treasury* into Kannada in the form of blank verse. He wrote a drama called *Aswathaman* in imitation of Sophocles. It is the first tragedy in our literature. A reader does not think them translations but thinks them to be original. The genius of many young people who could not find any means upto this time burst out in blank verse. The magnitude of Kannada modern poetry is growing day by day. K. V. Puttapa, the Professor of Kannada in the University of Mysore, translated Shakespeare's *Tempest* into blank verse. It is a new creation in our literature. Upto this time no drama was written in poetry. He wrote *Yamansolu*, his masterpiece, in a fascinating style. An ordinary boy of VI Form can read the book and derive pleasure from it.

The great characteristics of the modern poetry are simplicity in style, pregnancy of meaning and secularity in subject. No modern poet teaches a religious doctrine or morality but he describes life as he finds it. So he is appreciated by one and all. We shall conclude with a few illustrations from modern poetry.

One poet celebrating the birthday of a girl blesses her thus ;

Kannada literature declined during the 19th century although we find many minor poets writing in all the three methods that were represented by the three different sects of people.

We now enter the field of modern poetry. This is an age of renaissance in our literature. Before we deal with this modern poetry let us ascertain the circumstances which gave birth to the modern poetry.

This is an age of democracy. Democratic feeling has spread all over the world. East has been in close touch with West. Western thought, culture and civilization have crept into the East. The spiritual view of the East has been alloyed with the western material view. Kannada people are being educated at the Universities. There are the facilities to learn foreign languages. English has been made compulsory. So they are influenced by English literature. They are inspired, but it is quite impossible for them to put their fine ideas in old forms of poetry. There arises a conflict between old pundits, who advocate the cause of old poetry, and new-fangled people who are educated at the universities. They say that poetry is that which appeals to the heart. It needs no particular form. It is their opinion that rhyme and alliteration are not essential for poetry. So they improved upon Kanarese *ragali* in imitation of English blank verse. The old conception of poetry is undergoing a marked change. They do not care so much for religion now.

They have begun to write lyrics in a beautiful style. They advocate the cause of the poor. The spirit of independence is found in the modern poetry. One modern poet describing the wretched condition of the poor complains to God in these words.

'ದೇವರದೊಂದು
ಗೋರಿಯಕಟ್ಟೆ'
ಧರ್ಮದಧೂಪಕೆ
ಬೆಂಕೆಯನಿಕ್ಕೆ
ಗಣಗಣಬಾರಿಸಿ
ಪ್ರಾಣದ ಗಂಟೆಯು

and vachanas. Although the poetry of Virasivas did not entirely leave the aristocratic circle it was meant for the common folk. Every Kannada-knowing man can easily discriminate between Jain and Virasiva poetry. We shall give some specimens of both kinds.

A Jain invocation to God:

ಮ॥ ಸ್ರ॥ ಪರಮಶ್ರೀ ಸ್ನೇಹಗೇಹಾಯಿತ ಪದಕಮಲಂ ಚೇತನಾಚೇತನಾಂಗ।
ಸ್ಫುರಿತಾಘಾಘಚ್ಛಿದಂ ಭಾಸುರ ಸುರನರಸದ್ಭವ್ಯಸೇವ್ಯಂವಚೋವಿ ॥
ಸ್ತರತೃಪ್ತಾವ್ಯಾಪ್ತ ಲೋಕತ್ರಿತಯನ ಪಗತಾಶೇಷದೋಷಾಳಿಮುಕ್ತಿ।
ಸ್ಥಿರಸೌಖ್ಯಾಂ ಭಸ್ವ್ಯಯಂಭೂರಮಣ ಜಲಧಿರಕ್ಷಕ್ಕೆ ಶಾಂತೀಶನೆಮ್ಮಂ ॥ ೧ ॥
ಶಾಂತಿಪುರಾಣ.

A Virasiva poet invokes God as follows:

ಶ್ರೀಮದ್ಬ್ರಹ್ಮಾಚ್ಯುತೇಂದ್ರಾಸುರ ಗುರುಸುಮನೋ ಮೌಳಿವಿನ್ಯಸ್ತಪಾದಂ।
ಹೇಮಾಗಾಗಾರನೀಶಂ ಮುನಿಜನಹೃದಯಾಂಭೋಜವಾಸಂಭವಾನೀ ॥
ವಾಮಾಂಗಾಲಾಗನಂ ಭೂಸುರನಿಧಿಮೆಸೆದಂ ಭೂಮಿಯೊಳ್ ಚಂದ್ರಚೂಡಂ।
ಪ್ರೇಮಾಕ್ಕೈಮಿಕ್ಕ ಪಂಪಾಪುರಪತಿ ಬಸವಂಗೊಲ್ದು ಸಂತೋಷದಿಂದಂ ॥ ೧ ॥
ಬಸವದೇವರಾಜರರ ಗಳೆಗಳು.

The style itself shows that Virasivas wrote in an easy style so that the common folk might understand their poetry and be benefited by it. Virasivas continued to write till the 17th century.

There arose a revolution in Kannada poetry in the 17th century. The religious tension reached its zenith. There was a great controversy between Lingayats and Vaishnavites. Each community strove to propagate its own principles. There was a group of Vaishnavites, who clothed their inspiration in a simple and easy style. They neither cared for prosody nor for grammar. Their songs are full of religious teaching. They wrote padas (ಪದಗಳು) and suladis (ಸುಳಾದಿಗಳು) instead of shatpadis and vrathas. They preached humanity, love, and non-violence. Although theirs was not poetry in the strictest sense there are many poetic touches in their songs. The songs have recently found place in our literature. Vaishnavites wrote till the end of the 18th century.

THE DEVELOPMENT OF KANNADA POETRY

IT is necessary to know something about the Kannada language, and its antiquity before we embark on the real subject of the essay. Kannada is one of the most ancient languages of India. It is a purely Dravidian language although we find many Sanskrit words in it. 'Kanarese' literature is known to extend over a considerable period—the oldest specimen of Kanarese is, according to Prof. Hultzsch, contained in a Greek drama preserved in a papyrus of the second century A.D. So it is but natural that a literature which has covered 18 centuries should have many transformations. Civilization changes and tastes differ. So every great poet has to accommodate himself to the taste of his age, otherwise he will become unpopular and inglorious although he may make the age bear his impress. This was also the way of the Kannada poets of the early ages.

They did not write poetry for common people; it was meant for scholars and the aristocracy. All of them were Jains. Their poetry is religious and didactic. They dealt with religious subjects, because the people regarded their religion as all in all. The poet who did not aim at religion and morality was not considered a great poet and was not appreciated by the scholars and aristocratic people. They laid down rules of prosody and adhered to them strictly. They were great scholars so they could express their thoughts without any solecism. This was the condition of Kannada poetry from the 9th to the 12th century, although some Jains continued to write in the same style till the 15th century.

Lingayats or Virasivas came after the Jains. Their scholarship was not so great. They had to propagate their religion through their poems, so they adopted an easier method. They did not strictly follow the rules of grammar and prosody. They did not change the viewpoint of the Jains although they broke some rules. They preached morality and religion through poems

namely, service of special purposes in behaviour and limit by special problems in which the needs of insight arises '.[1] Schopenhauer *condemns* intellect and offers a way of escape for the metaphysical craving of man for the experience of union with the ultimate reality; the pragmatist *extols* intellect because the action which approves intelligence 'has an *intrinsic value* of its own in being instrumental'—it enriches human life, and the investigation of problems of the ultimate reality, as has been said, has, according to the Pragmatists, no significance or value for life.

MIR VALIUDDIN, M.A., Ph.D. (Lond.),

Bar-at-law,

Department of Philosophy, Osmania University College.

[1] Dewey's 'Some Implication of Anti-Intellectualism' in *Journal of Philosophy, Psychology and Scientific Method*, vol. vii, No. 18, pp. 477–481.

reject that intelligence which is naught but a distant eye, registering in a remote and alien medium the spectacle of nature and life.' They further deny the *value for life* of investigating the ultimate metaphysical problems and theories of philosophy in the past. They point out that since thought has been evolved in the human species simply to remove the biological wants and needs of the organism the 'attempt to discuss the antecedents, data forms and objective of thought apart from reference to particular position occupied and particular part played in the growth of experience, is to reach results which are not so much either true or false as they are *radically meaningless*'. Therefore from the standpoint of the pragmatistic theory of knowledge 'the taking of something whether that something be thinking activity, its empirical condition or objective goal, apart from the limits of a historic or a developing situation, is the essence of metaphysical procedure—in the sense of metaphysics which makes a gulf between it and science'. Thought arises in a psychological situation and its relevancy is entirely limited to it. The evolutionary doctrine treats every distinct organ or structure as an instrument of adaptation to a special situation so the pragmatists insist that the logical theory ought to be regarded as an account of thinking as a 'mode of adaptation to its own generating conditions',—these conditions being, as has been indicated above, the inner distractions produced by the complicated and jarring needs and desires of the organism.

To sum up: The pragmatists, taking Schopenhauer's premises that the intellect is evolved for the service of life and is inherently incapable of knowing the ultimate reality, seem to derive a different conclusion from what Schopenhauer himself meant to draw. What, according to Schopenhauer, is to be regarded as the *failure* of the intellect is from the point of view of the pragmatists exactly its *proper function*, for philosophy, according to them, can do nothing but to 'identify itself with questions which actually arise in the vicissitudes of life.' Philosophy does give insight into existence; it does render things more intelligible; but 'these considerations are subject to the final criterion of what it means to acquire insight and to make things intelligible, i.e.

In the pragmatic psychology we find the same two prominent features which we saw in the account which Schopenhauer gave of the nature and genesis of the intellectual activities—viz., the *purposive* character of thought and the importance of *conflict.* All thinking is purposive. Pragmatism recognises thoroughly that the 'purposive character of mental life generally must influence and pervade also our most remotely cognitive activities,' and it is guided by this principle in the construction of its theory of knowledge.[1] This viewpoint had been stated much earlier by Prof. James in his *Psychology, Briefer Course,* as follows: '. . . . mental life is primarily teleological, that is to say . . . . our various ways of feeling and thinking have grown to be what they are because of their utility in shaping our reactions on the outer world. . . Primarily, then, and fundamentally, the mental life is for the sake of action of a preservative sort.'[2] We have also seen how the presence of conflict is of equal importance. Our whole conscious life arises in conflict. Thought is born in struggle and in tension, in discords and discrepancies. It solves the problems, it overcomes the difficulties. The pragmatic theory of intelligence is thus a forward-looking theory. 'Intelligence as intelligence', says Prof. Dewey, 'is inherently forward-looking'.[3] Pragmatic intelligence is a 'creative intelligence' in the sense of moulding experience in view of the needs of life (i.e. 'in the service of the will') and determining the future qualities of experience. It is thus a process of *experimentation* and trial, and is, therefore, different from the creative work of the artist who is striving after an ideal.

Thus for Schopenhauer as well as the pragmatists the intellect is a biological instrument for improving human behaviour. But whereas Schopenhauer thus reducing the intellect to the level of a mere tool for action in the service of the will has recourse to 'instinctive feeling' or, a kind of 'intuition' to satisfy man's passion to experience the ultimate reality, the pragmatists elevate intelligence to the place of supreme instrument which enriches the whole of human life and 'deny and

[1] *Cf.* Schiller's *Humanism,* p. 8.
[2] *Psychology, Briefer Course,* p. 8.
[3] *Cf.* Dewey's *Essay in Creative Intelligence.*

of the intellect. He, therefore, assumes outright the existence of the organism with its vital needs and wants—its 'will-to-live', so to say,—and he assumes also the presence of environment with its natural energies. He does not try to rise (as Schopenhauer does) beyond the phenomenal experience which is for him merely an intercourse between the organism and the environment.[1] The fundamental questions, why organisms exist, why they strive and wish to live and propagate their species, which are in themselves exceedingly interesting problems, do not interest him as much as they did Schopenhauer who, as we have seen above, grounded these biological needs in the Will to Live, the ultimate reality which is an endless striving after life, and which individualises itself in animal organism. The pragmatist, then, taking for granted the organism and its needs, goes on to show how thought arises. He shows that the environment, in which the organism is placed, being not always friendly, the individual tries to mould it so that the needs of life and the desires corresponding to those needs may be realised. In such an enterprise, memory, imagination and thought arise as a help in the struggle for existence and being of priceless advantage are, according to the Darwinian laws, encouraged and preserved. It is thus the complicated needs of the organism that call forth thought and reflection. It would, in all probability, never have arisen and certainly would never have thriven 'if the affectional life of the *genus homo* had always been serene and blissful without alloy.' The entire business of thought is to remove the discordances and discrepancies that arise in the problems confronting us in our daily life. Logic is, thus, for the pragmatist, a group of changing and flexible rules which themselves arise and end in the needs and exigencies of life. It is *not* to be considered as 'a set of immutable and eternal laws to which any and every judgment must conform on pain of being condemned as false.' Thought is a process of experimenting with the materials of our experience, changing and moulding it for the satisfaction of our desires.

[1] *Cf.* Creative Intelligence, pp. 36, 37—Influence of Darwin and other Essays, pp. 155–157—Essays in Experimental Logic, pp. 228, 332, 425, etc.

IV

This account of the genesis and nature of intelligence is, according to Schopenhaur, 'primarily zoological, anatomical, physiological.' How the unconscious 'Wille zum Leben' gives rise to intelligence is, indeed a problem. But the intellect, Schopenhauer maintains, has come into being in response to practical and biological needs of the organism and, therefore, it is designed merely for the practical purposes, that is to say, for 'the comprehension of those ends upon the attainment of which depends the individual life and its propagation'.[1] Two things stand out prominently in this account of the nature and function of the intellect; first the *purposive character* of the intellectual activities and second, *the importance of conflict*. The *raison d'etre* of thought is, as indicated above, to enable the individual organism to react successfully on the external impulses and influences and thus to conserve its being. From this point of view intellectual processes are *useful* in the highest degree. 'It is a tool of the most various utility'. And since the intellect is provided only in consequence of the practical needs of life its only function will be the satisfaction of those needs and in this way both our action and cognition will be controlled throughout by this purpose alone. The doctrine is thus thoroughly teleological, not indeed in the wider sense of a cosmic purposiveness but in the sphere of mental life only. Not less important is the motion of conflict. Consciousness, as has been fully emphasised arises out of *conflict*. It is the conflicting and intricate situation and also the complexity of the wants and needs of the organism that lead to the more and more perfect formation of the faculty of formulating ideas and its organs until, in the course of the struggle for existence, arose consciousness itself.

Now it is through this conception of the nature and genesis of the intellect, as we said above, that Schopenhauer paves the way for Pragmatism. The pragmatist is a biologist and an evolutionist. He looks upon mind and its products as biological instruments. He is interested to show how knowledge has arisen in the evolutionary movement and in pointing out the function

[1] Haldane and Kemp, vol. iii, p. 21.

vegetirte, sich entwunden hat. Dadurch wird hier die Bewegung auf Motive und wegen dieser die Erkenntnis nothwendig.'[1] It is obvious that as the animal rises higher and higher in the scale its wants and needs also become more and more complicated and it becomes more and more dependent upon opportunity and thus it stands in need of a greater degree of intelligence in order to survive in its struggle for existence. And when the objectification of Will reaches the stage of humanity we find that in the case of man—that 'complicated, many-sided imaginative being'—the needs and requirements of life become so bewildering and confusing that a perfect development of intelligence becomes the *conditio sine qua non* of his very existence.

Thus the development of intelligence keeps pace with the development of the needs of life. According to Schopenhauer, then knowledge is only a 'secondary added thing'; it is 'secondary and subordinate everywhere' and as he puts it, it was not necessary for the maintenance of things in general, but merely for the maintenance of individual animal beings. He emphasises the fact that the faculty of knowledge, like every other organ, has only arisen for the purpose of self-preservation and hence every animal possessess intelligence to find out the means of its own existence, thus to conserve its own being and to propagate the species. With man the case is not different. And if there is any difference at all it is just this; man has infinitely more wants than the animals and consequently his maintenance is much more difficult and therefore a much higher degree of intelligence is required in order to enable him to meet the demands of life. *The intellect, however,* springs *from the 'will to Live' and is nothing* but a *tool for its service.* It has been provided simply to meet the essential demands of life—nourishment and propagation. It is, in the words of Schopenhauer, 'a thoroughly practical tendency' ('durchaus praktischer Tendenz' iii, 333), which remains almost throughout entirely subjected to the needs of life. It is further designated by him as 'Notbehelf' and 'Krucke' which is simply meant to help the individual in its struggle for life.

[1] *Grisebach Ed.*, vol. i, p. 212.

the 'anatomical element' by Geoffroy de St. Hilaire) continues in all essential points unchanged in all the vertebrates, though they possess the greatest susceptibility to modification according to the varying environment. In the neck of the giraffe (for example) the same seven vertebræ which in the mole were contracted to such an extent as not to be recognisable are prodigiously prolonged enabling it to browse upon the tops of tall African trees. This unity of the plan, argues Schopenhauer, cannot be accounted for as one of the aspects of the adaptation of the organism to the environment. For this adaptation might have been in many cases as well or better realised by means of different structure and different numbers and disposition of bones in different species.[1]

Thus here we find a clear formulation of the evolutionary doctrine and Schopenhauer himself adds a reference to a passage in the *Parerga und Paralipomena* in which he expounds at much greater length his own particular form of organic evolutionism. This passage occurs in the small treatise (Chapter VI of *Parerga und Paralipomena*) entitled Zur Philosophie und Wissenschaft der Natur. With the publication of this work (1850) Schopenhauer 'unmistakably announced that the philosophy of nature to which his metaphysics of the will led was of a frankly and completely evolutionist type.' [2]

III

As an evolutionist Schopenhauer also held that the function of the intellect has been evolved to meet the pressing demands of life just as the eyes and the stomach and the other organs have been developed and preserved through the agency of natural selection. Thus like every other character of complex living organism, thought has its history and its origin. It is the complexity of the wants of the situation or environment that demands a certain amount of intelligence. As Schopenhauer puts it: 'Die Hahrung muss daher aufgesucht, ausgewahlt werden, von dem Punkte an, wo das their dem Ei oder Mutterleibe in welchem es erkenntnisslos

[1] Cf. *Über den Willen in der Natur*, 2nd Edition, 1854, p. 51.
[2] Cf. *Monist*, vol. xxi, p. 207, for a detailed account of the particular form of Organic Evolution which Schop. adopted.

unconscious principle which manifests itself in the temporal world. It is conceived as a 'blind urge' ('ein blinder Drang') towards activity and change, towards individuation, towards multiplication and 'diversification' of the modes of concrete existence and towards a struggle for survival between these modes', Schopenhauer designates it as 'Wille zum Leben' and he further characterises it as 'ein endloses Streben', as 'ein endloser Fluss', as 'ein ewiges Werden' without 'rest' and without 'purpose'. It objectifies itself in a gradual progression and cumulative order. Every objectification pre-supposes the preceding one but adds to it some new trait. Now this conception of the Will to Live readily lends itself to an evolutionistic construction and it is interesting to find that Schopenhauer himself, though in the beginning of his speculations he did not put such a construction, in his later writings did adopt such an interpretation quite explicitly and emphatically, and connected with his metaphysical principles a thorough-going scheme of cosmic and organic evolution. This has been fully brought out by Prof. Arthur O. Lovejoy in an essay entitled 'Schopenhauer as an Evolutionist'.[1]

And by the year 1850 Schopenhauer had *reformulated* his conception of the objectification of the will in thoroughly evolutionistic terms. It is strange to find that this fact has been ignored by most of the historians of philosophy, and Schopenhauer's position has been represented as consistently anti-evolutionistic.[2]

In his 'Wille in der Natur' in 1854 we find Schopenhauer setting down a brief and unequivocal affirmation of the origin of species from one another through descent. This alone, he thinks, would explain the unity of plan manifest in the skeletal structure of a great number of diverse species. In other words, Schopenhauer argues in 'favour of transformism by pointing to one of the most important and familiar evidences of the truth of the theory of descent, viz. the homologies in the inner structure of all the vertebrates'. The number and arrangement of the bones (called

[1] See *Monist*, vol. xxi, pp. 195–232.
[2] It is however noticed by Volkelt in his *A. Schopenhauer, Seine Personlichkeit etc.*, pp. 198–199 (Stuttgart, 1909).

THE WORST DAY OF MY LIFE

I WAS not more than seven years old when on a certain day (the day which is the worst day of my life), I asked my mother about every member of my family. She told me about some of them, that they were my relatives, and advised me to respect them. My little brain was not able to understand the meaning of 'relatives'. I was about to ask the meaning when my playfellow (the child of my nurse), came to play with me. I at once remembered that my mother never included his name with the names of those whom she called relatives. Now I remembered that my mother excluded many other persons and never told me anything about them. I asked her: 'Mamma, why didn't you include the name of our old gardener, my loving nurse, my dear playfellow, etc.?' She laughed and said, 'You baby, they are our servants, how could I put their names with those of our family who are the masters?'

My poor little mind, my simple and true mind, my heavenly brain, never understood the meaning of my mother's three different words 'Relatives', 'Servant' and 'Master' for the same kind of creatures. I wish I had not asked the question. I wish my mother had not tried to understand me. I have some heavenly memory of those days when my mother had not told me, had not tried to make it clear to me. That was the 'worst day' of my life, because after the very worst day I was no more in that world where there were no servants, no masters, no relatives. Now I was in a world which is filled with servants and masters.

HASAN ASGHAR
V YEAR (HISTORY)
Osmania Univ. College.

trifle like that is unreasonable. Irritability and querulousness of this kind shows a temper wholly out of keeping with our easy-going and happy-go-lucky ways. 'Live and let live', is our motto, and visitors should try to fall in with our ways, if they wish to come here and be happy and welcome among us.

I am, Sir,
Yours faithfully,
A. VICARABADI.

solitary, somnolent porter, peacefully sucking his mango, is not cruel enough to shoo them away. Let others carp and cavil, but we Vicarabadis feel that at last things are as they should be.

I hope I have been successful in giving the impression that, being far from the hurly-burly of life, we are quiet and peaceful people. So it is absurd of those who come here for a few days to expect us to hustle. Visitors are sometimes very exacting. Some months ago, I believe, a visitor complained of, what he called, the leisurely and dilatory methods of our local post-office. The post-master is supposed to open the post-office at ten in the morning but, having some important work to do at home, such as having a hair-cut, or making arrangements for the naming-ceremony of his latest baby, he arrives sometimes at twelve and sometimes at two in the afternoon. Well, after all, why shouldn't he? He feels, and rightly, that people come here for rest and quiet. So why should they be so frantically regular in their correspondence? And if they miss one post, surely their letters could go by the next. And why should they be always pestering him to sell them stamps? Surely, if he is late in coming to the post-office,—only an hour or two, and never more than two or three times a week,—they could post their letters without stamping them. The postal department is obliging enough to carry letters without their being stamped. So why make a fuss? Another ridiculous complaint is that you cannot register letters going by the British post or send money orders from the local post-office, and that you have to go to Tandur for the purpose. If people were only reasonable, they would see what an advantage this really is. They could enjoy a pleasant ride in the train to Tandur as well as register their letters or send their money orders. Just for a trifle like that, we feel that it is unreasonable to complain and be cantankerous. We feel that visitors here often make mountains out of mole-hills: for instance, a few days ago, a visitor returning to Hyderabad by the evening train had a great deal of luggage which had to be weighed, and the clerk in charge of the weighing machine couldn't be found, as he had gone out to have his tea. Well, if the train *will* go at five, when it is time for tea, what is a poor, hard-worked fellow to do? The train can always wait a little: the boiling water in the engine doesn't easily get cold but tea does. To lose one's temper over a

are not unmindful of the glory that was Bidar, but people seem to forget the grandeur that was Vicarabad.

As I have just spoken of the railway, I should like to mention the welcome change that has come over things recently. In the old days, the railway officials were very officious. Even for important district officers, if they were late in getting to the station, the train would not stop for more than ten or fifteen minutes. And if you were having a meal in the refreshment room, you couldn't dawdle over a second helping of a dish. The guard and the station master were always at your elbow to see that you bolted your food within the scheduled time. But the railway officials, one is glad to say, are altogether more human now, and have some consideration for the human weakness of unpunctuality. You can now have your third helping of a favourite dish—if such a thing is ever cooked at any railway refreshment room—or munch your cheese and biscuits in peace and at your leisure, without having the glowering eye of an irate railway official staring disapproval at you. We are sometimes apt to forget that machinery is there to serve man and cater for his comfort, and if time and tide do not wait for man, a train at least should. Far too much importance, I feel, is attached in these mad, modern days to schedules and time-tables and regularity and all such tedious things that make life a dull, mechanical routine and rob it of its spontaneity. We Vicarabadis, at least are not soulless people of dull routine and mechanical punctuality. We realise the profound truth of Oscar Wilde's saying that 'punctuality is the thief of time'. But since the railway has fortunately changed hands, there is a distinct and welcome change for the better. Gone is all that quite unnecessary, un-Indian bustle and hurry, and a welcome quiet and gentle peace have descended upon the railway station here. There is no jostling now on the platform, no raucous voices of the porters are heard any more, even the strident voice of the all-important station master is lowered to a gentler key, a more human speech. Goats and donkeys wander about at their sweet will—as all free animals should—over the rails and on the platform, even within a few minutes of a train's arrival, but the

the shackles of the purdah. In the early morning and in the cool of the evening, the fields are a blaze of colour with the polychromatic *saris* of the ladies who take the air twice a day. Except for their multicoloured *saris*, the only colour in the fields just now is the red of the soil and, here and there, the fierce scarlet gesture of the gold mohur.

We are, as a community, highly educated too. Instances are not wanting of men, and even women, of this place who have passed the Middle School Examination: and lest you should think that they are romancing about their academic successes, they show you, with pardonable pride, their certificates which are framed and hung up in their drawing-rooms.

We have attractions for all kinds of visitors. For those who are fond of walking, there are large open spaces, where they can walk to their heart's content. For the exercise-fiend, there are ploughed fields with up-turned clods, which will give him as much exercise as he wishes for. For those who wish to loiter along in a leisurely way, combining meditation with gentle exercise, there are shady lanes where they can saunter along undisturbed. For the romantically minded, we have 'Lovers' Lane', a cool, shady lane with two or three rose-embowered cottages *à deux*, ideal habitations for a honeymoon couple. By common tacit consent no one walks through this lane, for fear of prying upon the privacy and disturbing the billing and cooing of these happy turtle-doves.

Vicarabad is one of those haunts of peace and *dolce far niente* that are so welcome in these days of hustle and hurry, where, 'far from the madding crowd', you forget the ignoble strife and struggle of the world. I would not have it understood, however, that we are lotus-eaters exactly; oh no, we are no shirkers of work, we do our two or three hours of work a day as regularly as anyone else.

Vicarabad is now an important railway junction; visitors to Bidar have to change here. But we rather resent the attitude of people who exalt Bidar at our expense: they seem to use us as a stepping-stone to higher things. We are cultured people, we

They say the Lion and the Lizard keep
The Courts where Jamshyd gloried and drank deep.

Old Omar must have written his lines on just such another sad ruin as this.

Wild life of the jungle too is not lacking on this spacious hill. Nilgai and Sambur can be seen wandering about freely and fearlessly, for shooting is discouraged here now. There is, indeed, a local legend that a very old tiger haunts this hill, but, as no one has seen him within living memory, perhaps it is only his ghost that wanders about, and as even his voice, which some profess to have heard, is said to be thin and squeaky, perhaps it is only the ghost of its ancient roar that is faintly heard now and again.

The air of Vicarabad is very salubrious and cool; the temperature here is at least half to one degree cooler than that of Hyderabad; it has never been known to go beyond 114 degrees in the shade; no wonder Vicarabad attracts visitors in the hot weather. The water of this place is said to contain a little iron; that is perhaps why it is slightly rusty to the taste. But it is a tonic in itself and a natural *aperitif*; what though it is not entirely odourless; what though it is also not entirely colourless, as, I believe, all good water should be. It is slightly pinkish in shade: the local poet, to whom I have referred, called it once, as local tradition says, 'roseate as the feet of Aurora and redolent as the locks of Hyacinthus'. But that, perhaps, is a slight and excusable poetic exaggeration. Before condemning it, however, we must remember that even in large cities water sometimes, for the sake of health, has to be coloured with potassium permanganate, and is sometimes, for the same reason, slightly scented and flavoured with chlorine. So that Nature here has saved man a great deal of trouble.

Although rural, we are a very advanced and progressive community. Even the modern purdah-breaker, who tilts not at windmills but at the veil, will find that we are not obscurantists. The local ladies of the highest social status walk about freely here, having discarded the trammels of convention and broken

on it in his Collected Poems, and will remember the fine opening lines of the poem :—

O Anantgiri, height sublime,
Far-famed in every distant clime.

From the top of this high hill, you have a wonderful view of the country below and around you. Goldsmith's 'Traveller', on the testimony of Macaulay,—and his statement must be true, for was not Macaulay a reliable historian?—was able, from his high perch in the Alps, to look down on three countries, but a visitor from the top of Anantgiri can look down on no less than five—or is it only four?—different districts of H. E. H. the Nizam's Dominions. A truly wonderful panorama stretches out before you, as far as eye can see. Sitting on this high hill, away from the bustle and murmur of human life, one realises a little the aloofness and unconcern of the gods on high Olympus when looking down on humanity and its little concerns from their sublime height.

On a small, flat stretch of ground on the top of this hill are the ruins of what once must have been a fine shooting-box, which was built by the Prime Minister I have alluded to, but all that remains now is a few rusty and decrepit walls of corrugated iron. It must have been a luxurious pavilion in its heyday, comfortable and cool, for, to keep the heat out, the corrugated iron sheets were lined with thick felt, which now alas! hangs in tatters. One can imagine the whiskered and bearded men of the 70's and 80's carousing deep and making merry in this shooting-box in the evenings after the day's sport was over. They were a race apart, those men: life ran an even tenor for them, they did not bother about the morrow: they were care-free and happy, playing pranks and laughing at their ribald jokes. Life had a savour of its own for them which we, in our age of hurry and bustle and noise, have entirely lost. They are dead and gone now, those fine, genial, Falstaffian figures of the 70's, whose photographs, in faded daguerreotype, may still be seen preserved in some family album so dear to Victorian times. The shooting-box, where they held their Bacchanalian revels, is all in rack and ruin now, serving as another pathetic reminder to humanity of its little day.

were foxed and yellow with age, but he had had most of them sumptuously bound in morocco or in calf. Of course, I am very fond of first editions and greatly admired his collection, but once when I suggested rather timidly that perhaps the first edition of a law book might be slightly out of date, he was extremely indignant, and said with great dignity that the edition that was good enough for Lord Reading, who rose to be Chief Justice of England, was good enough for him. Thinking over this argument, one had to admit that perhaps he was right.

The other distinguished man was our doctor. Subsequent to his retirement from government service, as sub-assistant surgeon, he had acquired a great deal of experience and skill in medicine. In his old age he had settled down in his native place, and gave the benefit of his knowledge—free in most cases—to his fellow-townsmen. But some people are never satisfied. They used to say of him—rather uncharitably, I think—that he was inclined too much to favour the undertakers. What can the most skilful physician do when people *will* come to him in their last moments? Besides, people *have* to die some time or other. But it's an ill wind that blows nobody any good: the doctor got his fees, the undertakers received their wages and the patient was relieved of his pain. So perhaps all's well that ends well.

I wonder what the poet and the lawyer and the doctor would have said, could they have seen these post-mortem eulogies. They were all of them modest, self-effacing men of a retiring disposition who hated to be praised openly or have their good qualities made public. So if I had written these panegyrics in their lifetime, in just indignation the poet might have lampooned me, the lawyer might have sued me and the doctor, with one of his green pills or purple tinctures, would have sent me—to what place I wonder! The one I cannot hope for, the other I dare not think about!

One of the show-places of the neighbourhood is our local hill-station, Anantgiri, which is no less than twenty to twenty-five feet higher than the sea-level of the locality. This hill has been described by many people. The great local poet has paid his tribute to it: your cultured readers will, no doubt, have read the noble ode

and this, I am sure, will be accorded to us through the medium of your popular and widely read magazine.

Way back, as the Americans would say, in the 70's, Vicarabad was discovered, one might almost say founded, by one of the famous Prime Ministers of Hyderabad, after whom it was then named. This does not mean that we are parvenus in any sense, or that this place has grown up in a night like a mushroom. Indeed, we go back to times immemorial, but here I am not concerned with historical disquisitions or topographical researches. Those who are interested in such things may refer to gazetteers and such other tedious works of reference. All that I wish to touch upon are the beauties and the attractions of this place.

One of the places of attraction here is the house of our famous local poet who, alas! is with us no more. Indeed, it is a place of pilgrimage to visitors from far and near. His fame has extended to Tandur and Wadi, and pilgrims from even far-distant Gulburga have been known to visit the house, walking, with hushed reverence, about the large halls, gaping in silent awe at his wondrous *bibelots* and his bric-a-brac from Birmingham, or asking in whispers details of the poet's ascetic life, and looking at the sacred desk where he composed his masterpieces or fingering gingerly the delicate jade pen with which he wrote them. The caretaker of the house, who shows the pilgrims round—for a consideration, of course,—is a character himself. He would have won fame as a writer of fiction: he has a marvellous memory and a remarkable power of invention; he remembers the titles of all the poems that the poet has written, and, where he doesn't, he invents them with marvellous plausibility. He can also show you the room or the odd nooks and corners of the garden where each poem was composed.

Mention of the poet reminds me of two other local men of distinction, who also are gathered to their fathers. One was a lawyer who, finding Bidar too small for his great abilities, had migrated to Vicarabad, where he had established a large practice. He used to boast of the distinction that he was one of the only two Hyderabadis who were called to the Bar in Dublin. He had a large collection of law books, mostly first editions. Their pages

OUR VICARABAD LETTER

VICARABAD,
June, 1932.

To

THE EDITOR, *Osmania University College Magazine*,

Dear Sir,

HAVING heard of your esteemed journal—for your popularity has reached us even in distant Vicarabad—I venture to write and tell you something of Vicarabad, so that through you it may reach a wide public. If your circulation is as large as that of your two famous contemporaries, *The Hyderabad Bulletin* and *The Saheefa*—and I am given to understand that it is—then I am sure of a public both in H. E. H. the Nizam's State and outside it.

In these modern days of publicity, I feel that it is not right for us to hide our light under a bushel. Many of the interesting towns of Europe are written about and described, with the result that they attract large numbers of visitors and so become not only famous but prosperous. That is what I feel Vicarabad needs: it needs to be written up: but not in the cold guide-book manner of a Murray or a Baedeker; it requires the friendly pen and the intimate touch of an E. V. Lucas. But possessing neither the advertising style of the guide-book nor the inimitable manner of a Lucas, I must try to do the best that I can.

I fear we have been too modest in the past, too apt to say to ourselves that good wine needs no bush, but you will agree with me that even the best vintage needs to be advertised in this commercial age. I feel sure that after reading this, your public will see that Vicarabad is a place well worth a visit. By this I do not mean to suggest that we are entirely neglected: of course, we have our share of annual visitors—'fit though few'—but we feel that by our modesty in keeping silent about ourselves, we are depriving a large number of people of the beauties and the benefits of this place. So that, as I said before, we need a little publicity,

THE CLOUDS ROLL BY

We know not where we go,
We know not how we came,
In blue, blue deep we row
We watch the planets' game.
We sail to isles of dreams
To seek enchanted cells.
We float, we sigh, we swim,
Where lovely Luna dwells.
We give the Moon a silver veil,
A shroud we give the Sun,
We give to Earth a thunderbolt,
But lo !—the course is run.
We see the wreck is nigh,
How shallow is the Deep.
We laugh and linger in scorn,
We know we have to weep.

AZIZ AHMAD,
IV YEAR,
Osmania University College.

falling into the water. He ran to the well and cried 'Kamala'. 'Rāmacharan', cried a female voice from inside. Instantly he jumped into the well and the next morning both were found in each other's arms. Kamala, like Ramacharan, started from her home to put an end to her life and seeing some one coming threw herself into the well and thus sacrificed her life. In vain did their parents weep for them. A *Sadhu* who was passing by the well and heard the whole story only said: 'They are married in Heaven', muttering, as he passed on: '*Shanti*'.

R. MAHADEV.

A QUERY

He laid his hand upon his heart
And said: 'How sad that we must part!'
I wonder what he would have said
If he had laid it on his head.

J. O. KER.

them. It was a pleasure to them to communicate to each other the extent of their love and more than once had they quarelled over the question whether a man is more faithful in his love or a woman.

Such was the state of affairs when at the end of the college term Ramacharan received a letter from his mother asking him to go to Yallamanchili in the ensuing holidays. He took leave of Kamala, promised her that he would be writing a letter once a week and would come at the end of the holidays, as he had to complete one more year for his Intermediate. After his return home Ramacharan kept his promise and only the other day he had received a letter from Kamala informing him of her success in the Matriculation in the first class, which she added she would not have obtained had he not helped her as he did. He was thinking of going to Madras in a few days when he received two letters, one from the Superintendent and one from Kamala herself. The former was an invitation asking him to attend the wedding of Kamala, and Kamala wrote to him what had happened since his return home; how her father refused to allow her marriage with Ramacharan; how he abused her regard for a poor villager; how he insisted on her marrying a boy from a rich family who had failed thrice in his Matriculation and lastly how she had decided to sacrifice her life rather than to marry him. This was the cause of his meditation.

Ramacharan returned to Madras but there he was not received by the Superintendent with the same regard as he was hitherto. He could not even after many trials obtain a chance of speaking to Kamala. All that be could observe was that preparations for marriage were going on rapidly and all that he could hear was that Kamala was going to be married to a rich man of Madras. It was the 10th of April and the marriage was to come off on the 11th. Ramacharan, failing in his attempts to obtain even a glimpse of Kamala, decided to put an end to his life on the same day. Behind the Hostel and not far away there was an old well. He started towards it. It was ten o'clock in the night and the moon was shining brightly. When he was some twenty yards from the well he saw a figure approaching the well from the other side. One minute passed and he heard a great noise of some heavy body

MARRIED IN HEAVEN

'MY boy! Why do not you take your meals? It is twelve o'clock now and you have not even had breakfast to-day', said a woman of forty-five to her son. Ramacharan rose from his chair where he was writing something idly and followed his mother to the kitchen. He took his meal but all that he did to conceal his thoughts was not sufficient to keep his mother from guessing what passed in his mind. She asked him again and again what he was brooding over but all that she could obtain in reply was that he had not answered his papers quite satisfactorily. This answer did not quite satisfy her either, but it was enough to suppress her curiosity for the moment.

Yallamanchili was a village in the Vizag. District and Ramacharan was a student living in that village. His father had died when he was very young, leaving some property. His mother since the death of her husband spent the whole of her time on her only son. Ramacharan, too, was a very clever boy. He passed his examinations with distinction and stood first in the Lower Secondary, and Matriculation Examinations, obtaining first class honours and carried away all the prizes awarded in that connection. Such a promising boy should not be kept idle, so his mother sent him to Madras to prosecute his studies there in college. Ramacharan, a boy of eighteen, was thus obliged to leave his native place for the first time.

He met many things in Madras which attracted his notice but that which attracted him most was Kamala, the daughter of the Superintendent of the Hostel he was living in. She was a girl of fifteen studying in the Matriculation and was the pride of her school. She used to come to Ramacharan to ask him to solve her difficulties and these occasional interviews had the effect of deepening the impressions of their first meeting. They used to go for a walk every morning and evening exchanging their ideas about things which interested them both. As time rolled on that company which was at first a pleasure, became a passion to both of

deprivation for six months. In ancient times this disease was common among sailors and others who used to sail for long periods without having citrus fruits and green vegetables in their diets. Deficiency of this vitamin for a long time especially affects the cardio-vascular system and lymphoid tissue. Thus scurvy causes hæmorrhage (especially of the gums), loosening of the teeth and accumulation of blood underneath the skin. Prolonged scurvy in the absence of Vitamin C is fatal.

There is great expectation and probability of finding out a sixth vitamin. There is a possibility of its remaining with Vitamin B, and consequently it will be a water-soluble vitamin. Its special concentrated sources and ordinary sources will coincide with the sources of Vitamin B. The lack of this vitamin will have very serious results. Pellagra, a fatal disease, is said to be caused by the lack of this vitamin.

S. N. VARMA,
M.B., B.S. (II YEAR),
Osmania Medical College.

set is advantageous to health. This vitamin is absent in polished rice, white bread, and vegetable oils.

The Fat Soluble Vitamin E.—The Vitamin E is obtainable from the vegetable kingdom, especially from an oil extracted from sprouting wheat germ. This vitamin is necessary for reproductive organs and the growth of an animal. The experiments on rats prove that the absence of this vitamin causes sterility.

The Water Soluble Vitamin B.—The other name given to this vitamin is antineuritic, because this vitamin guards the body against polineuritis. This vitamin is especially found in concentrated form in yeast. The ordinary sources are green vegetables, wheat germinated, wholemeal bread, unpolished rice, milk, egg-yolk, oats, whole grains, maize whole grain, barley whole grain, peas dry and germinated, nuts, onions etc. It is not present in polished rice, white flour, vegetable oils and sago etc. The deprivation of this vitamin causes polineuritis, for experiments on animals show that polineuritis is produced most rapidly in pigeons within a month. The experiments on rats show that growth is arrested in young rats in three days. Beri-beri is common in Bengal, China, Japan and among those people who generally eat polished rice and white bread. If the aqueous extract of the outer portion of rice is added to the diet, the disease is cured and resistance is produced in the body against this disease. The Japanese, as we know them, are practical people. As soon as they introduced these preventive measures the disease became a thing of the past in Japan. Polineuritis causes severe nervous symptoms, digestive troubles, paralysis, swelling of the limbs and trunk, with accumulation of fluid in those parts. This disease is fatal. Antineuritic vitamin is slightly affected by heat and oxidation.

The Water Soluble Vitamin C.—It is designated as antiscorbutive for the reason that it cures and protects against scurvy. The chief sources are the juices of citrus fruits such as lemons, oranges etc. It is mostly found in tomatoes, onion, garlic, cabbage and other green vegetables. It is absent in rice, white flour, wholemeal bread, in all the vegetable and animal fats except milk. The absence of Vitamin C produces scurvy after

an ophthalmic or eye disease called Xerophthalmia. The concentrated source of this vitamin is cod-liver oil. Ordinarily it is found in animal fats, milk, butter, cream, egg-yolk, wheat bread, unpolished rice and germinated grains. This vitamin is not present in polished rice, wheat white flour, and vegetable oils. This vitamin is destroyed on heating, e.g. milk boiled with ordinary process loses its Vitamin A. The destruction of Vitamin A depends upon the process of oxidation. If the milk is sterilised in an autoclave or heated in an oxygen-free utensil, it will not lose its vitamins. The deprivation of this vitamin in the diet leads to the arrest of growth in young animals and children and is often fatal to them. In adults it causes Xerophthalmia, night blindness and lowered resistance to various lung, skin and other affections.

The Fat Soluble Vitamin D.—The Vitamin D is named antirachitic because it protects the body against a bone-deforming disease called rickets. It is found with Vitamin A. It is present in very large quantities in cod-liver oil and butter. It is more resistant to heat and oxidation than Vitamin A. The present experiments prove that it is particularly related to sunlight. This close relation and production of this vitamin from Ultra-Violet rays is proved by the fact that if Vitamin D is destroyed from milk and this milk is given to a child for a long time, the child will suffer from rickets and if Ultra-Violet rays are passed into such milk and then used it cures rickets. The absorption of calcium salts in the intestine depends upon this vitamin; the absence of which particularly affects cartilages, causing rickets and deficient dentition. Rickets especially occurs in cold countries, in people in whose houses there is no entrance of sunlight and in children fed only on artificial foods. Of two groups of research scholars one of them held the opinion that this disease was purely related to sunlight and was caused in its absence. The other urged that only deficient food was its cause. Both views are right, because there is a relation between sunlight and food: the Vitamin D in the food directly comes from Ultra-Violet rays of the sunlight. The sunlight causes the production of Vitamin D in the skin. A sun-bath just after sunrise or just before sun-

VITAMINS

THE most careful experiments and keen observations show that if an animal is fed on pure proteins, carbohydrates, and fats with the addition of necessary salts and water, it soon becomes ill, loses its weight and finally dies, although the quantity administered is physiologically correct. Under these circumstances, if the animal under experiment is young, the growth is arrested. A very small quantity of natural food remedies this evil. The history of long voyages and of navigation was the history of struggle against scurvy, and a little quantity of lime juice or orange juice added to the diet, cured and protected against the disease. Polineuritis was very common in rice eating countries especially when they were eating polished rice. The disease disappeared when the outer portion of the rice was restored to their diet. The polished rice feeding in fowls produces polineuritis and this disease vanishes after the use of unpolished rice. If one set of rats is fed on only fresh milk aad the other set on milk proteins, milk carbohydrates, milk fat with considerable amount of salts and water in physiological proportions ; the former set of rats grows normally and the latter group loses its weight, falls ill and at last death results. These experiments prove that there is something extra in lime juice, in the outer portion of rice and in fresh milk which is essential for the growth and protection of health. These accessory food factors are termed *Vitamins*. The chemical composition of these extra materials is not yet known, but their presence in the food is discovered by the diseases caused by their absence in the diet. These extra food substances are arranged chiefly in two groups—(1) Those which are soluble in fats; and (2) those which are soluble in water. The former group consists of three vitamins which are named A, D and E ; the latter are classified into two vitamins B and C.

Fat Soluble Vitamin A.—The vitamin A is spoken of as antiophthalmic since it has curative and protective value against

itself to students of natural history and, in fact, all lovers of natural history. Let me first bring one fact to your recollection. You might have heard of men who are used to get up from their sleep exactly on the stroke of four or five. It is indeed a habit, and the processes involved are psycho-physiological. The chief operator is really the sub-conscious mind. Might it not be that animals possess certain instincts which in the accuracy of their operations equal in degree though not in extent—or correspond to—the operations of the sub-conscious mind. When we are urged by the sub-conscious mind we do things in spite of ourselves. No reasoning is done. Even so animals might do certain things in spite of themselves moved by some sort of a sub-conscious mind of their own. We may give it the name of developed instinct or any other name we choose but for an explanation of its operation we must look to the processes attributable to a mind however undeveloped it may be—and in this case 'mind' may be defined as a consciousness developed by the vibrations and activities of the brain.

The subject is an interesting and fascinating one and opens up a wide field for study and observation to such as may be interested in it. Valuable results obtained may teach us something of ourselves, too.

A. R. CHIDA.

say, not ten minutes either too early or too late. If he is too early he may be ' winded ', and, of course, if he is too late he misses his supper.

Coming nearer home we find much to exercise our thought in the strange doings of the domestic cock. From time immemorial the crowing of the cock, ' the instinctive herald of the dawn ' as Harindranath puts it, has been taken to be the first signal of the approach of dawn, and in many parts of the world millions are still guided by it and, in our own country, it is the morning cock for the villager who checks its accuracy by an astronomical observation—by noting the brilliancy and position of the Morning Star. The cock usually crows between four and four-thirty in the morning and though many centuries have passed since man has been noting this peculiar ' faculty ' possessed by the cock, no one has been able to supply an explanation.

All domesticated animals, whether a cat, or a dog, or a horse, or an elephant or even a rabbit, have the faculty to develop the time-instinct if only they are fed or watered at a particular hour every day for a fortnight or a month. I have known of a cat and a dog, which used to be fed under a tree exactly on the stroke of twelve every day, present themselves at their post precisely at that hour, correct to the very minute. I have also known dogs, and even cats, go out to meet their masters (or mistresses as the case may have been) at precise hours, knowing the hour of their coming home from their work. How did these animals regulate themselves?

Reference to habit alone will not furnish an explanation to this phenomenon. In fact, it will be a very feeble solution, because even man, who is supposed to be the lord of creation, cannot develop any habit producing such an accurate result. The argument might be advanced that animals are so sensitive to changes in the weather that they can guess when it is nearing midnight, or past midnight, or approaching dawn. Very possibly so, allowing the fact that animals have some idea of their own (and they surely must have) of midday, dawn, evening and midnight.

The best explanation I can think of is one that may commend

THE TIME-INSTINCT AMONG ANIMALS

IT is not often that we pause to think over the marvels which abundantly manifest themselves in the animal world. Not even the lover of natural history spares much of his time for an intense study of what I may describe as animal psychology. This is a matter for very great regret, for the reason that by want of enterprise we place a limit to the extent of our knowledge of the ways and workings of a section of creation of which man himself is a part though he is the undisputed master and lord of it.[1]

Let us, in this short article, consider but one part of animal psychology—the time-instinct which is so strongly marked among certain animals. It may be safely asserted that almost all animals possess the time-instinct—that is to say, they possess sometimes a definite, but invariably a vague but workable idea of the passage of time. Whence comes this idea, this perception, or impression, or whatever we choose to call it? Until the study of the problem of animal psychology goes further than it has, we cannot attempt any satisfactory answer even in the nature of a theory.

Take, for instance, the tiger, considered to be a champion idiot among animals with nothing to constitute his glory except his immense strength and unparalleled ferocity. Even he has an idea of the passage of time. He knows when it is nearing midnight, when it is past midnight and when dawn is approaching. The sambhar and the boar, the cheetah and the bear, the hyena and the jackal, and, in fact, all night-feeders and night-roamers have the time-instinct strongly developed.

To go into detail, if, for example, a tiger discovers by accident that a sounder of pigs cross a certain stream or pass through a certain forest tract about midnight, he will so time his movements as to be in ambush near that particular stream, or forest tract, precisely when it is nearing midnight and, we almost

[1] There is now a large library of books and articles on animal psychology.—ED.

TO A KITE

FLY, fly O Kite, in the air,
Soar, soar, O Kite in the sky;
You are like my thought, for I too fly my thought
In the sky of imagination, watch it soaring high and high and amuse myself just as your flyer does.
Fly, fly O Kite in the air,
Soar, soar O Kite in the sky;
You are like my heart, for my beloved often
Fastens the thread of her eye-ray to it and keeps it flying in the sky of love.
Like your flyer too this is her most pleasant hobby.
Fly, fly O Kite in the sky,
Soar, soar O Kite in the sky,
You are like my soul—for my soul too while it flies in the sky of eternity is attached with a silken cord of love with the great Flyer.

D. M. MUNGIKAR,
IV YEAR CLASS.

measure;—and this is what Staneilovsky has done. His actors do not create the rôles;—his characters become exactly the rôles. This according to him is the true aim of the theatre.

Florenz Ziegfeld.

Ziegfeld is perhaps the most widely known and famous of living artistic producers.[1] As far as it concerns the greatness of the work he can hardly be given a seat besides Craig, or even besides Staneilovsky; yet we see his influence overshadowing not only the stage, but the screen also. He selected musical romance and musical comedy—hitherto ignored as artistically the most trivial of the dramatic arts—for his productions, but he attempted to produce real art through them.

His field is no doubt very limited, nevertheless it gives him a chance of inspiring what might be called *Æsthetic Sense* in the people, making the art as amusing to the crowd as it is to the 'select few.'

He combines all arts in Dramatic Action,—the sombre poses of sculpture, the enchanting pageantry of classical painting, the lilting dreaminess of music, the dynamic force of the muscular dances, the heart-breakingly beautiful charms of the chorus; and with a sane æsthetic harmony, he creates an extravagant dramatic phenomenon.

The æsthetician in him reveals itself in every inch of his spectacular stage. The bevy of beauties he has selected for his *danse ensembles* cannot be rivalled by any other such group in any part of the globe. Even his *Follies* may be termed artistically designed.

These great men are neither the dramatists, nor the actors, yet they are superior to both. They are the epoch-makers of the stage.

[1] He has died as these lines go to press.—ED.

AZIZ AHMAD,
IV YEAR,
Osmania University College.

should be in his work like God in creation, invisible and all powerful; he should be felt everywhere and seen nowhere.'

In short, he contrived to present the soul instead of the body, the spirit instead of the form, by representing the symbol of the soul or the spirit.

His ideas did not fail to produce gradually a revolutionary change in the technique of the theatre. He began his career as a producer in London in 1902, Handel's *Acis and Galatea* and Purcell's *Masque of Love* being his first productions. He made designs for the production of several of Shakespeare's plays, the most important of them was the design for *Hamlet.* Being Ellen Terry's son, he found a lot of chances to bring his designs into practice;—and his genius was always crowned with success. His chief work was done in Florence where he founded a school, and designed the memorable production of Ibsen's *Romersholm* in which Eleanora Duse appeared in the leading rôle. During his famous liaison with Isadora Duncan, he made designs for a few gorgeous productions in the various parts of the continent;—some of the designs were made for the Russian master-producer Staneilovsky, and did not fail to impress him.

Staneilovsky.

Staneilovsky, the Russian master-producer, has neither the magnificence of Wagner's personality, nor the enterprising genius of Craig; yet he presented a system true, realistic, powerful, and full of life. His greatness lay in creating *Life* on the stage by making the very form a living symbol of the spirit.

In his productions the rôles were given to the choicest actors who had something in common with the characters of the play: so that they might feel and realise their rôles.

On various desks but in the same room, the actors had to read and re-read the parts they were given to pronounce, until the very spirit of the characters went into their souls, and thus when they 'felt the rôles', they used to get up beyond themselves, and rehearse the whole thing, becoming the very parts.

The realism thus achieved could not be attained by any other

The genius of Gordon Craig was the first to present, and to bring into practice a thing that was *entirely new* ; he was a sensation in the realm of theatre.

' The art of the theatre is neither acting, nor the play ; it is not scenery, nor dance, but consists of all the elements of which these things are composed : Action which is the very spirit of acting ; Words which are the body of the play ; Line and Colour which are the very heart of the scene ; Rhythm which is the very essence of the dance.'

This is what Gordon Craig says with a sincere vehemence in his *Art of the Theatre* ; and then he sums up the general outlines of the idea on which his theory is based.

' A theatre is a place in which the entire beauty of life can be unfolded, and not only the external beauty of the world, but the inner beauty and meaning of life.'

Arthur Symons shows us from a more elaborate and artistic angle, the medium of Craig's art in his *Studies in Seven Arts* :

' The aim of modern staging' he says, ' is to intensify the reality of things, to give you the allusion of an actual room, or meadow, or mountain. We have arrived at a great skill in giving this crude illusion of reality. Mr. Craig aims at taking us beyond reality ; he replaces the pattern of the thing itself, by the pattern which that thing evokes in his mind, the symbol of the thing. Mr. Craig, it is certain, has a genius for line, for novel effects of line. His line is entirely his own ; he works in squares and straight lines, hardly ever in curves. He sets squares of pattern and structure on the stage. This severe treatment of line gives breadth and diginity to what might otherwise be merely fantastic.

' Success of course in this form of art lies in the perfecting of its emotional expressiveness. The distinction, the incomparable merit of Mr. Craig is that he conceives his setting as the poet conceives his drama.'

Gordon Craig insisted on the destruction of the present system of the theatre, quoting from Eleanora Duse, ' To save the theatre, the theatre must be destroyed.'

He applied to the theatre these words of Flaubert ' The artist

The first part though not very important is the only intellectual record of the history of opera, in which Wagner discusses the art mediums of his predecessors:—Mozart, Rossini, Weber and Beethoven.

In the second and the third part of the book he presents his own theories that were received with unbounded admiration. All his theories were based on his definition of the stage:

'*The two factors of the stage are: Poetry, carried to its utmost limits in Drama; and Music carried to its utmost limits as the interpreter and deepener of Dramatic Action.*'

The element of recitative music (that may harmonize with the poetry, without crushing its force) was paramount in his compositions. He brought even the most unharmonious sounds within the range of music; thus giving it a universal circumference.

Another important change that he made in the stage arrangement was to conceal the orchestra from the audience, and thus to dwarf the great importance that was attached to the instrumental music.

In spite of the towering appreciations, Wagner's revolutionizing theories raised a storm of controversy; his opponents charged him with enslaving the art of music and limiting it to recitation, and mere imitation.

He was not merely a theorist, as his practical work proved shortly afterwards. He founded the Bayreuth Theatre, the most exquisite and artistic cradle of music the world has ever seen. It remained a Mecca for the pilgrims of art during his lifetime, and after his death the traditions were kept up by his wife Cosima, and his son Richard Wagner. The great dancer Isadora Duncan gave a series of memorable performances in accompaniment of the 'Bayreuth Melodies.'

Edward Gordon Craig

A figure, by no means as magnificent as that of Wagner, but in theatrical history not less important, is that of Edward Gordon Craig.

THE MAKERS OF THE MODERN STAGE

THE Theatre is a phenomenon which consists of various efforts that join together, creating a harmony to produce what may be called the 'Æsthetic stage effect.' The playwright, the actors, the scenario writer, the costume-designer, the stage director, the art director, and if it is a musical play—the composer, the chorus, the orchestra, in short every kind of active human force that has a hand in the production, has a separate position too. But the premier honours go neither to the dramatist, nor to the actors; it is the 'Producer' that deserves them. By 'Producer' I mean the *Artistic Director* in whose hands rests the most important factor of the production, namely, the harmony of the whole play; and thus he occupies the position of greatest responsibility. He is the supreme force, all other elements of production being his tools. It must be remembered that Gordon Craig has a position of more importance in the history of the theatre than George Arliss or even Bernard Shaw.

In this short essay we cannot undertake the responsibility of tracing out the history of Art-directing; we can only discuss briefly the theories of the various modern heralds of the theatre.

Wagner

The first great theorist who was also a great producer, and the founder of one of the most famous schools of Dramatic productions, is Wagner.

With his *Nibelungen Ring* begins a new chapter in the history of opera. Being an excellent musician, a gifted literary figure, and a sane stage technician, he managed to open a new era in the kingdom of the theatre.

The most important of his works on the dramatic technique is *Opera and Drama*, a book in three parts, that deal with (*a*) the art and history of opera, (*b*) the play and the nature of the dramatic poetry, and (*c*) the art of poetry and tone in the drama of the future.

FAITH

WITH science and knowledge lured I far scanned
Nature ; Evolution its tale of ocean, primitive
Its life on land, the ice-age grip and the Brontosaur,
The flower's birth and the bird's coming, the triumph
Of the mammals, Man's origin and the social
Evolution to me disclosed, but yet I felt, how
Protoplasm was from the lifeless matter stirred
And into cells formed. Its heat and chemical changes
Life evolved, but what of Heat and Chemistry
Who made Heat and Chemistry ? Where was the first
Start ? Fly to space and contemplate awhile :
Whose organic Power fashioned the spiral nebulæ ?
The Philosopher, a wreck on the shores of thought,
Meekly the life of matter and value asserts.
Goodness, Truth and Beauty, life's æsthetics are.
And into them our human life would turn.
Laugh poet and say—but what of those who died
Millions of years gone by ? Evolution
Born of rolling years, countless living things engulfed,
And knowledge would devour evolution in countless years ;
Yet the scientist, the philosopher, the astronomer
The biologist and the surgeon, the archæologist,
Will enjoy knowledge of value. Will all life
Dissolve into science ? Never. Then what of the rest ?
The globe with life clipped fairly breathes
The air and drinks the water, uses the earth and enjoys
The heat, but only Europe Radium and X-Rays knows.
One-third of the wide Universe uses the plane,
The crane and the ship, but the whole universe lives
Is science and knowledge thus for the few, and Faith
Whose wide arms the whole creation embraces
To shatter in the dust !

M. A. QAYYUM KHAN, M.A.,
RESEARCH SCHOLAR,
Osmania University College.

for that would give rise to rivalry, quarrels and misunderstandings. But in the other case more than one Wazîr might be appointed. They might be entrusted with the work collectively, as was done in the case of more weighty affairs, or they might be employed for special and well defined work.[1] But here, again, was the danger of misunderstandings. On that account, writers on political science have generally forbidden the nomination of many Wazîrs, and have allowed it only in two cases : first, as the Wazîr of a particular locality, and some province, as Egypt or Iraq, might be assigned to him ; or some particular branch of administration might be entrusted to him. One might be appointed for military affairs, another for taxation and so on. In the first case the Wazîr would be like an old Persian satrap, while in the other he would resemble the Minister of a modern State.

This office was conferred directly by the Caliph himself, and, except in this instance, there was absolutely no formality in the appointment of any other official. The oriental potentates were, more or less, of retiring habits. They came very little in contact with the world, their intercourse being limited to a small circle of persons. Even to them they expressed themselves by gestures, or in short, laconic sentences. It is, again, a fertile field for controversy among the Muslim jurists, whether the appointment of a Wazîr was enough, if made by a gesture, or an express order was necessary.[2]

The Wazîr could be dismissed only by the Caliph, who was an absolute sovereign, and could dismiss all his servants according to his own opinion. Generally in the whole of the Muslim political organization there was not a single official who was not removeable. Even the magistrates and the religious leaders could not claim the privilege of being permanent. There is only one instance in the whole of Muslim history, where necessity was made a virtue. It happened in approximately recent times, when Muhammad 'Ali Pasha opposed the Turkish Sultan and was appointed to a permanent post.

[1] Mâwardî, p. 44. [2] Mâwardî, p. 38.

MOHD. JAMILUR REHMAN, M.A.,
Professor of Islamic History.

to collect land revenue, the tenth, the poor tax or such other duties which are paid only by the Muslims.'[1] To support his assertion, he quotes a passage from the Quran, which, in general, disallows an intercourse between the Believers and the unbelievers. It would be presumptuous on our part, if we were to give our decision about a subject which has divided the learned Muslim jurists into two opposite camps. But we might remark that probably a misunderstanding has always existed about this matter. For, from what Mâwardî has said, it is clear that the second Wazirate was not quite truly official in the sense of Islamic political laws, but, on the contrary, the second Wazîr was a kind of a commissioner. Mâwardî observes the same thing, and says that this office was not conferred by formal investiture and installation[2], as was otherwise essential in the case of the other Wazîr. Also, his assertion, which is not contested, is that this office could be held even by a slave, who was otherwise formally debarred from other services. As the second Wazîrate was not officially recognized and yet had great importance in official circles, it would not be wrong to entrust it to a non-Muslim, who would come into contact with Muslims in the performance of his manifold duties.

Both the kinds of the Wazîrates, as we now clearly see, held out together and completed each other. They throw a sidelight on the Caliphate itself. But as the Muslim empire expanded, and the volume of work increased, it became difficult to rule it with the help of even two Wazîrs. It was then thought necessary to invite the co-operation of more persons for the proper execution of government decrees. And as, occasion rose, more than two Wazîrs were appointed. But it was not possible to have two Wazîrs, who might represent the Caliph fully and independently,

ولا يجوز تولية الذى فى شئ من ولايات المسلمين الا فى جباية الجزية من اهل الذمة (1)
او جباية ما يوخذ من تجارات المشركين فاما ما يُجبىَ من المسلمين فى خراج او عشر
او غير ذلك فلا يجوز تولية الذمى فيه ولا توليتهُ......................شئ من امور المسلمين *
See كتاب تحرير الاحكام فى تدبير اهل الاسلام of which Hâjî Khalfa has spoken in great details (vol. ii, p. 210). Yet Flügel has omitted all this in his Latin translation, especially the headings of the chapters leave much to be desired. The MS. which I have utilized is, to my knowledge, absolutely unique, and belongs to Kaiserl. Hofbibliothek of Vienna.

[2] Mâwardî, p. 41.

contact with the Caliph, as he did, a fine culture and great social talents were desirable and necessary in him. At the same time the qualities of conscientiousness, punctuality and versatility were indispensable.[1] Again, it was not enough for him to be a master of only one science, be it law or theology, or to have the knowledge of all the different departments of State, for he might be called upon to take part in any branch of knowledge, according to the wish of the Caliph. But such a versatile genius was difficult to find; hence the limitations of a Wazîr. Physical and mental fitness, especially clearness of mind, were thought indispensable for him. Morally it was thought necessary that he should be free from hatred, anger, corruptibility and frivolity.

The qualifications for this office being so high, and their possession being so strictly demanded, it is not surprising that some Muslim jurists considered this office to be open even to the non-Muslims. Mâwardî, who lived in the eleventh century of the Christian era, was the first person who gave expression to this idea.[2] It is easy to comprehend that such political liberality, which forms a strange contrast with the prejudices of the Christian Europe of even the nineteenth century, became an apple of discord between the jurists and canonists of Islam. While one school allowed it, the other censured it, and described it as an unpardonable fault.[3] Ibn Jimâ'ah, an author of the fifteenth century, speaks against the employment of protected non-Muslims as officials of a Muslim State. For, he says, 'It is forbidden to promote any one of the protected peoples in the Muslim State service, except for the collection of poll-tax and customs that are levied on the goods of the unbelievers. But any non-Muslim, who might seem to rank above the Muslims, should not be employed

[1] Mâwardî, p. 42. [2] Mâwardî, p. 43.

[3] وهل يشترط فى هذا الوزير الاسلام حتى لو اقام السلطان وزير التنفيذ من اهل الذمة كان جائزاً ام لا اختلف آراء الائمة فى ذلك فذهب عالم العراق الامام ابو الحسن على بن الحبيب البصرى رحمهٔ الله الى جوازه و ذهب عالم خراسان امام الحرمين ابو المعالى الجونى الى منعه و عدّ تجويز ذلك من عثرة لن تقال و خطأ فيما قال This is an extract from عقد الفريد of Ibn. Ṭalha, described by Ḥâjî Khalfa (vol. iv., p. 232). The MS. which I have used was brought out from the East by W. Graham of Bonn. The second chapter of this work, which deals of فى السلطنة والولايات (not as Flügel reads it الولاية) contains a short extract from the Politics of Mâwardî. But I could not take advantage of it for the textual criticism of the last named book.

not always bow down low on receiving rewards ; he who wins the hearts of men, through the magic of his speech, and the beauty of whose words captivates and subjugates the people.[1] '

The signet ring was the external mark of distinction of this office.[2]

Of less influence, and with limited authority, was the second Wazîr, whose business was in reality, only to execute the joint or separate decrees of the Caliph and his Grand Wazir. This office was not so much a real post of the Islamic State organisation, as it was an institution which acted as an intermediary between the highest and the lowest, official as well as non-official. He, therefore promulgated the decrees, announced the appointment of officials, proclaimed the preparations for war, and was the highest authority for the proclamation of all events of political interest. As he was also occasionally invited to the Council for consultation, his powers were not limited only to being a medium between the Caliph and his subjects, without his ever acting independently in his ministerial capacity. It should not be positively inferred that he had only a subordinate position. His importance stands out clearly by the fact that all the decrees, statements and appointments had to be attested by him, and without his signature they had no value.[3] The process was something similar to the rectification of decrees by the Chief of the State, in a constitutional government, through the Minister.

The difference between the two Wazîrs in their status and circle of work, naturally shows us the relation in which they stood to each other. It is evident that so lofty had become the status of the two Wazîrs, through their contact with all the affairs of the government, and through their personal touch with the Caliph, that, by reading books on the subject, a man could only form a hazy idea of their official importance. Then, again, the question rises : how would all the necessary qualifications serve him in his official capacity? for he found very little opportunity of using them. But it must be remembered that, coming in personal

[1] Mâwardî, p. 34.
[2] Ibn Badrûn, ed. Dozy, p. 244.
[3] Mâwardî, p. 41.

courtier, and must know how to amuse and entertain his master. If the master, at a time, requires intellectual food, he must understand how to administer it; if he wants to be amused, the Wazîr must become a *maître de plaiser*. He must be a perfect master of what the Arabs called *Adab*, and is known among us as 'perfect education', or, as the Arabs say, 'he must be conversant with chess, the harp, polo, mathematics, medicine and astrology; furthermore, must understand poesy, grammar and history, and, last but not the least, must be able to recite poems and stories'.[1] These qualifications have given rise to a number of books, which treat of the instructions to the Wazîr, but which are not, for a greater part, very important from the practical point of view. On the contrary, they speak about the general manner of speech, and set forth the admonitions in an unctuous and aphoristic style. Of this kind, for instance, is the book the *Principles of the Wazirate*[2] by Mâwardî. Looking at the name of the book, a man would think that he could get something useful from it; but in reality it was a superfluous book and could lay claim only to linguistic interest. Unlike this, on the contrary, is the important book, the *Guidance of the Wazîr*,[3] for it contains, in a concise and yet encyclopædic form, things worth knowing about all the spheres of Islamic culture, and may be read with great advantage. In short, laconic sentences, and not without a poetic touch, the Caliph Mâmûn expresses himself as follows about the choice of a Wazîr: 'I want, for my help, a man with all human virtues, pure of heart, straightforward in his dealings, trained by learning, made wiser by experience, proved and tested as a confidant, ever ready to carry out orders; who is silent by sagacity, and knows how to converse about knowledge; for whom only a look is sufficient, and to whom a sign suffices; he who has the energy of a general, the seriousness of a magistrate, the humility of the learned, and the acuteness of a jurist; he who is grateful for favours, and is steadfast in misfortune; he who does

(1) وقال ذو الرياستين الادب عشرة اشياء ثلاثة انوشيروانية و ثلاثة شهر حبية و ثلاثة عربية و واحدة فاقت عليهن كلهن - فاما الثلاثة النوشيروانيه فلعب الشطرنج والضرب بالعود والضرب بالصوالجة و اما الثلاثة الشهر حبية فالهندسة والطب والنجوم و اما الثلاثة العربيه فالشعر والنحو و ايام العرب و اما الواحدة التى عليهن كلهن مقطعات الشعر والسمر - See كتاب ادب الوزراء, fol. 6 r.

(2) قوانين الوزارة.

(3) كتاب ادب الوزراء.

of the Wazîr, then his orders remained in force, while that of the Wazîr were annulled *ipso facto.*[1]

From this short account of the powers of this Wazîr, we can clearly see that his personal position was the same as that of the Caliph. The only difference, in this respect was, that as the Wazîr was a personal servant of the Caliph, no importance was attached to his family connections at the time of his appointment, while the Caliph must belong to the tribe of Quraysh. All the other remaining qualifications were the same for the Caliph and the Wazîr. When the Caliphate ceased to be an elected institution and became limited in particular dynasties, the Omayyads and the Abbasids. it quite frequently happened that in order to decide about the occupant of the throne the least possible requisite qualifications were required, and family connection became the chief thing to raise a man to the Caliphate. Under the first four Caliphs, who were all elected to rule over the people, we find no trace of the Wazîr. They were, on the whole, such efficient men that they could easily dispense with outside help. The Wazirate first came into view at the end of the Omayyad period, and attained its highest glory under the Abbasids. The Wazîrs were then the real rulers, and eclipsed their masters, who had by now become estranged from all the various affairs of the State, and passed their time in the *harem*, amusing themselves with their male and female slaves.

Great and numerous were the qualifications which the Wazîr was expected to possess, and we know from history, cases where individual men filled this high post with such distinction that they not only earned the approbation of their masters, but also the love of their subordinates. Such were the Barmecides, whose tragic end has made them famous ; and in still later times the Koprili of Turkey, who gained laurels in civil and military administration, and who on the one hand maintained intimate relations with their masters, and on the other, earned the love and esteem of the people. But what makes the office of the Wazîr still more important, is the condition that the Wazîr, besides other qualifications, should also possess the attributes of a perfect

[1] Mâwardî. p. 40.

officials differed in their rank, functions, and the qualifications required for each of them.

The absolute and all powerful helper of the ruler, who, in later times, came to be known as Grand Wazîr, occupied the most important and influential place among the officials of the State. He was the *major domo* and *alter ego* of the Caliphs, from whom he differed only in name. The power and authority which this Wazîr possessed, often rose above that of his master. From this very fact we can form some idea of his official powers. He exercised, in fact, the full authority which the Caliph himself possessed, and was only bound to keep him informed of his decrees and arrangements, so that his dependence on the Caliph might be manifest to the people.[1] The Wazîr had the authority, like the Caliph himself, to take up all the affairs of the State, no matter to what department they might belong; and could see to the rectification of those affairs personally or through his nominated officers. In short, he was empowered with all the authority which the Caliph himself possessed, with the exception of three things: (1) the Wazîr was not allowed to nominate his representative or successor, for he was a personal official of the Caliph; (2) he could not be dismissed by the people, for he acted in the name of the Caliph; (3) he could not, without special permission of the Caliph, dismiss or remove any of the officials appointed directly by the Caliph.[2] In all the remaining matters he was allowed such a free hand that the Caliph himself, in most cases, had no right to reverse or remit the decision of his Wazîr. But the Caliph had the unquestionable right to dismiss the officials nominated by the Wazîr, and even to modify or annul the measures passed by the Wazîr, respecting civil or military administration. Then, again, it was not the Wazîr, but the Caliph who was wholly responsible for all the affairs of the State. In case there was difference of opinion between the Caliph and the Wazîr, the question was decided by priority, provided that none of them had a knowledge of the other's decision. But if the Caliph was present on the occasion and gave his decree contrary to that

[1] Mâwardî, p. 38. [2] Mâwardî, p. 39.

been put forward to explain this word.[1] In the first place, the idea is said to be taken from 'recourse'[2] that is, 'he to whom the Caliph has recourse'; then, again, the idea is connected with the vertebral column,[3] because, the Caliph through the help of the Wazîr, remains erect, just as this column keeps the body erect. But more probable, and the one more adapted to the position of the Caliph, is the third explanation, which is also preferred by Bayḍâwî.[4] According to him, the word Wazîr connotes the idea of burden,[5] that is, 'he who shares the burden of the Caliphs,' 'a helper, coadjutor.'

This word is also used in the *Koran* (Sura 20, 30–35), where Moses turns to God with the prayer to give him his brother, Aaron as a fellow-worker and a colleague. 'And make for me a *Wazîr* from my people—Aaron my brother; gird up my loins through him; and join him in the affair, that we may celebrate Thy praises much and remember Thee much.' This passage of the Koran shows that the appointment of the Wazîr is not only allowed but commended by the Law. Moreover, it is absolutely impossible for the Caliph to fulfil all the obligations of ruling the State and the Church single-handed. So he partially transfers his powers to another person, and shares the responsibility with him, in order to manage the affairs better and to obviate the danger of mistakes. Here it might be pointed out that in Islam the Church and the State are identical. They are only the two sides of the same thing, and govern the whole life of the individual as well as of the society.

The Muslim jurists differentiate between a full or absolute, and an imperfect Wazîr with limited authority, who represented the Caliph in full, or only partially. The first Wazîr is called the وزیرالتفویض (i.e. the plenipotentiary in ruling) and the other وزیرالتنفیذ i.e. one who only executes orders from the ruler.[6] Both these

[1] Mâwardî, p. 38; the same in قوانین الوزارة. MS. in the Royal Oriental Academy of Veinna, No. 195 (473); fol. 8r.

[2] الوَزَر = الملجاء, Sur. 75, 11.

[3] الأزر

[4] Sura 20, 30.

[5] الوِزر

[6] Mâwardî, p. 33.

he also represents him on certain occasions. This institution, in the form in which it was adopted in Islam, was borrowed from the political life of Persia. In the *Book for the Guidance of the Wazîr*,[1] it is said: "The Persian kings held their Wazîr in such an honour, as no other [king] ever did. They used to say, 'The Wazîr is the director of our business, the ornament of our kingdom; the tongue by which we speak; and the weapon which we hold ready to reach our foes in far off lands'." We can see from this description not only that this institution was a permanent feature of the Persian political life, but also how wide was the authority with which the bearer of this office was invested. From Persia this institution was taken over by those small kingdoms of the pre-Islamic Arabs, which flourished in the north and the south of the Peninsula. Jauharî gives the most detailed description of it among the pre-Islamic Arabs.[2] "The post of *ridf* (ردافة) exists for the following purpose: When the King sits (in audience) the *ridf* sits on his right hand, when the King drinks, he drinks before all others; when the King goes to war, he takes his place, and fills it till his return; when the army comes back, he is entitled to the fourth part of the booty." According to Jauharî, in the kingdom of Hîra, situated on the Persian frontier, this office was hereditary in the tribe of Yarbû' (يربوع), who had been invested with it, because they had renounced all claim to the throne. Here, again, we have another proof of the Persian origin of this office; for, according to Procop's account, the heredity of office was a peculiar characteristic of the Persian system of government.[3] We can quite easily see that the kingdom of Hîra, being situated in the neighbourhood of Persia, and thus being open to foreign influences, must have taken over this institution from it. Among the Muslims the name of this office was changed. The holder of it was no more called a *ridf*, but became known as a *Wazîr*. Three etymologies have

(1) وكانت ملوك الفرس يرون الوزراء بمنزلة لا يراهم بها احدٌ سواهم ويقولون الوزير نظام امورنا وجمال ملكنا و لسساننا الذى ننطق به و عُدّتنا التى نعتدها لنتاول عدونا فى الارض النائبه [النائيه]
See كتاب ادب الوزراء fol. 3 r. Mâwardî, p. xiv.

[2] MS. Gotha, 477, fol. 13 r.—14 v. The passage is also quoted by Harîrî, ed. de Sacy, p. 278.

[3] De bello persico, I., 6.

THE WAZIRATE[1]

THE first successors of the Prophet Muhammad were very efficient men, and strove in every way to fill their posts with distinction. They were not only the generalissimo of the Muslim army, whose conquering expeditions soon extended over Persia and Egypt, and beyond them to India and the Western lands, but were also the religious leaders of the faithful, and performed the highest religious functions personally. Under these circumstances they had occasion to lay down the laws, and decide the cases that came before them.[2] On the whole there was no branch of administration which was excluded from their care. Indeed they were in direct personal touch with the farthest parts of their State, and, from their residence, kept a watch over all their officers. But with the extension of Muslim empire, which in a short time grew to be the greatest and the mightiest that the world had ever seen, there must have been felt the need of some kind of representation, to help the ruler in coping with the vast volume of work, which could not now be handled singly. At the same time, by the conquest of Syria and Persia, the Muslims had an opportunity of studying the political institutions of the Greeks and the Persians ; for they were the two nations who had, from quite ancient times, created these institutions, and had preserved them upto the time of the Muslim conquest. Fortunately for the Muslims, the conquest and subjugation of these nations under the might of Islam, occurred at a time, when there was at the head of the Muslim State a man distinguished for his tact and energy and singularly free from prejudice. This was Caliph Omar, who adopted and introduced everything that he found useful in the subjugated nations, and assimilated it in Islam. Omar was thus the real founder of the political institutions of Islam.

Naturally, the function of the representative of a ruler is not only that he helps and advises him in administrative matters, but

[1] Adapted. *Vide Z. D. M. G.* vol. xiii. (1859).
[2] Mâwardî, p. 129.

acre. For this the Commissariat of Agriculture is made responsible, but in practice the authorities found that in agriculture they had to overcome weather conditions over which they had no control. These difficulties, however, are met, to a large extent, by the establishment of big estate-farms and by the introduction of collective farming. Thus the Soviets have attempted to eliminate the problem and the danger arising from rich peasants who stand in the way of collectivising agriculture. Simultaneously with this, they have also introduced machinery, the workers following behind in caravans the tractors and combines. All this resulted in the decrease in the cost of cultivation. They are also able to have fixed stable prices and large profits. But at the same time the idea of profits is altered. There were no huge gains or losses. Whenever there are gains, they are distributed in the whole industry in question. Thus a part is used for the cultural benefit of the workers and a part is taken by the State as a kind of tax and profits by the State; a part for increasing the capital of industry and the rest taken by the State. The Five Year Plan therefore demonstrates two things, that machinery can be used to improve the standard of living without at the same time involving a degradation of life. Secondly, it shows that there is less wastage and consequently a higher standard among all the people. The Soviet government have given their people a new energy and enthusiasm; they have proved that the State exists for the service of the individual and finally they have made the individual himself centre his interest in the community and it is this which seems to prosper Russia.

MIR MAKHDOOM ALI KHAN.
V. YEAR (HISTORY),
Osmania University College.

THE FIVE YEAR PLAN

THE great object of the U. S. S. R. is the establishment of a classless society which is to be based on collective ownership of the means of production. Russia has undertaken with the aid of a new socio-political instrument to do something on a large scale concerning the very complex policy of national development. The Five Year Plan is intended to achieve this. Its being can be dated back to the year 1921, when the first legislation was passed by which a State planning commission was set up. It was to work out a single nation-wide economic plan and also to work out the pressing economic task of the immediate future in the fullest detail; thus there are two categories of work. One belonging to the general future and the other belonging to the calendar year. The first contains the objectives and hopes of Russia and the second carries out the mandates given to the operating units. After 1924 the Gos-plan developed for the whole of the U.S.S.R. a series of one year plans. This continued till 1928, when it was succeeded by the famous Five Year Plan.

The Supreme Economic Council and the Commissariat for Supplies are the two government departments which deal with the industrial production. The latter being in special charge of all questions of food production. In each important industry there is one great combination to buy the raw material and sell the final product. It also directs a group of factories but each individual factory is reponsible to the particular combination to which it belongs. This involves the double principle of corporation and combination and therefore has helped Russian industry to a large extent.

There is also the problem of agricultural reconstruction since Russia is, like India, an agricultural country and since the peasants had a lot to do with the Revolution. With the nationalization of land, large estates broke up into self-sufficient holdings. The Five Year Plan provides for an extension of the amount of land under cultivation and also for an increase of the yield per

enthusiastic letters. 'In his face,' she dreams, 'the whole world plays to me,' and 'it outshines all the wisdom of the world.' Romantic and fantastic is also the clever Rubel who saw him three times and cherishes no other wish than that Goethe should live to see himself loved by his contemporaries with their judicious hearts, idolized and acknowledged, studied and understood.

Recognition came from foreign lands. The eighty-year-old Goethe observed with pleasure: '*Helena* in Edinburgh, Paris and Moscow.' The second part of *Faust* was taken notice of in an English, French and a Russian newspaper. Three translations of the first part were already before him in French. And the reviewer in Edinburgh is the great Scotchman Carlyle, who writes to the German poet of his hope to see him face to face and to unbosom as before a father the sorrows and deviations of an afflicted heart. Carlyle's wish that his life should remain long, long after as a source of consolation and instruction is fulfilled not in letter but in spirit. Through Goethe German literature makes its debut in the literature of the world with dazzling grandeur.

S. VAHIDUDDIN,
V. YEAR (PHILOSOPHY),
Osmania University College.

notorious *Faust* owes its undeserved celebrity to the vulgar taste of the obscurantists. He is here at one with Herr von Kotzebue who labelled *Faust* as a 'rugged masterpiece' and thereby did not conceal his personal enmity with the Manager of Weimar Theatre and Privy Councillor.

The resentment of his adversaries began to grow unchecked. The year 1821 saw the publication of a spurious *Wanderings of William Meister* by Pastor Pustkuchen. He sees in Goethe 'The representative of wicked, formless, dissolute modern times'. 'Never has he grasped what fidelity means'. He can only paint in lively colours the disgraceful, inconstant and unbridled life. Prof. Köchn and Heinrich Vogler delivered a dissertation on 'Goethe as a Man and Writer', and pretended that it was an adaptation of an English pamphlet by Clover. Goethe is there depicted detestable as man on account of his dangerous propositions and immoral politics. He indulges himself in trifling quibbles. He has now become too old to write and hence drivels at random in the weakness of his age. His autobiography teems with coarse vulgarisms. 'He strips himself stark-naked and thus exploits the public of their money.' Being an egoist he concentrates himself on his own person. His conversations are directly nauseous and offending to the ear.

Amidst this chorus of hatred the voice of love stands out more prominent. Little by little the view of Goethe becomes clearer and the clouds of the present hanging over him dissipat- before the light of the future revealing continuously his whole work. In the beginning the younger generation of poet took pleasure in dethroning the Olympian Zeus of Weimar The invalid Hardenberg, Novalis, laughed at *Wilhelm Meister* it is to a certain extent prosaic and modern. Dorothea Schlege had the audacity to talk of the poet as a 'vulgar and flat Goethe But the Romanticists become bored by the very same *Willia Meister*, of Mignon and the Harper, of their charm and the music, that extorted great admiration from Friedrich Schlege 'Golden fruits on silver dishes,' says Friedrich in the *Atheneu* and proclaims Goethe 'the Governor of Poetry on earth'. T romantic Bettina dedicates to him fifty years after his death

Its fame spread throughout Europe and into the farthest lands. A German sees in the captain's cabin of a trading vessel a Chinese painting with the figures of 'Werther's Sorrows'. 'What strikes me', sighs Goethe in his Viennese epigrams, 'is that even the Chinese paint Werther and Lotte with uneasy hands on a glass!' The artillery lieutenant of Napoleon Bonaparte read the sentimental romance seven times with hectic excitement. But the Werther fever caused also a reaction, a flood of moral revolt. *Stella*, the work of his twenty-seventh year was denounced as a despicable play because of its advocacy of polygamy, as 'Werther' was as a school of suicide.

In the year 1800 Klopstock comments upon *Iphigenia*, but only to deprecate it maliciously. 'It is a lifeless imitation of the Greek. Besides, it abounds in dialogues that can hardly be read through. And then look at the structure of the verses!' *Egmont* also displeased the reviewer of the *Allgemeinen Literatur-Zeitung* in Jena. 'This tragedy is said to have no dramatic plan. The poet has tinctured Egmont with his own traits in order to bring him down to our own level. He makes him a lover of common calibre, and suffers him no eminence. The result cannot be otherwise than a somersault in the opera-world.' The reviewer is no other than Professor Schiller (who has not yet become Goethe's friend). 'Goethe's *Tasso* is on the whole imperfect', so declares the *Neue Biblothek*. It charges the author of *Geschwister* with 'negligence in expression'. 'The language is not wholly pure' is the verdict of the dramatic critic of Mannheim. *The Natural Daughter* was condemned in the same city on the ground of the marble-like frigidity of its verses. *Hermann and Dorothea*, too, does not find favour with the *Neue Biblothek*. Goethe's lyrics by no means produced any effect on his contemporaries. They have insipid and stiff rhymes and nothing of the real characteristics of true poetry. *The Bride of Corinth* is provoking, the erotic *Roman Elegies* vulgar and hackneyed. *The Elective Affinities* does not avoid the ludicrous. *Faust* has 'wretched rhymes', 'sheer sound and fury', 'a long litany of nonsense', 'a diarrhœa of indigestible ideas'. Franz von Spaun, the man who called the Prologue an arrogant fatuity, immortalises himself in remarking that the

as a research worker that he staked his name. He was to a certain extent proud of his Colour Theory which only he regarded as the true one. The young Goethe had already intoxicated the minds through his *Götz and Werther.* The forty-year-old man who has just returned from Rome, the creator of *Iphigenia, Egmont, Tasso, Wilhelm Meister* feels a strangeness growing between his Weimar days that had banished him to the small Thuringian city with its society of courtiers and the genius lurking within his breast. The friendship of Schiller inspired him with new ideas of creation on the one hand; on the other it diverted his attention from natural sciences to contemplative ones. Three years after Schiller's death he got *Faust: A Tragedy* printed, which is a later remodelling of the drama that he had planned in Frankfurt, shortly before his arrival in Weimar while he was greatly convulsed by the passions of youth. He steadily clung to his chief occupation to the last. The second part of *Faust* was not fully ready when he died. He is, indeed, a Lear who has played himself out.

A generation has past since the time of Schiller, since the time over which Schiller's widow said: 'How like burning meteors vanished together both of them, the one comprehending the other flame without destroying itself!' 'Do preserve yourself for us, my dear', wrote to Goethe Wilhelm von Humboldt, bemoaning Schiller's loss. 'Once we lose you all is darkness and confusion round and about'. But such a voice of unconditional admiration is rare in Germany. The old Goethe holds fast that the whole hostility of all daily and weekly papers, whether overt or secret, malicious or violent was set against him at the time. It was simply a repetition of what he had experienced in the foregoing decades. The only difference was that it did not inflame him as before.

The captious criticism even of *Götz* was not lacking. If Frederick, the King of Prussia, condemned the book as an abominable imitation of a bad English work and complained of its 'repulsive banality' in his French work on German literature, so has Lessing thundered against it and stigmatised it as 'a gut full of sand'. Werther produced a fever infecting one and all.

vitiates Kantian ethics and æsthetics and glorifies one of the most self-centred men of the world, the man in whom the most uncompromising kind of individualism is sublimated and tempered by the glamour of that love which seeks to transcend the finitude of man's existence through his own expansion and externalisation. Goethe's Faust, Mephisto and all his creations are no other than Goethe's own personality unfolding itself in different directions. Such is the tragedy of life that we mortal millions cannot go beyond our own self.

As Goethe's centenary was lately celebrated throughout the 'civilized' world we have thought it worthwhile to translate an article from his own countryman which succinctly shows the chasm that yawns between his contemporaries and his present day admirers. Never was it more imperative than in these days of petty 'Vaterlanderei' to live in his 'wide and luminous view'. How ironical it is that a Europe sunk as it is under the self-imposed burden of reparations and war debts, rent by racial and geographical boundaries, dreaming sometimes of a federation of Europe, sometimes of a Danubian confederation, but never of universal brotherhood, should have the courage to pay homage to the poet in whose philosophical Pantheism all differences of race and creed were indistinctly merged. When we are marching on our weary way, Goethe, let thy spirit shine as a beacon guiding us from falling into pitfalls and sinking back in blank despair and negation !

S. V.

In the 86th year of his life, a century ago, Goethe died in a house at Freuenplatz in Weimar. Was he the acknowledged national poet? He himself hardly believed in his increasing solitariness. Bitterly enough has he written down the words: 'There cannot be any greater consolation for the common man than that even
is not immune from death.' His collected works in the
ne edition of 1787 to 1790 were bought only by six
rsons, and little was the sale of the special edition.
feats' so he confided to Eckermann, 'that I have
s a poet I attach importance to none'. It is only

GOETHE AND HIS CONTEMPORARIES

BY

Hans Wiegler [1]

WHEN Goethe's death was told, we said:
Sunk, then, is Europe's sagest head.
Physician of the iron age,
Goethe has done his pilgrimage
He took the suffering human race,
He read each wound, each weakness clear;
And struck his finger on the place,
And said: Thou ailest here and here!

M. ARNOLD.

When Goethe's temporal life was about to end he cried for light and more light. As we are still groping in the dark, still baffled by the same problems, still haunted by the same mysteries we shall do well to bear in mind his last words with all their profundity. His was, indeed, the life spent in welding the heterogeneous and contradictory elements of his multi-faceted self into one harmonious whole, into one organic unity. Let his fame as a poet, as a scientist and as a thinker rise and fall with the whims of the passing generations, the push that he has given to humanity can never be over-estimated. As all our life is the arena of antagonistic forces at deadly set against one another it gives a concrete form to the old legend of Adam and Satan. This conflict is beset with such risks that it may end in a pathological derangement of the subject. The glory of Goethe lies not in his vainly trying to eradicate the Satanic within him and thus suffering it to crop up later to the disintegration of the e absorbing and transforming it. In approaching his te life let us boldly do away with that 'disinterestedne

[1] Translated from the original German article of Hans Wiegler (*Berl Zeitung*).

CONTENTS.

Vo. V, No. 4.

One little word in this estimate of difficulties by a highly intellectual man with a scholastic training reveals the other side of the question. He speaks of it as a *modest* list, and we know at once what he means by *modest*. This is one of those words of quality which are very readily made to connote their opposites. It means here: You and I will agree that no ordinary person would be likely to take all this trouble to understand poetry, which should appeal to something more than mind stored with mediæval lore. There should be some instantaneous appeal to the spirit; the music, the colouring, the wavelike energy of the verse rolling up endlessly, should stir something within us that is akin, some rhythm of our own, some deep sense of beauty, without which we should never have opened the book. And after all, though Wordsworth is declared to be much more difficult than Browning, we should never demand from his readers a detailed knowledge of the French Revolution, of Mysticism, Logic, and of the geology and hydrography of the Lake District for an understanding and enjoyment of the *Prelude*.

E. E. SPEIGHT.

It has been asserted that 'the works of the great poets have never yet been read by mankind, for only great poets can read them.' And Thoreau goes on to say that our ordinary reading is as superficial as is astrology compared with astronomy.

That there is some truth in this sweeping statement, which seems to place great poets outside mankind, is shown by the continuous attempts through the ages to elucidate the works of great poets for each successive age. Even the simple language of the prophets of old would seem to disclose more meaning as the centuries go by, until some of us in these fortunate latter days know more, as Mr. Wells says, of Greece and Rome than was known in their hey-day. And some go further, like Emerson, who when reading Proclus found that he was exploring nature and fate, and was moved to say: 'It is a greater joy to see the author's author than himself.'

A terse and luminous study of the hardness of a great poet is included in Lionel Johnson's too little-known *Post Liminium*, a treasury of modern criticism. For him 'Dante will always be the hardest poet in the world, not excepting Æschylus, Pindar, Lucretius, Shakespeare, Milton, Browning.' And he goes on to show in what manner the hardness of Dante differs from the allusive difficulty of Pindar and the quality of Hamlet that is in Shakespeare himself. He shows how Dante for most people means a few names, such as 'Francesca, Ugolino, Matilda, Sordello, and a score of lovely descriptive lines,' while the great argument of the poem is beyond the ordinary reader. But this can be overcome, if we are willing to make a close study of mediæval history, thought and science, of the Tuscan language, of Italian art, Archæology and Topography. 'If you know the *Æneid* of Virgil and the *Summa* of Aquinas, so much the better will you know Dante. But it is not too much to say that till you know these and many other things also, you cannot know Dante. No other poet demands so multifarious a knowledge in his reader.'

And he goes on to compare Dante with Michael Angelo, both of them overwhelming in genius rather than conquerors by charm, both lovers of law, the beauty of both one with their thought.

> to him, but came back with a wonder, came back above all with a high and magnificent beauty.'

Coleridge has divided readers into four classes:

1. Sponges, who absorb all they read, and return it nearly in the same state, only a little dirtied.
2. Sandglasses, who retain nothing, and are content to get through a book for the sake of getting through the time.
3. Strainbags, who retain merely the dregs of what they read.
4. Mogul diamonds, equally rare and valuable, who profit by what they read, and enable others to profit by it also.

A little imagination would enable one to extend this classification considerably by making a little more allowance for human difficulties and aspirations. Books *are* bought in enormous numbers, even serious ones, and we must assume some serious aim in their being read; moreover it is certainly true, as Hugo von Hoffmannsthal has impressively pointed out, that:

> 'Everything that is written in a language, and everything, I dare to assert, that is thought in it, derives from the productions of those few who have ever dealt with that language creatively.
>
> All that which in the widest sense we call literature, down to the libretto of an old-fashioned opera and the paper-backed novel, all derives from the few great books of the world.'

For Hoffmannsthal the central gesture of the age is 'a man with a book in his hand, even as the kneeling man with folded hands was the symbol of another age.' And he finds in this universal, incessant habit of reading a sign of an intense spiritual yearning, most people seeking they know not what, but for him a stirring of the emotions by thought, a rousing of deeper, cosmic emotions, 'precisely those which a true and stringent science must always deny itself and which the poet alone can give.'

THE READER

IN all our study of literature we must remember that there are two parties involved. All the benefit we get from literature, whether as sheer and mere enjoyment, or as guidance, or as the encouragement our being needs for its fulfilment, depends upon this recognition that there are two parties to the comprehension of anything written, the writer and the reader. Prof. Raleigh somewhere speaks of this colloquy, this dramatic relation, coming into existence even when we read a lyric.

The Book of Job has been called the first great colloquy between man and his Maker. Thus we see into what awful presence we may be called when we open one of the books the world has set on high; and that in the reading of any great literature there may be in our presence, with the writer and the reader, a third, a shadowy watchman of our thoughts.

So the responsibility on the reader is a twofold one: he has not only to do justice to himself but to the author he is reading.

Resource to books has now become so much a matter of second nature that one of our leading scientists has had to point out the danger involved in a state which substitutes books for real life. This danger was hinted at half a century ago by Schopenhauer:

> 'One should only read when the source of original thought fails, which is often enough in the best heads. To scare away one's own original thoughts for the sake of taking a book in the hand is a sin against the Holy Ghost.'

This is of course a counsel of perfection, and it does not take account of the experience of those who read to compose the trouble of their souls, an experience almost lyrically recorded by Henry James:

> 'He began to read and, little by little, in this occupation, was pacified and reassured. Everything came back

From the dark background, that suggests the blankness of imagination, emerges a white marble phenomenon,———two lovers, a kiss, an embrace and a tomb. And we see the whole drama staged, in a glance at this masterpiece of sculpture. The Lovers' faces are half-hidden and undistinguishable. For Love is blind, and life is tragic; Juliet's naked shoulders here reproduce all that Shakespeare strove to do in the creation of the beautiful; the embrace, that has been carved with masterly strokes, reveals the immeasurable depth of the passion; and the tomb with its romantic yet dreary aspect, makes the piece a living tragedy.

With the genius of a Shakespeare, with the art of a Michael Angelo, with the conception of a Byron, with the treatment of a Beardsley, comes forth Rodin—one of the greatest artists that this world has ever produced since the golden age of the Greeks.

AZIZ AHMAD,
III YEAR,
Osmania University College.

ROMEO AND JULIET

A DREAM IN MARBLE

RODIN ! Rodin !! Rodin !!!

'Is it a dream?' felt my sleeping senses; but they woke and found before them an impression on paper, of the marble portraiture of 'Romeo and Juliet' by Rodin.

My eyes were fixed; I watched and watched, still bewildered, still intoxicated, still unsatisfied. I was unconscious. The Art with one of its paralysing strokes had numbed my senses.

A translation it was and what a translation; the translation of poetry into marble, of conception into style, of imagination into form. Only if Shakespeare could have known that he had a rival of his dreams in another sphere of Art.

Shakespeare and Rodin, the two creators of their own worlds, are here seen together composing a story of Love and Lament.

There comes Shakespeare, the greatest of all bards, and from the Eternal Spring of Love presents a gem, one the best, the noblest and the loveliest of the jewels in the literature of all time.

Four hundred years have passed; men still admire it, and they are not tired of admiring.

Then comes———guess who? Another dreamer, a dreamer in marble,———it is Rodin, the Michael Angelo of our century. With his sane, masculine conception he reveals in marble the beauty that lay buried in the dead poet's heart, and only a part of it he could express in his immortal play.

'Our sweetest songs are those' dreams Shelley 'that tell of saddest thought.' And *Romeo and Juliet* is one of the saddest thoughts that inspired sweetest songs. But now just imagine these heavenly songs and their spiritual harmony assuming shape.

TMU

Of all the Kings of Egypt,
Of all their ancient dead,
The mummies and the corpses
Like leather or brown bread,
(Of goddesses and ladies
Just now I do not sing,
They are, to put it courteously,
Quite another thing)
Of all their myriad men-folk,
Whose figures we have seen,
There's only one I wish to meet,
Corporeally, I mean;
One of whom is written,
Mysterious, yet so clear,
Words I have never seen elsewhere
Yet all one needs to hear:
I have come to earth, and taken
Possession with my two
Feet (Then comes a silence . . . .
And lastly:) I am TMU.

E. E. SPEIGHT.

Into the land of living light
They're calling me, O mother of mine,
And I must go; little mother, good-night,
A blessing on you, mother of mine,
A thousand, thousand blessings rest
On your brave heart, your heart so true ;
They're calling me, calling me out of my nest
Over the waters away from you,
Into the great world of the sun.'
He laid his head to her shoulder's ease
And gave one sigh, and he was gone
With the darling swallows over the seas.
And as night fell there rose the cry
Of a woman keening with no one by,
Lonely in that desolate place :
God's pity on her anguished face.

THE EAGLE

When I climbed the savage mountain
To watch an eagle in flight
I lost my way and there must stay
Wan guest of the drear night.

And the hours turned to years
In that fog-bound bivouac
With nothing nightlong to behold
But the hosting of the wrack.

But a mighty revelation
Was mine when night was done,
As I rose to greet the ascension
Of that eagle heart, the Sun.

EVENING IN IRELAND

THEY led him out. He spoke no word.
But in his heart this memory,
As he faced the firing squad unstirred,
Moved like an evening litany.
The swallows were flying in a flock
Into the southern world, and they
Were watching from a ferny rock
The dear birds as they flew away.
And as the dark wings crossed the wood
One pair returned, whose nest had been
Above their window, and whose brood,
Reared in safety, they had seen
Piping and peeping, growing fast
Through the earth's waking, till at last
From the cosy nest they all arise
And float along the sunbeam forth
Into the noontide. Happy pair
Bidding farewell to the trusty north
And the heralds of winter there.

Down they swoop to the little boy;
Over they turn, and close to ground
Sweep along in swiftest joy,
Rising with a passionate bound
To brush his cheek, then off again
With a wistful note of pain,
Off into the fading flock
Far beyond the ferny rock.
'Mother, they're calling me: he cried;
'Come with us over the lifting sea
And round the mountains far and wide
Into the South so far and free;

WHAT IS WRONG WITH THE WORLD

THE wrong with the world now is owing to the increase in human knowledge. The world is the same as it was a thousand years or a million years ago, but we, the workers of the world, are making it good or bad. Though knowledge is not a pernicious thing in itself, yet it is a cause of much unexpected development and tension. The increasing sense of individual authority and of nationality combined with economic competition are the chief causes of the unpeaceful state of the modern world. We find everywhere rebellion, opposition, resistance and revolution throughout the globe. What is the cause of all these things? I think it is the result of the production of a zeal which made the commonalty stranger. Lack of equality gives rise to all the troubles. Unequal distribution of wealth is the cause of all the present unstable condition of the world. Political consciousness is causing great havoc now-a-days. Life requires the complete fulfilment of our wants and a happy and joyful career. I think our ancestors were more happy and lived a merrier life than we are living now, and that was owing to their simplicity, pure-heartedness, unity and the love for the members of their community.

MD. FARID-UD-DIN KHAN,
IV YEAR,
Osmania University College.

THE HOTELS OF HYDERABAD

THOUGH, now-a-days there are many up-to-date and decent hotels in Hyderabad, I will lay emphasis only upon the old-fashioned and dirty hotels, for it will be more interesting, and it will concentrate our attention more.

When we go to this kind of hotel, we see in it a crowd of people, some chatting, some laughing, some singing and all of them doing whatever they like. Generally to these hotels go people who do not find amusement, or rather such cheap amusement elsewhere. Here they come and order a cup of tea, and a pan-ka-bida. Drink tea, eat the pan, and then settle there down for at least a couple of hours.

During this time innumerable subjects, political, theological, scientific, philosophical, historical, and others are come in discussion.

Some one says: 'I heard that the British Government has given back Berar to our Aalahazarath (the Nizam). Then another replies: 'O! yes, the other day I have seen it in the newspaper.' Then a third man emphasises the argument by saying: 'You people are saying things which are only given in the newspapers, or which are talked about by people, but I say that only a few days ago when I was "MYSELF" in Berar, I have seen with my eyes that Berar has come into our Sarkar's (the Nizam's) possession.' Now the problem is solved and acknowledged that Berar is in the Nizam's possession.

After that some other man says: 'I will tell you a more wonderful thing, and that is, our Government is going to make a cover of a rich cloth for the Charminar in order that such a grand building may not be injured by rain and sunlight. How liberal our Government is'! Then all of them begin to praise the Government for such a wonderful deed. And also go on saying: 'What a fortunate and bold man our Pasha (the Nizam) is that he got by force Berar into his possession again, even though the British Government is far superior in power'!

MD. ABDUL GHANI,
IV YEAR,
Osmania University College.

THE TREATMENT OF BEGGARS

THERE are many kinds of people in this world whose claims we ought to recognize, and among them are beggars, relatives, neighbours and friends.

Now each of them has a claim over us in proportion to his need. Beggars are the most pitiable persons, and therefore they need our help and sympathy the most. But it is a pity that in the present age beggars are looked down upon with the utmost contempt. They are humiliated in a manner that does not become a human being, the noblest creation of God.

Every religion enjoins upon its followers to be ever helping beggars and fulfilling their requirements. In one of the chapters of the Holy Quran also it is said 'Do not reject a questioner (beggar) even if he comes to your door, riding on a horse and ask of you something to eat.' In another place it is said 'Ye shall never attain unto righteousness, until he give in alms (to beggars) of that which he love (the most) and whatever ye give God knoweth it.'

This is the difference between how we should treat beggars and how we are really treating them.

ASGHAR ALI,
II YEAR,
Osmania University College.

SOME CLASS EXERCISES

AN INDIAN BIRD

EVERY country in the world is famous for some sort of bird or animal. For instance, Africa is famous for its lions, England for its pheasants, the Polar regions for their white bears, America for its jaguar (a kind of a leopard), Australia for its kangaroos, Arabia for its camels, Japan for its hawks and India is famous for its peacock.

It is one of the species of pheasants, and they call it the Indian pheasant. It is supposed to be the most beautiful of the game birds. Nobody would hesitate in saying that there is no prettier pheasant than the peacock. Its shiny green coat with blue spots is simply marvellous and shows off beautifully in the sunlight.

We should be proud to say, that our India, which is far behind other countries, can at least produce a bird which is far superior to any of its kind in the world.

The pea-hen is not so beautiful as the cock. It is an ordinary bird with a muddy brown colour. It does not dance as the cock does and has a very short tail.

The chief beauty of a peacock is when he is dancing. All of a sudden you will see him shake his feathers, and up goes his tail like a fan, and then he walks about, doing different steps, which have no regular rule like a fox trot or waltz.

M. M. ZAHIRUDDIN KHAN,
II YEAR,
Osmania University College.

it left no house in Maharashtra without mourning. Unimaginable calamities followed. Hopes of prosperity were but as dreams and what was bygone was bygone. Marathas received this news with the woeful screams of widows and despairing cries of mothers. It was a horrible and frightful phase through which the country was passing. Viswas Rao, the pride of the army and the boast of his country was no more on the battlefield. The disorder was chaotic. Flying to asylum appeared to be the aim of the soldiers. From the battlefield Khandu, with wounds upon his body, went to a neighbouring village, seeking a nursing hand in peril. Luck favoured him by leading him under the kind roof of an old woman, Roshanbi. Accidentally they were brought together but the treatment he received was motherly. In his dreams and drowsings the sweet remembrance of his wife came to his mind.

Days passed by without any kind of message to reconcile the heart of Ganga. She was utterly unaware of the safety of Khandu. She cried and cried at rest or at work. Without Khandu their home was a desert to her. Nobody ever knew what had happened to Khandu. But she saw him reaping and singing, not in the body but in the spirit. One day as she was cutting the corn the scythe wounded her finger in her forgetfulness. Tears came to her eyes as she thought that she was a prey to perils. But she did not know that it was a lull before a storm. A horseman came galloping near her and recognized her. Eyes saw eyes and heart knew heart. Jumping down from his horse he embraced her and begged her to forgive him ; and what he said to her meant exactly the same as when the poet sang—

> I could not love thee, dear, so much
> Loved I not honour more.

JANKIRAM PANT AHERWADKER,
B.A., LL.B. (Previous),
Osmania University College.

Poverty was a blessing for them because the significance of Life as Labour was known to them. They did what was right and abused no one, and this was but the purity of their hearts.

Those were the days of chivalry and those were the days of glory. Bloodshed and warfare were the order of the day and lawlessness and wretchedness rife. The Maratha power was at its zenith and the Mughal power at its end. The once grand and pompous Mughal suzerainty of India seemed to be passing into the hands of titular Marathas. The flag which first flew in the Western Ghats was now flying in the vicinity of the Himalayas. Yet it did not know that it was but vain boast. Ruin was hidden in the womb of the future. Viswas Rao was ambitious to seize the throne of Delhi. At last the battlefield of Panipat decided the fate of both parties. The drums were beating in the village, calling them to war. The whole country was roused to action. The people thought it their duty to enjoy life in the time of peace and to make every sacrifice in the hour of trial. One and all who were capable, made themselves ready to make use of the best opportunity. Khandu was not an exception to the rule. Ganga's love was a great obstacle in his way but he valued duty more than love. In love he was faithful but in duty he was most enthusiastic. Separation from Ganga was of course a heart-breaking trial but he was to undergo it also. The day came when they were to leave each other. Khandu parted from his wife with an embrace and tears in his eyes. But accidently a sign was made on his coat by the red mark of her head, and it became for him an object of reverence. It brought back the memory of those golden hours which he spent in the company of his beloved. The pangs were very severe but he started with fresh hopes and new assurance to make his name sound with glory in the annals of Hindustan. The whole Maratha country knew how to worship honour, and so joined in the national sacrifice.

The battle of Panipat proved disastrous to the Marathas. It was the turning-point of a movement which was to bring them to dust. The Maratha supremacy was at last threatened. Before the battle there was no power to rival them, but nothing was certain after the battle. So disastrous was this defeat that

THE BOAST OF CHIVALRY

THE day's labour was nearly finished. Khandu with a grass bundle upon his head was stepping through the field ways. His steady pace indicated the benignity of his mind. It seemed from his appearance that he was as noble as he was sincere. But the sweet murmuring noise with the consolation of his wife gave the place a distinct significance. Yet he was tired and threw the bundle down upon the river-sand.

The shadows of evening were falling. The village was a hive of crowded people. Some came from the fields and some were lingering behind. Cattle returned to their sheds and some were bellowing for a sight of their young ones. The lulling sounds of the bells gave pleasure to the passers-by. The small and ruinous temple attracted men and women for the evening worship. Glittering lamps covered by saris were carried to the temple by women to keep burning inside. Some of the busy housewives seemed to be taking round the *tulsi* plant and some children were calling lovingly to their sires who were late in returning. Ganga and Khandu came home and both were absorbed in their usual work.

They were residents of the same village. It was rumoured that they were the most happy couple of the village. Their marriage had taken place a few years ago. But unfortunately they had no child. This did not diminish the pleasure of the married life. They were as happy as they were contented with their lot. Was this not the key to happy life? This and this only was the way of their happiness!

Khandu was stout and strong as Ganga was fair and robust. He was a soldier by birth but a cultivator by profession, and she was a woman by birth and wife by profession. In the field of chivalry he was unsurpassed and in the field of romance she was unrivalled. They were thus what they ought to be. People of the village knew them and sang the praises of their happiness.

THE INDIAN CUCKOO

[*Koel*]

O JOYOUS messenger of Spring! To us
Thy little life is as a fountain of joy;
Thy beauty and thy music's harmony
Please all who hear and see.
Thy melody, thou enchantress, is divine,
Whose like we never heard from any mouth
Of mortal bird! Thou bringest hours of glee,
Enraptured days and murmurs of delight.
No sooner do I hear thy voice than I
Becôme uneasy, filled with eagerness
To glimpse thy face: I hasten out of doors.
Where art thou? I have wandered here and there,
Through wood and garden, taking every path
That might reveal thy presence.
But ever thou eludest me, conveying
From place to place thy message of high mirth.
Yet thine ownself knows naught of this good cheer;
Why art thou sad? What means this constant mourning?
O precious one, wilt thou not tell to me
The secret of thy sorrow and thy pathos?
I, too, know pain at heart; for thou, O cuckoo,
Art but a prisoner in the pitiless hands
Of the Goddess of Shadowy Grief.

SYED MOHAMMAD MOHSIN, B.A.

the plant and animal life in Africa and by means of such films the world may be seen on our screens. But such films are very rare, because it is difficult and costly to produce them and also because they do not afford 'amusement and pleasure' as much as do others. Films are now used for purposes of imparting education. But that is confined to those institutions whose business it is to do so. Were the productions of films entrusted in the hands of literary and educating institutions, they will do much good. There is still much to learn even in these films, if only one wants to learn it. But it is amusement we require. Well, one has to attend every film and show.

V. R. CHARI,
I YEAR,
Osmania University College.

have begun to like bowers, groves, and secluded places to go on with their courtings. They have thrown off the shackles of society and there should be 'freedom' in everything. *The Nurse*, an Imperial production, is the most immoral of the films and the *Girl-mad* turns the head of the youth. They say there is no sin in the worst of 'social evils'. Smoking, drinking, dancing and free indulgence in other kinds of immoral and wealthy pleasures are widespread. On our tables are to be seen glasses, and cigarettes, and lovely photographs of actors in several moods and dresses. Every one decorates and furnishes his room according to the latest 'fashion', so much so that their tastes and pleasures and their notions of these have undergone a thorough revolution.

The young sister of the cinema is photography including cinematography. Photographing their kith and kin and their friends, their pets and kids in several different moods and modes has become an 'Art', and a hobby. The rich have cinematography by means of which they keep 'living records of things.' They have their own home-cinemas. These are the tastes, hobbies that have made men recklessly extravagant, and careless, and hollow.

In India the film production has not reached the scientific perfection as in the West. Managing the shows with rotten and old machines and films in the unhealthy and ill-ventilated theatres have spoiled the health of the society. The atmosphere there is full of smoke; the glare on the screen and the quickness of the motions weaken the eyesight and cause heavy strain to the eyes and nerves.

On the whole it has driven virtue, simplicity and health out of society and brought in vice, show and ill-health. The cinema is thus doing more harm than the romantic and ill-printed and cheap fiction of least literary value that is produced by money-making authors and meant for pleasant reading. It may be admitted that there are several good productions that are valuable sources of knowledge: historical films which can do much good by depicting the lives of great men. I have seen *The Napoleon*, an American production which left a deep impression upon my mind; there was another film *Hunting in Africa* that represented

EFFECT OF THE CINEMA ON SOCIAL LIFE IN INDIA

THE Cinema is the most striking feature of this century. Some genius invented these movie-pictures and Mammon caught hold of them and adopted them for his purpose. At present the greatest film productions are in the hands of rich companies and the object of these companies is really to make money. Therefore they strive to make them popular not in the sense of producing such films that would be morally good but to draw large numbers to the shows.

To make them popular they produce plays that are attractive. Even our handbills that are distributed we can see '*Romance*', '*Thrill and adventure*', '*Makes one's blood boil*'. This tells clearly the tale and therefore the film-companies give occupation to those composers, producers, photographers and actors that can accomplish these ends.

It has become the fashion in these days regularly to attend shows. It is the most popular amusement, and cheap one also. The social films are the best advertisers of fashion! I have actually seen boys and girls adopting the latest fashion of wearing the hair as the cinema stars do and wearing the latest forms of dress. It has gone so far as that there is fashion in walking, laughing, talking and, in short, in every movement of a person. Some say 'look at his ugly dressing and snuff voice' (talkies have done this): 'Oh! wanting in manners.' 'He doesn't appear to be used to a reformed society.' 'He ought to have lived in the last century': such things are but common-place. It has brought elegance, design, delicacy and sweetness into the society. It has made us all butterflies.

These 'Love-films' wreak the moral of the society. The majority of the films are such. They have turned the young generation into a set of flirts. Dancing and balls have become very popular. These add to the pleasure the cinema gives. Men

till I have seen every tree and every flower of my garden. Wherever I go I hear the voice of Ram Din. The wind blows and draws his voice from the leaves. The flowers laugh but in them I see the form since of Ram Din. The birds are singing, but their song is like that which once I used to hear from the hut of Ram Din. It makes me lick with longing, and I say to myself :—

'Ram Din, what is the matter with you? How do you gain supremacy over nature? You were a gardener. Perhaps the dumb creatures of the garden have told you the secret of eternal life. That is why you are everywhere.'

HASAN ASGHAR,
IV YEAR,
Osmania University College.

RAM DIN: A STORY.

(*This story was published in Urdu in the* Hamjoli *of July 1930.*)

(1)

RAM DIN is my gardener. People say he is dead. But no, he is alive. How can I believe. When I hear him, when I see him, when my heart feels his presence.

(2)

At sunset when I sit by the side of the cistern in my garden I see some supernatural creatures flying round and round the fountain, till they diminish, till they mingle in drops of fountain spray. They are like Ram Din. It strikes me. I at once ask: Oh Ram Din, what is the matter? How the force of the fountain increases; How full the cistern is! A voice is heard—a very calm voice as if coming from some other world.

'It is the life of the fountain to keep the cistern full so that the plants may not wither—the Beauty of garden may not decline and its flowers, may scent the mind of those who pass through it; that the bees may come and get the honey from the garden.'

The voice disappears and I take my way to my bungalow. The full moon is scattering its splendour on my garden. It attracts on me and I throw myself on to the ground. I begin to see the moon. Now I am in some other world. I see some creatures flying round and round the moon. They are trying to cover the moon with their little wings. It seems as if they are trying to turn the whole light of the moon in my garden. I see them again and again. I recognise them. They are like Ram Din: What are you doing? A voice comes from heaven.

'In my life time, it was my ambition to snatch the moon from the sky and put it in my garden so that my whole garden may possess an everlasting light. The people of the world should have light in dark nights in my garden.'

(3)

It is my habit, that I get up early in the morning and come out from my house to take a walk in the garden. My heart is never satisfied till I walk on every lawn path,

has put its seal on a Federal Constitution for India. It has also gone to the extent of making federation a necessary pre-condition to the granting of further reforms to British India. On the whole the states really stand to gain by joining the federation. They can now take advantage of the situation and get certain financial wrongs adjusted. Secondly, by coming into closer contact with British India they are sure to improve themselves in an all-round way by, for the first time, breaking the wall of isolation behind which they have been getting on all these days. The rulers of the states are really afraid that this contact may infuse into their people ideas of popular government which may endanger their stability and prestige. But the princes may know that the feelings of the people cannot be suppressed for ever. It is therefore better for them to concede to the people what they seek for as an act of grace long before it will be snatched from them by compulsion. That has been the lesson of history. It is un-understandable how the princes stand to lose in a responsible government. True, they then cannot hope to give full and free exercise to their whims and fancies but they must know that they will then be the ideals of people loved and respected not for any favours expected or out of fear, but because the people feel that there is no dividing gulf between themselves and their ruler.

MIR MAKHDOOM ALI KHAN,

IV YEAR,

Osmania University College.

to even the least advanced provinces. They are being governed by an out-of-date kind of despotism and are very particular about guarding their ancient rights guaranteed by treaties with the East India Company and sanctioned by traditions. The existence of such political units adds a complexity to Indian federalism unknown to any other federal constitution in the world.

The Government of India themselves from the beginning had no definite ideas about the nature of the future constitution. They were treating the provinces always as if they were subordinate to themselves. They never prepared them to be independent states ready to join a federation. The Montague-Chelmsford reforms by establishing dyarchy gave to the provinces a certain amount of responsible government which is now known to be a sham. So that if the provinces join the All-India Federation they do it not as pre-existing independent states but as units which expect the new order of things to get that which they had not before, i.e., provincial autonomy. In no other federal constitution did such a thing take place since in all those cases the federating units had an independent existence. In the case of the Indian provinces they stand to gain now since they got what they want and they can effectively prevent the Central Government from taxing the provincial people for central financial purposes.

The Indian states present a peculiar problem. For one thing some of them are at present more independent than the provinces and therefore are better fitted to join the federation. But in point of political and other kind of progress they fall behind the provinces. They have also certain treaty rights with the British Crown, as they say, which they do not like to part with or transfer to the Indian Government. They also want that there should be certain financial adjustments in matters of revenue from customs, income-tax, salt, and railways etc. Thus the federating units have divergent objects to attain and are also on different levels of progress. On the top of all this, the smaller states which are innumerable but which are zealous of their rights, perhaps even more than the bigger states, fear that in an All-India Federation they will be swamped out of existence.

In spite of all these difficulties the Round Table Conference

union. Here unlike in a confederation membership when once entered into cannot be easily withdrawn. The constituent states at the time of becoming members of a federal union agree to part with certain powers which they were exercising before. These powers generally concern common matters of state in which for national interests uniformity should obtain like customs, commercial policy, railways, and currency etc. In these matters the federal government is to be supreme and unquestioned master, that is why all federal constitutions are written and rigid and the supreme federal court is always given the right to interpret constitutional laws and adjudicate in any constitutional points at issue between the federal Government and the constituent-states. Federation therefore offers an easy way out of the constitutional complexities that are likely to arise on account of the emergence of the country-state into modern politics. It saves and guards the sovereign rights of the part states and at the same time gives scope for the formation of a strong state with unified national policies in all-important departments of government.

It is now settled that India should have a federal type of constitution. Indeed this is a country where such a system of political arrangement alone can work. The country is so vast that it is often called a sub-continent. From this also arise other peculiarities like difference in climate, national character and culture. It is also a land where it is impossible to have a common medium of communication unless one is super-imposed. Thus federalism offers to us to bring out with the greatest effect the unity in diversity so that the latter does not act as a drag on the national aspirations of the people. It is also to be noted that in India as at present existing, there are the provincial governments and the Native states. The provinces are more advanced in the art of self-government. They are anxious that now they should get the fullest form of self-government and should be the equal and respective members of a Federal India. Some of the Native states are in point of political status more self-contained and independent as compared to the provinces. But in point of representative institutions and general advancement of the people's culture they cannot stand comparison, most of them, at any rate,

FEDERAL INDIA

FEDERATION is a system of state building and constitution making which came into existence recently in politics on account of the emergence of what may be called the country-state as opposed to the city-state of old. The ancient city-states of Greece were so small in extent and homogeneous in culture that a unitary type of constitution and direct democracy were possible. On rare occasions when their very existence was threatened the city-states of Greece used to form themselves into a confederation. A confederation thus is the coming together temporarily and for fixed purposes of a number of pre-existing independent states. It follows from this that there was no implicit or explicit obligation on the part of each state always to be a member of a confederation. It could withdraw whenever it liked.

In course of time the size of states began to grow. The development of the idea of nationality has made the state and its area co-equal with the extensiveness of the nation itself. Thus after the age of absolutism there grew up big nation states like Spain, France and Italy. However, after the American War of Independence a new complexity arose. The colonisation of America meant the occupation of a big area which on account of its very size stood in the way of a unitary type of government.

To this was added the other complexity that each state in the American republic represented a particular type of culture and religious belief. For some time these states in America continued as independent units but when they wanted to unite into a bigger whole they found that the size of the company and cultural differences as between two states stood in the way of an unitary type of constitution. It was to solve this that the American constitutionalists brought into existence a federal type of constitution which obtains in all the components of the British Empire.

A federation is thus a type of constitution where certain pre-existing sovereign-states are brought together into a permanent

pronounced in Shelley's poems. What Shelley describes is not a spiritual experience but the pursuit of the unattainable and ideal beauty or love. It is only a mystic that could wish 'the fierce spirit' of the West Wind to be his spirit and say, 'Be thou me, impetuous one' and could cry, as in the *Ode to a Skylark:*

> 'Teach us, sprite or bird
> What sweet thoughts are thine;
> I have never heard
> Praise of love or wine
> That panted forth a flood of rapture so divine.'

In his famous elegy *Adonais*, though the consolation he seeks is not spiritual or ıeligious as it is in Tennyson's *In Memoriam*, he undoubtedly shows himself to be a mystic when he cries out fervently

> 'The One remains, the many change and pass;
> Heaven's light for ever shines, Earth's shadows fly;
> Life, like a dome of many-coloured glass,
> Stains the white radiance of Eternity
> Until Death tramples it to fragments.'

It is this element of mysticism that produces a sort of indescribable spiritual charm though it shrouds the poem in the mist of vagueness. Hence it is when we read Shelley's poems we are often charmed by words which we understand not, inspired by ideas too subtle to be grasped. It is this elusive quality of Shelley's works that makes Matthew Arnold dissatisfied with Shelley, for he wants a high seriousness and sustaining force in poetry. But the want of these qualities in Shelley is more than made up for by his genius which can be summed up in the three words—Lyricism, Idealism or Etherealism, and Mysticism.

P. V. SUBBARAO, M.A., L.T.

condition, and then to sing the glory of the regenerated world. The permanent qualities of this unique drama, which reveal Shelley's genius, are the wonderful descriptions of nature it abounds in, and the idealisation of every one of these pictures. In the opening of the 2nd Act, where Asia describes the dawn, the variegated hues and shades of light, colour and darkness are depicted with a genius which is all Shelley's own. His etherealism or idealism imparts a peculiar charm and an unearthly tint to them unlike the descriptions of Keats who is ever content with and confined to earth. In the inimitable style of a critic it is Shelley 'pinnacled dim in the intense inane' that constitutes the greatest charm of his poetry.

The two extraordinary qualities of Shelley we have noted above, his sublime lyricism and lofty idealism lead to another aspect of his genius, namely his mysticism. There is no word in the English language which is more often misunderstood than the word 'mysticism.' Strictly speaking it denotes a belief in the reality of some spiritual experience in which the experiencer is conscious of the immediate presence of God and a direct communion with and absorption in Him. The experiencer may, at other times, be conscious of some spiritual ideal, which to him is as real as God and with which he wants to become one. The mystic experience is therefore untranslatable, inexpressible and incommunicable. Shelley is one of the very few English poets who are mystical in this sense of the term. This mysticism is more characteristic of the poets of the East than of the West. It is this feature which fascinates Shelley most to the Eastern mind and it is no wonder if it is found that Shelley has a greater number of admirers in the East than in the West. The element of mysticism pervades all the greatest works of the East like the *Ramayana* and the *Bhagavatam* when the poet is in a mood of spiritual exaltation which makes him one with God and the verses, which are the outcome of that spiritual communion, have an inexpressible charm about them. The mystical experience will have necessarily an atmosphere of vagueness and elusiveness about it. For the experience to be clearly grasped the reader must put himself in the place of the poet. Hence mystics say that 'to know is to become.' This element of mysticism is most

over the universe to quicken a new birth like withered leaves.' He concludes the poem addressing the fierce spirit of the West Wind :

> ' Be through my lips to the unawakened earth
> The trumpet of a prophecy! O Wind,
> If Winter comes, can Spring be far behind?'

His longer poems such as *The Revolt of Islam* and *Prometheus Unbound* are lyrical in tone. They are the embodiments of his idealism, his thirst for perfection, and his philosophy of life. As a critic beautifully remarks, in his longer poems there is ' a kind of elusive, yet, rapturous emanation of hope devoid of specific content.' To show that Shelley's genius is essentially lyrical, the most outstanding of his longer poems *Prometheus Unbound* may be considered. Though Shelley calls his composition *Prometheus Unbound* a drama, it cannot be considered one such in the strict sense of the term. It is not a drama, and moreover the genius of Shelley lies more in the direction of the lyric than of the drama. Rightly has it been called a ' Lyrical Drama.' It is not the psychological analysis of the characters, the delineation of human passions, the clash of character and character, or character and circumstance and the evolution of the plot that interest us, but the fantastic creations of Shelley's fancy, his philosophy of life instinct with the breath of poetry and his idealism. The theme of the drama is vague and amorphous, dealing, as it does, with the passions of gods and demigods and it attuned itself to the abstract and metaphysical imagination of Shelley. But it is thoroughly unsuited to dramatic treatment. There is no organic growth of plot, no cause and effect. The central event of the drama, namely the fall of Jupiter, is brought about miraculously. The characters, superhuman as they are, do not evoke human interest. They are only the symbolical expressions of his own theories. The torture of the Titan is the only part of the play which evokes real human interest. The glades and glens through which we travel, the voices of the spirits and the songs of the satyrs we hear, the ' mystic darkness ' we see—all these make the poem absurd as drama. But Shelley's idea is not to write a drama, as Shakespeare did, but to express the sense of the evil condition of the universe, a sudden and mysterious change in that

emotions. He is carried off his feet by his feelings and is filled with a divine madness. His lyrical genius appears at its very best in his Nature Lyrics such as *The Cloud*, *The Skylark* and the *Ode to the West Wind*. The most ethereal of poets, Shelley loves to write of heavens, of light and flowers. He does not illustrate the spiritual by the material, as poets often do, but makes Nature ghostly. He sees behind the cloud and rain a spirit. He writes a hymn to the Spirit of Nature. The skylark is to him a 'blithe spirit.' The stanzas wherein Shelley successively compares it to 'a poet hidden in the light of thought,' to 'a high-born maiden in a palace tower, soothing her love-laden soul in secret hour,' to 'a glow-worm golden in a dell of dew' and to 'a rose embowered in its own green leaves,' stand among the highest imagery of poetic art. We meet with the same feeling of disillusionment as is found in his other lyrics, bursting from the depths of his heart when he cries,

> 'We look before and after,
> And pine for what is not;
> Our sincerest laughter
> With some pain is fraught;
> Our sweetest songs are those
> that tell of saddest thought.'

Shelley's *Ode to a Skylark* remains unsurpassed among English lyrics for the liquidity and melody of its diction, the enchanting music of its verse, the exquisiteness of its glowing imagery and lastly for its indefinable lyrical charm. The poem defies analysis. It has to be read and enjoyed. A strain of pure poetry runs through it. It is remarkable to note that Shelley, in this short poem of 105 lines, fulfils the loftiest functions he has assigned to a poet and this single piece is enough to assure him a place of permanence in English Literature, should all his other poems perish. While the imagination of Shelley is at its white heat and untrammelled in the *Ode to a Skylark*, it is passive and restrained in his *Ode to the West Wind*. No doubt here also the mood of melancholy appears but the song ends in an unusually hopeful strain. Shelley feels animated by a divine mission and asks the West Wind to make him its 'lyre' and 'drive his dead thoughts

it, ' redeems from decay the visitations of the divinity in man.' It turns all things to loveliness; it exalts the beauty of that which is most beautiful and adds beauty to that which is most deformed. It reconciles all irreconcilable things such as exultation and horror, grief and pleasure, eternity and change. In short, Poetry transmutes all that it touches. Thus his conception of Poetry as a process of idealization is the loftiest in English Literature.

In considering the genius of Shelley it has to be noted that he is essentially a lyric poet. If the function of lyrical poetry is not merely to express one's own emotions and feelings on the surface, but to reveal, in pure terms of art, the hopes, joys, sorrows and the delirium of the inner life of man, Shelley is, doubtless, the greatest of English lyric poets. Before analysing his lyrical genius it may be noted that he was an idealist of idealists. The two absorbing ideals that animated his life were passion for freedom or regeneration of the world, and the passion for ideal beauty. His ideals are vague as all ideals are. All his poems, whether long or short, ring with one or other of these ideals. The success he attains in his shorter poems is remarkable. The vagueness and the unrealisable nature of his ideals of freedom and love produce a despondency and a bitterness of disillusion in Shelley. This dejection, this disappointment of the idealist fills his poetry with a strain of phantasy and a visionary dream-like quality. This mood of dejection is most clearly expressed in his poem *Dejection near Naples.* Nature is to him not a source of peace and comfort, as it is to Wordsworth. The bright skies and the blue skyey isles bring to him

> ' Nor peace within nor calm around,
> Nor that content, surpassing wealth,
> The sage in meditation found.'

The same note is struck in his other lyrics. Elsewhere the moon is represented to be a lady 'sick and pale' and as moaning 'for the world's wrong.' In the realm of love also Shelley is embittered with a disappointment which it brings to him. His prayer is ' Send the stars light, but not love to me.' Lyric poetry is the expression of the intense emotions of the poet and Shelley's muse is always under the stress and sway of his

THE GENIUS OF SHELLEY.

TO a poet and critic like Matthew Arnold for whom ' Romanticism is disease and Classicism is health ' and who is obsessed with his conception of Poetry as the Criticism of Life, Shelley is a ' beautiful and ineffectual angel beating within the void his luminous wings in vain.' But what Matthew Arnold considers his defect is the very essence of his genius. He is one of the very greatest of the lyric poets of England, the most ethereal of poets.

Before studying the aspects of his genius we shall do well to consider his conception of Poetry. His *Defence of Poesy* is a remarkable treatise on Poetry, embodying, as it does, his conceptions of Poetry and Poets. He believes, along with others, that Poetry is the expression of the imagination. He assigns to the poet the loftiest ideal and the lóftiest work. A poet, he says, participates in the Eternal, the Infinite and the One. A poem is the very image of life expressed in its eternal truth. Poetry, according to Shelley, is not mere composition. On the other hand, when composition begins, inspiration declines. Poetry is the record of the best and happiest moments of the happiest and best minds. His conception of Poetry is essentially mystic. The difference between a poet and an ordinary person, according to Shelley, lies in the fact that the former, being a spirit of the most refined organisation, is susceptible, while the latter is not, to those ' evanescent visitations of thought and feeling which arise unforeseen and depart unbidden but elevating and delightful beyond expression.' Such experiences, says Shelley, produce a state of mind in the person which is at war with every base desire, and it is with such experiences that the emotions of love, patriotism and friendship and the enthusiasm of virtue are essentially linked. Under the influence of such experiences and emotions, self appears as what it is, an atom in a universe. He assigns to the poet the noblest and sublimest function of making immortal all that is best and most beautiful in the world. Poetry, as Shelley would have

It also tried with success to a great extent to check the spread of so many ghastly diseases in various countries.

From all this, it will appear that the League has a very bright future. If it is successful in achieving her aims, peace would dwell everywhere. Wars will be stopped. For the sake of the settlement of international disputes, no one would resort to war but to some peaceful means.

Manly forces would take the place of the brutal ones. There would be no antagonism between the different countries and nations and all the world would be united together. It would get rid of the horrible consequences of war. People would look to progress and not to trample down others. Friendly relations would prevail between one country and the other and the world would thus be one.

P. G. KULKARNI,
B.A., LL.B. (PREVIOUS.)
Osmania University College.

The Secretariat consists of a Secretary General and such staff as is required. The Secretary is appointed by the Council with the approval of the Assembly and the staff by the Secretary and the Council. Every treaty or international agreement must be published by the Secretary, otherwise it is not valid.

The Permanent Court of Justice consists of eleven Judges and four Deputy Judges. It delivers opinions and judgments on all disputes regarding international law. But the only thing wanting is the sanction to enforce its decisions. It cannot compel the members to abide by its decisions. The League is defective in this respect.

The International Labour Organization works through its governing body, settling the agenda and conferences to which every State-member sends four delegates, and dealing with the matters affecting the workers.

Such is the Constitution of the League. The achievements of the League may be briefly surveyed here.

When the relations between Sweden and the Aaland Islands became very bitter, the League, at the appeal of Britain, settled the matter to the satisfaction of both the parties.

It settled the Italo-Greek dispute which arose at the murder of an Italian General in Greece quite satisfactorily.

It also settled Franco-British dispute regarding the people living in French territories whom Britain claimed to be her subjects. A friendly settlement was arrived at between them.

For the present, the League is striving hard to bring about a solution of the Manchurian problem. The present is a very critical time for the League. Upon it depends the success of the League. It has appointed a Commission for this purpose that has begun its work. It is hoped that the League will be successful here also.

Not only did the League prevent so many wars but it worked in other respects also.

In 1922 Austria was in a great trouble. Her economic condition was very bad. The League did much to enable her to balance her budget.

At the end of the War, President Wilson laid out his fourteen points. One of them was that 'a general association of nations must be formed for the purpose of affording mutual guarantees of political independence and territorial integrity to great and small states alike.' A Commission was appointed for this purpose. It presented its text to the Peace Conference of 1919 and the League came into being in 1920 with its headquarters at Geneva.

The aims of the League, as the preamble says, are 'to promote international co-operation and to achieve international peace by the acceptance of obligations; by the prescription of open, just and honourable relations between nations; by the firm understandings of international law as the actual rule of conduct among Governments; by the maintenance of justice and a scrupulous respect for all treaty obligations in the dealings of organized peoples with one another and not to resort to war in any case.'

The original members of the League were the Allied and Neutral States except Russia. Any self-governing State, dominion or colony could become member of the League if its admission was agreed to by two-thirds majority of the League. The original members were forty-two in number but some more were admitted afterwards.

The constitution of the League is as follows:

It consists of an Assembly, a Council, Secretariat General, a Permanent Court of Justice and an International Labour Organization.

The Assembly is the supreme body in the League. It is formed by representatives of all the member-States. Every nation has a single vote although it can send three representatives. The powers of the Assembly include the discussion of all matters affecting the League, the admission of new members and the approval of the appointment of the Secretary General. All decisions of the Assembly must be unanimons except those of very little importance.

The Council is a smaller body. It is competent to deal with all matters falling within the sphere of the League. To bring about plans for the reduction of arms and to take due steps in the case of declaration of war are the main functions of the Council.

THE LEAGUE OF NATIONS.

THE experience of the 19th century and of the Great War showed the world that peace was essential for its progress. It also showed the serious results caused by war. What is the use of killing men and wasting wealth over war—a thing quite unnecessary? Is it impossible to solve international problems without war? This sort of ideas led to the foundation of the League of Nations.

The League has its origin far back. During the mediæval and the early modern period, recourse was often had to the Pope as an arbiter between contending princes. The Pope was the religious leader and so the Kings were expected to abide by his decision.

The idea of international arbitration took practical shape in the 19th century when the people came to know and feel about the costliness of war, the dislocation that it causes not only to the industrial life of the belligerents but to that of all countries associated with them—a fact driven home by the growing interdependence of general financial and commercial operations throughout the world.

A further stage of development was reached in the attempt to constitute a permanent tribunal for settling international disputes. At last a successful plan was put into operation by a convention signed at The Hague by the Great Powers in connection with the Peace Conference of 1899, when a permanent court of arbitration was established.

Then came the Great War. It gave a serious blow to the whole world and made it known to all that wars were no more wanted. Fortunately the world-position immediately after the war was such as to help the idea of establishing peace everywhere. This general desire resulted in the formation of the League.

East . . . . She has brought a new note into the English verse of the day.' From this viewpoint the significance of Sarojini's poetry and her place in the Indo-Anglian poets is clearly shown.

Like all great men, she would leave behind her 'foot-prints in the sands of time.' Her 'lamp' would be of special value to those who

> ' Like plants or vines that never saw the sun,
> But dream of him where he may be,
> And do their best to climb and get to him.'

S. SHAH MOHAMMAD,
VI SCIENCE,
Osmania University College.

The services rendered by her to India are known to every one. It would be tiresome to enumerate all these here. Suffice it to say that she is in the front rank of leaders of Indian life and thought.

Along with her public services, reference should also be made to her amazing oratorical powers. She has always shone in public speeches. The charm of her orations lies in her imaginative flights, rhetorical outbursts and poetic phraseology no less than in her musical tone and amiable personality. She has been aptly called 'Bulbul-i-Hind' or 'The Nightingale of India.' Those who have heard her speak, would readily recognise the justification of that epithet.

We may now pass on to her poetry. But there is no attempt on our part to make here a critical survey of it. A few mere obvious points can only be touched here.

She was from her early childhood interested in art and poetry and used to 'manufacture' poems. They were all imitative and were written, as Sir Edmund Gosse says, in 'a falsely English vein.' Our thanks are also due to this eminent critic who bade her burn all this verse and advised her 'to be a genuine Indian poet of the Deccan.' The perusal of her poems will clearly reveal how the poetess has been true to this dictum. She once wrote to Sir Edmund: 'While I live, it will always be the supreme desire of my soul to write poetry—one poem, one line of enduring verse even.' In her childhood she even dreamt to be a Goethe or a Keats for India. But her active public life, while of great benefit to people at large, has not been without injury to her poetic faculty. Having read the three short volumes of her poetry, one feels sorry that she has not written more. Still these thin volumes contain much of the best poetry of our age. A critic in the *Review of Reviews* said of the *Golden Threshold*: 'Exquisitely musical collection of oriental lyrics and poems.' This is true of her other books also. The following criticism of M. Bronney clearly brings out the features of her poetry: 'Her verses are songs. They have the (authentic) lyric cry. But they have something more significant, something rarer. In the forms familiar to the West, she expresses something of the soul of the

SAROJINI NAIDU

THE modern history of India can show only a few great persons. One of these is Mrs. Sarojini Naidu, a bright star of Indian notability. She is great in the real sense of the word and will ever remain so in the annals of India. Her fame has almost travelled from pole to pole; her popularity increases day by day. The secret of this is to be found in her greatness as a leader no less than in her moral dignity. She appeared at a critical moment in our country and like

> ' A lady with the Lamp shall stand
> In the great history of the land.'

It will be interesting to know the 'lady' and try to understand 'the lamp' with which she points us the way to wisdom and happiness.

Sarojini Chattopadhya was born in 1879 in the city of Hyderabad. She received her early education at the Grammar School. Having distinguished herself there, she proceeded to England as a Government Scholar and had a good opportunity of cultivating her gifts of head and heart. After her return to Hyderabad, she was married to Dr. M. G. Naidu. But being a born poetess and politician, she was rather fitted to command people and guide their destinies than to be bound by petty affairs of domestic life. Hitherto, she devoted herself to poetry and politics—to quote her own words,

> 'To achieve my destined deed
> Of song and service for my country's need.'

Having plunged herself in politics, she has ever since remained the spirit incarnate of national India. How deep and sincere is her address to the spirit of Mother India!

> ' Waken, O Mother, thy children implore Thee,
> Who kneel in Thy presence to serve and adore Thee,
> The night is aflush with a dream of the morrow,
> Why still dost thou sleep in thy bondage of sorrow!'

the desert, the children of vast plains. They were utterly ignorant of the qualities of depth, moisture, clouds, fertile land and frontiers ; but after they had left their own country and applied their latent powers to poetry, logic, grammar, astronomy, and the construction of roads they showed the greatest possible aptitude for all these sciences and arts. Lastly the Turks, emerging from savage habitations, have attained the highest perfection in riding, hunting, husbandry, and the art of taking out expeditions and conquering foreign lands.'

HAROON KHAN SHERWANI.

search for the paradoxical always make him study peoples who had not then acquired a dominant station in the history of the world, and it is this which makes his work called *The Praise of the Turks* extremely interesting to us. This nation had hardly begun its onward march, and it is probably the first work in any language which talks about them in such detail and gives them so much importance. He is also interested in the respective qualities of the different races and deals with them whenever he can. Before we close we should like to give an extract from his work on the Turks in order to illustrate what we have just said.

'We must remember that every nation, every century, every generation and every race makes a mark in certain definite arts, for which the Divine Providence has especially endowed it and to which others cannot attain. Thus the Chinese excelled in handicraft, the ancient Greeks in philosophy and literature, the Persians of the Sassanian period in government, the Arabs in all that we are going shortly to describe, the Turks in war. We know that, generally speaking, the Greeks who were experts in investigating the causation of things were not skilled in commerce, arts and agriculture, on the other hand they did penetrating researches into the human mind to such an extent that they became the inventors of various instruments which were either useful in a physical sense or else satisfied the æsthetic sense of man, such as the balance, the astrolabe, time-keepers, flutes and organs; and processes pertaining to medicine, calculus, geometry, music, machines of war and other articles of the same category. In the same way the Chinese excelled as blacksmiths and goldsmiths, woodworkers, turners, weavers, embroiderers, and manufacturers of brilliant colours, in fact all that could be achieved by handwork whatever might be the quality of the raw material or its price. In a word, the Greeks speculated on theories and paid little attention to their application, while the Chinese paid more attention to practice and did not mind much about theories; the former were the *savants*, the latter handicraftsmen.

'Turning to the Arabs, we are afraid that in the beginning they were neither merchants nor artisans, nor physicians nor mathematicians, nor agriculturists, but were only the denizens of

book passes from one copyist to another in an altered form till it is full of erroneous and defective material.'

After this Jahiz takes up the picture he has just drawn up and makes certain pertinent remarks in order to moderate its rather exaggerated parts. He says that we should not conclude from this criticism (as certain contemporary Arabs did); that the poetical form is more solid than prose. This was the opinion of the Hindus at the time of Alberuni, for they chose to transfer all thin sciences to *Shloka*. As a matter of fact poetry has never been the vehicle of real scientific knowledge, for all that pertains to the sciences of instruments of business is found in prose works such as those of Euclid, Galienus, Almajest and others whose works were translated by Al-Hajaj. In spite of all the mistakes common to all translators, there remains in them a basis which is both sound and durable, and what is wanting is supplied by nature.

Jahiz then talks with great admiration about contemporary works and enumerates all the sciences and arts which writing had served to transmit. After this he discusses a number of scientific inventions which were due to mere chance.

Jahiz's chapters are a mixture of ideas which may perhaps be a little incoherent but are always full of facts and thought. I will not go so far as to affirm that all his chapters are equally rich, but what I can say without much fear of contradiction is that the reader can find something useful in every one of them. We will note certain passages which are worthy of interest to the student and which deserve more than a passing consideration. In his treatise entitled *The Circle and the Square*, the author puts a long series of questions on all kinds of subjects such as History, Mythology and Geology—in fact presents a real synopsis for an encyclopædia of the ninth century. Again in his book called the *Black and White* there is a summary of the history of the Zangis or the inhabitants of Zanzibar, which is full of the names of local heroes and their conquests, and of facts which were very little known in those days but which might be useful to a student of race psychology. Jahiz is very much interested in this kind of psychology and always comes back to it. His originality and

him and what he considers indispensable to be handed over to others; on the other hand what he should do is to use words and expressions of exactly the same meaning as that which was originally intended by the author of the book. Since when, we should ask, did Ibn-i-Patrik, Ibn-i-Na'ima, Abu Kurrah, Ibn-i-Fahr, Ibn-i-Vaheli, and Ibn-i-Mukffa become embodiments of Aristotle, and can we call Khalid another Plato? In a word, the expression of the translator has the same connection with the translation as his knowledge has to the subject matter.

'Moreover the translator should be conversant with the language of the original work as well as of the translation in such a manner that he should be equally at home in both. Now when we meet a person who talks two languages we clearly see that he corrupts both of them, and what really he does is to draw from the one while he is speaking the other.

'The more the subject is difficult, the fewer are those who know it, and the more are the mistakes committed by the translators. And there are but few translators whose knowledge corresponds exactly to the erudition of the original writer. We see this state of affairs recurring in the matter of books on geometry, astronomy, calculus and music, as also in the translation of books on religion, where the meaning ought to be exactly the same as the original. If a person well-versed in Greek transmits the meaning to another who is well-versed in Arabic, while the latter knows much less of Greek lore than the former, then naturally the sense transmitted is not comprehended by him, and in the same way a Greek writer who does not know as much Arabic cannot transmit the sense intended.

'Then comes the question of the difficulties of copying out the manuscripts, due first of all to mistake in the text and then to the copyists themselves adding to the number of mistakes already existing. We can never expect a paid copyist to correct the mistakes he finds in the text, especially when the writer himself has not taken the trouble of revising the manuscript. Then a manuscript once copied has the same value for a subsequent copyist what the original manuscript had to the first one; and thus the

that it only means that the Arabs knew nothing either of Greek poetry or of Persian poetry, and that the memory of the Persian tradition was preserved before Firdusi's time mostly in the form of prose. But there the question arises what was the cause of this ignorance? I am afraid I cannot answer it here, but leave it to those who take a larger interest in literary history. Jahiz who seems to have known well the sciences of the ancient Greeks, does not even suspect the existence of its poetry. 'The books of Aristotle and Plato, and later of Ptolemy and Hippocrates and so many others were preceded for centuries and contains what we may call the shadow of poetry. Just think of the surroundings of Zorarah, calculate the years which intervened between his death and the birth of the Prophet, and then you will find that the art of poetry dates back to nearly a century and a half, and the most two hundred years before the advent of Islam.'

Jahiz quite correctly continues to say as follows, 'The merit of this poetry cannot be really appreciated except by the Arabs and by those who are conversant with their language, for poetry cannot be translated and with the meter disappears all that made it beautiful and sonorous. It is nothing but prose, only inferior in quality to a translation the original of which was not poetry but prose itself.' And in this connection he makes some fine and judicious remarks on translators, their duties, the difficulties experienced by them in translating books, and even goes so far as to formulate a very pretty theory of the possible errors and of the criticism of the texts.

'All the nations, red and black, have the need of knowing the rules of religion and art, and to derive conclusions from their past and present experience. This is the reason why they have translated the books of the Hindus, and the wisdom of the Greeks and the literature of the Persians. Books of one nation have been translated by another nation, of people of one century by those of another century, of one language in another language and they finally come down to us. There are some who say that a translator can never exactly render the thought of an author with all the detail of his intention and the delicacies of his vocabulary, that he only keeps the essential part of what has been given to

'In the days of paganism people sent for a writer whenever they had to preserve the memory of an oath or offering, both on account of the importance of the event and for the purpose of commemorating it.' This is really found among all the nations of the world. 'All the nations love to preserve in some way or other their traditions and the meritorious deeds of their ancestors. The Arabs before the advent of Islam brought poetry to their service. It was poetry which consisted of Qasidas describing the deeds and importance of the heroes in the life of the nation. The Persians on the other hand preferred to commemorate their traditions in their monuments. Thus for example the White House at Istakhr built by Ardeshir, the monument at el-Mada'in, as well as a number of towns, fortresses, bridges, sepulchres and highways. This idea of erecting monuments was taken up by the Arabs as well. They left off writing poetry and built Gomdan, the castle of Moarab and of Shuoob, the Ablaq-el-Fard etc. The Persians never allowed any one except the nobles to build such monuments or to adopt names which were regarded as marks of nobility. In the same way special rules were made for tombs, baths, green domes and such other buildings.'

'But,' remarks Jahiz 'books are more lasting than brick and mortar, for it is the wont of the kings to efface the traces of their predecessors and to demolish the buildings erected by their enemies, and numerous towns have been razed to the ground with this object. This has been the end of the Persian and pre-Islamic Arab castles. 'Uthman demolished the dome of Gomdan and razed to the ground the forts of Medina; Zaid destroyed all the castles and all works belonging to Ibn-i-Amir, and our rulers have demolished the Syrian towns belonging to Marwan's descendants.'

Then Jahiz goes on to a subject which seems a bit curious at first sight and seems to show us the philosopher's ignorance after the exposition of so much learning. The author tells us that poetry is still in its infancy and that the first who attempted it are Imra-ul Qais, son of Hujr, and Mahazahel (Labeed) son of Rabee'a the famous authors of one of the *Moalakat.* Jahiz thus tries to make us believe that the poetry of all countries originated in the *Moalakat;* but when we pass the situation under review we feel

display only served to distract the mind from the ideals of humility.

In order to prove what we have just said, it is enough to point out that the books of the Zindiqs do not contain any information about rare objects, literary pieces of any merit, description of foreign philosophers or question pertaining to rationalistic theology, instruction in arts, construction of the implements of agriculture or war, and inter-sectarian discussions ; in fact that all that they do contain is about Light and Darkness, nuptials of the Satans, loves of Demons, the fables of Shakloon and owls and other ridiculous stories of the same category.

Then follow a number of questions, verses, conversations and anecdotes about book-lovers where we come across many charming details. Somebody asked a lover of art to show him the anthology of a certain author. This was bound in Koofa leathers, was wrapped up in two covers and was written by a superb caligraphist. When he was told that he had really wasted the money spent on the purchase and the upkeep of the book he replied, 'No Sir, science always gives back in direct proportion to what one spends on it, so if I could have only committed this work to memory and had given it in charge of my intelligence, in that case I would have wasted my efforts.'

From books Jahiz passes to inscriptions and philosophises about them. He enumerates some well-known inscriptions of his own time and gives them his mature thought.

'In olden days men inscribed on rocks by means of a chisel. These inscriptions were either sunk in or were in relief. They generally gave the date of an important event, preserved a treaty concluded between two important parties, commemorated a proclamation which was considered useful to the public or else perpetuated the memory of an illustrious personage. Such are the inscriptions on the dome of Gomdan, the gate at Qirwan and Samarkand, the column at Moarab, the basement of el'Mushaqqar on the Ablaq-el-Fard and the gate of Edessa. These inscriptions are found in well-known places on sides frequented by men and in such places as are comparatively strong and safe, in a word, on sites which are easily visible to the passers-by.'

tell you how many smaller works I have read which have not added a single iota to my knowledge.'

A little later Jahiz begins to talk of a certain Manichean sect called the Zindiq, and going into the question why they were such voracious readers, he passes on to the delicate problems of religious psychology and gives us an insight into his extraordinary erudition. 'Ebrahim-el-Sanadi told me one day that he emulated the taste of the Zindiqs for snow-white leaves, black-ink mixed with borax and beautiful writing, and that he never saw either paper or caligraphy like theirs. He remarked that if one was a lover of wealth and economy his expenses in purchasing books proved that he was fond of sciences as well, which again goes to prove the elevation of his character. Thereupon I replied as follows: "It seems to me that the money the Zindiqs spent on their books very much like the money which the Christians spend on their churches. If the books of the Zindiqs were the works on sciences and philosophy, of methods and demonstrations, or else where treatises which open out the gates of the Arts or the routes of Commerce to us, or consisted in the description of constitutions of societies, mathematical calculus, and different aspects of matter in which man busies himself, then only we would come to the conclusion that they are honouring the sciences. But it is only religious sentiment which makes them honour their own sect. The money they spend is like that of the Magians for their altars, of the Christians for their golden Crosses, of the Hindus for their sacred places and of the Buddhists for their images." '

If the Musalmans love the same sentiment, if they think that this display of splendour is conducive to piety and leads them towards a humbler way of life, then they would be able to do much more by means of their superfluous wealth than ever the Christians did by their resources. Once when I visited the great mosque of Damascus the Governor of Syria had adopted this method and we know that in those days few wanted to visit it. We also know that when Omar-ibni-Abdul Aziz came to the throne he covered the over-beautified parts and had the chains of the chandeliers re-annealed, because he thought this was more in agreement with Islamic spirit and that this kind of

Parasites, The Book of the Misers.[1] His greatest book *The Book of the Animals*[2] is a fairly large work and it contains not only a description of the animals but also a number of chapters which have nothing to do with the animal world but which contain personal ideas, literary thought, verses and anecdotes suggested to our author by the animal world. If one were to read this book as a scientific treatise on zoology one would be greatly disappointed; on the other hand if the book is read without any prejudice and without expecting any definite plan one would find a lot of sequence in it.

I do not think that we can evolve much of a philosophy or a school of thought from Jahiz; but we do not find in him is a tremendous amount of philosophic spirit and the most intense taste for intellectual life. If we open his *Treatise on Animals* we would be greatly surprised to find chapters in praise of books, history and literature and we would be much amused by the names of the earlier chapters and their mutual incoherence.

Oriental literature is full of passages on libraries and book-lovers, and instances of this may be found in el-Fakhri and in Yakut's stories.[3] Jahiz who preceded both these authors treats the subject at length and seems to take greater interest in it. He talks about the love of voluminous books (nowadays we prefer smaller ones!) and expresses the following opinion which testifies at least to his great zeal for literature. 'Ibn-i-Jehm says that when he began to like book from which he hoped to get some instructions, people saw him time after time turn over the leaves in the fear of finding that the subject-matter did not unfold itself, and the book, so to say, did not open its heart to him; while if the book was fairly large, if it had many pages and each page many lines, then he assured himself that he was bound to get enough compensation for his troubles and he was overjoyed.'

He again quotes Ibn-i-Jehm as follows: 'I have never read a large work without getting some benefit out of it, but I cannot

[1] *The Book of the Misers ;* Van Vloen Editions, Laiden, 1900.
[2] *Kitab-ul Haywan ;* edited by El-Haj Mohammad Effendi, 1325 A.H.
[3] Thus for instance, the description of a beautiful manuscript in the ' Thousand and One Days ' (Paris, 1844, to 183), Story of Hasan Bin Abdullah, or, the Keys of Destiny.

struck by paralysis which affected his right side to such an extent that it was necessary to massage it regularly with sandal and camphor. At the same time the left side was so much enervated and benumbed that it could be cut open by a pair of scissors without the body feeling it. Jahiz died in 255 A. H. (869 A. C.) at the ripe old age of over 90 years.

Musoodi quotes some very fine words from him which recalls the spirit of our own 18th century. When somebody came to see him in his old age he replied 'I suffer from a double ailment, one physical pain and secondly the burden of my debts; in a word, my illness consists of two maladies which counteract each other, of which one is sure to bear me to the grave; I am sure the more serious of those maladies is my seventy odd years.' He told his nephew that he had blamed a friend for having indulged in too many works of a charitable nature. He said to him 'my friend, you spend your forces, weary yourself and tire away your pony: it will be well if you moderate yourself', to which this man answered in the following beautiful words: 'Sir, neither the songs of the birds sitting on the top of the trees nor the voice of the beautiful singers singing to the accompaniment of lute, nothing to me is so charming as the delightful melody of some words of thanks uttered by those whom I have rendered some little service.'

Coming to his writings, we do not think there is an author more capricious than Jahiz, and whenever he touches any subject he sees in it an excuse for a large digression. He is always passing from one set of ideas to another but is ever full of spirit and liveliness, ever playful and ever interesting. He is a man of spirit even in his thoughts; his worst blunders are accompanied by poignant arguments which set off those blunders to a large extent, as can be illustrated by the way in which he has dealt with the question of the origin of Poetry.

The titles of his books are charming: *The Envious and the Envied*, *Superiority of Blacks over Whites*, *The Circle and the Square*[1], *Struggle of Spring with Autumn*, *The Book of the*

[1] Jahiz's eleven treatises, collected under the name of *Majmoo'ai Rasa'il*; Cairo, 1324 A.H.

ISLAMIC POLITICAL PHILOSOPHY

(*Continued from the 'Osmania Magazine', Vol. IV, No. 1.*)

3. JAHIZ.

AMONG the philosophers who do not follow any particular system and have a peculiar way of expression there is one who is very little known in the west, and that is Abu Uthman 'Amr Bin Bahr el-Jahiz.[1] Jahiz, who really belongs to a very old period of history, flourished as long ago as the ninth century A. C. He was a native of Basra, then a centre of intellect and thought, and of religious and philological studies. It was under the direction of Nazzām that he took part in the religious movement of the Motezilites, and later on himself became the head of a special school of thought which bears his name. The Motezilites are a sect of Muslim rationalistic theologians, or perhaps, free thinkers, not thereby meaning the unbelievers, but such philosophers as are prone to consider the religious problems that come before them according to their own particular method and do not follow the method adopted by some previous authority.

Jahiz was an extremely learned man and had a very lucid way of expressing his thought. He was ugly in his appearance and it is said when he was presented to Khalifa el-Mutawakkil and recommended to the tutorship of his children, this sovereign was so much shocked by his bad looks that instead of appointing him to the honoured post he gave him six thousand dirhems and requested him to go back home. His surname means 'one with a protruded pupil' which was one of the prominent features of his eye. After being dismissed by Mutawakkil, he continued to live at Basra, wrote a number of books and acquired a very great reputation. The story is told of a Bermicide, who while returning from a tour of the Indies and passing through Basra wanted to visit Jahiz, so that he might be able to tell his friends that he had seen this great *savant*. When he became old he was

[1] *Vide* Brocklemann : *Geschd. ar. Litteratur*, I, 152.

His other works are not widely read. Among his miscellaneous poems many are charming and are addressed to God invoking Him :—

'भात्रेंवीण भक्ति भक्ति वीण मुक्ति । बळेंवीण शक्ती बोलूं नये ॥
सायास करिसी प्रपंच दिननिशीं । हरिसी न भजसी कोण्या गुणें ॥
ज्ञानदेव म्हणे हरी जप करणें । तुटेल धरणें प्रपंचाचें' ॥

' Bhakti without belief, and salvation without Bhakti are mere will-o'-the-wisp. Get God pleased and rest quietly. Why do not you think of Him? But on the other hand are wasting your energy in this worldly life. Dnanadeo says, ' If you take even the name of God you will be freed from this snare of the world.'

He died in the year 1218 S. at the age of twenty-one. His last six years were spent in pilgrimage, from which we can conclude that he finished *Dnaneshwari* in 1212 S. in his fifteenth year. In English literature we find that Keats died very young, at the age of twenty-six. No poet has the honour of achieving such long enduring fame at such an early age, exceeding in both quantity and quality. All who came after him are indebted to him in some way or other, either for language or for thoughts. Secondly, he was the founder of the Bhakti movement in Maharastra which is the prevailing factor lasting to our day. His name is on the lips of all Maharastrians from the young to the old and from the rustics to the learned.

All his followers, down to Moropant, another great poet of the century, have paid tributes to him. This shows the great influence of the poet's work on posterity.

R. Y. MAHAJAN,
IV YEAR,
Osmania University College.

Dnaneshwari commands our admiration for three main reasons. We find in it the combination of matter and manner. Philosophic ideas are expressed in homely words in a charming and sweet language and it is held sacred by all of us for its teachings. Those who are of opinion that poetry and science have their different territories and knowledge, poetic genius and imagination cannot go together should study this book. A critic has observed that, 'he has created a new world profoundly rich in thought and diction which when borrowed or stolen would not come to an end.' Thus he is among the few Marathi poets who had brilliant success. To take Marathi quotations here in support of this statement from other eminent writers would be unnecessarily lengthening the subject.

But as a general rule every good thing has its own defects. Here sometimes we find repetitions of the same thoughts. At certain places the subject is stretched unnecessarily and the poet himself was aware of this. But in its support he makes very pertinent remarks :—

'आणि घांसा आंतील हरळु । फेडितां लागे वेळु ।
तें दूषण नव्हे खडळु । सांडावा कीं ॥
कां संवचोरां चुकवितां । दिवस लागलिया माता ।
कोपावें कीं जींविता । जिताणें कीजे ॥
परि यावरिल हें नव्हे ॥ तुम्ही उपहासिलें हेंचि बरवें ।
आतां अवधारिजो देवें । बोलिलें ऐसें' ॥

'While taking his meal, a man gets a particle of sand in a mouthful, then he should stop at once and take it off. Will it be considered a fault that he requires more time to finish his meal for this reason? Or will a mother get angry with her son when he is late in escaping a scoundrel on his way? In the same way though my speech is very lengthy, but it was unavoidable and therefore pardonable.'

are of opinion that Bhakti came into being when the Hindus came in contact with the Mohammedans. But from the quotation given above we have sufficient reason to think it otherwise.

Man is expected to perform his worldly duties and then in the intervening time concentrate his thoughts upon God. But how to do these intermingled duties? He makes it clear by citing an example.

'Once there was a poor man passing his life wretchedly; but after some years a spirit conferred his favours upon him. He promised the man that he would do anything for him, provided that he would always keep him engaged in some kind of work, otherwise he would devour him. The man as he was poor, accepted his terms, because he thought that he had sufficient work for him. Then he asked the spirit to provide him with such things as he lacked, to lead a happy life. But the spirit brought all these things one after the other in a short time. Whatever did he tell him the spirit would do it in a moment. The poor man began to be afraid of him. He then ordered him to bring one of his relatives from a great distance. As the spirit went away the poor man went to his neighbour and related him the story saying that he had no work left for the spirit. He requested him to save him from the spirit. When the spirit returned after performing his work he asked him for another piece of work. Then the man ordered him to obey his neighbour, who in his turn asked him to bring a long bamboo and to fix it half into the ground. The spirit with his miraculous power did it in the twinkling of an eye. Then he ordered him to go on climbing to the top and descending to the bottom when he is not wanted for any other work. And thus the poor man was saved.'

What can we infer from this? As the spirit had only one work of climbing and descending and had to think of that pole alone, in the same way a man should think of God. But as at times he had to obey the command of the poor man so also a man should perform his worldly duties. This we can gather from the story, leaving aside the spirit and his acquaintance with man. Thus he had shown his imagination wherever possible.

Dnaneshwar loved his religion and strictly followed it. Though he did not preach it from a pulpit that the caste-system should be abolished yet, as the quinine pill, when sugar-coated is swallowed up without any disgust, he has put his views before us under cover. A stern preceptor orders us to do a thing though it is against our will. We may carry out his orders, but with an unwilling heart. On the other hand a poet, like a gentle mother, takes the same work from us asking us in a loving tone. His poetry has done the work of the second kind. He says :—

'ऐसा अवधाच्चि परो पांडवा । जोहीं आपुलिया सर्वभावा ।
जियावयालागीं बोलावा । मीचि केला ॥
ते पापयोनिही होतु कां । ते श्रुताधीतहि न होतु कां ।
परि मजसी तुक्तिां तुकां । तुटी नाहीं ॥
राजाज्ञेचीं अक्षरें आहाती । तियें चामा एका जया पडती ।
तया चामासाठीं जोडती । सकळ वस्तु ॥
कां खैर चंदन काष्ठें । हे विवंचना तंवचि घटे ।
जंव न घापती एकवटें । अग्नीमाजीं ॥
तैसें क्षत्री वैश्य स्त्रिया । कां शूद्र अंत्यजादि इया ।
जाती तंवचि वेगळालिया । जंव न पावती मातें' ॥

'Those who think God as their sole support of life, they may not descend from noble families and may not possess sound knowledge of the Vedas, are in no way inferior to me. The skin is a worthless thing but when it gets the royal stamp, it surpasses all other things in value. Family, caste or creed are no hindrances if a man becomes one with me. And when he attains this state his previous connections are not reckoned. As the distinction between timber, sandal and others remains so far as they are not placed on fire, in the same way Kshatriya, Vaishya and Sudra have their separate existence till they do not reach God.'

Now let us see what we can gather from these thoughts of his which found their expression here. As we said before Dnaneshwar lived and finished his career as a poet long before the Mohammedans invaded the Deccan. This Bhakti (भक्ति) movement in Maharastra had its origin long before his time. Some

their attempt they come across temporary happiness and rest themselves contented in its enjoyment without reaching Him.

'पाहे पा दूध पवित्र आणि गोड । पासीं त्वचेच्चिया पदराआड ।
परि तें अव्हेरूनि गोचिड । अशुद्ध काय नेघती ॥
कां कमळकंदा आणि दुर्दुरीं । नांदणूक एकेचि घरीं ।
परि परागु सेविजे भ्रमरीं । जवळिला चिखलुचि उरे' ॥

'A small tick, living near the dug of a cow, feels happy by sucking blood from the place, without an idea that there is sweet milk inside there, or a frog, which makes its home near the stem of a lotus flower in mud, does not derive any pleasure from its sweet scent, but is contented to remain in mud and the bees coming from different directions enjoy that scent. In the same manner though I am in your heart you cannot see me.'

This world is full of pleasures and miseries but a man, who is a man in the real sense of the term, neither becomes glad while enjoying pleasures nor is affected when plunged in grief. Friends and enemies, honour and insult are alike to him. He makes no distinction in them. He says :—

'कां घरिच्चियां उजियेडु करावा । पारखियां आंधारु पाडावा ।
हें नेणेंचि गा पांडवा । दीपु जैसा ।
जो खांडावया घावो घाली । कां लावणी जेणें केली
दोघां एकचि साउली । वृक्षु दे जैसा ॥
नातरी इक्षुदंडु । पाळितया गोडु ।
गाळी तया कडू । नोहेचि जेवीं' ।

'As the lamp does not know that it should lighten the master's house and leave in darkness the neighbour or as a tree distributes the same shade both to the man who planted it and the one who axe in hand is ready to cut it down, or as the sugarcane makes no distinction between the farmer who grows it by watering and one who takes its life essence out of it by putting it into a crusher, but gives the same sweetness to them, in the same way a man should receive good and bad alike without in any way being perturbed in the mind.'

till the meaning is perfectly clear. These reveal his close observation and keen insight.

'कृपण चित्तवृत्ति जैसी । रोंवोनि घाली ठेवयापासीं ।
मग नुसधेनि देहेंसिं । आपण असे ॥
कां अजात पक्षिया जवळा । जीव बैसवूनि अग्निसाळां ।
पक्षिणी अंतराळां । माजीं जाय ॥
नाना गाय चरे डोंगरीं । परि चित्त बांधिलें वत्सें घरीं ।
तैसें प्रेम येथिंचें करीं । स्थानपती' ॥

'As a miser's heart often dwells upon the wealth that he has kept underground, though his body performs its duties or—as a female bird always thinks of its young ones in the nest though taking a high flight in the sky or—though the cow is grazing in the field her mind is wholly taken up by the thought of her calf at home, in the same way, oh, man, you should always think of nothing but of me,' says Lord Krishna.

He says that human being is bound to perform the duties which are laid upon him. But whatever he does he should do it irrespective of consequences. This he expresses in a beautiful way :—

'पिपंरु वांचिया आशा । न शिंपिजे पिपंळ जैसा ।
तैसिया फळ निराशा । कीजती कर्मे ॥
सांडूनि दुधाची टकळी । गोंवारी गांवधेनु वेंटाळी ।
किंबहुना कर्मफळीं । तैसें कीजे' ॥

'As the pepul tree is not watered in the hope of its fruit, or as a cowherd keeps the cattle of the village and looks after them without an idea of having milk from them, in the same way work should be done without the least hope of reaping its fruit.'

He says that God's abode is nowhere but our heart. Men try to find Him out and go on seeking outside themselves. In

patiently go through his work he will learn from his many extracts, that he was not proud of his power.

'नातरी बालक बोबडा बोले। कां वांकुडा विचुका पाउलीं।
तें चोज करूनि माउली। रिझे जेवीं ॥
तेवी तुम्हा संतांचा पढियाये। कैसेनितरी आम्हावरी हो।
या बहुवा आळकिया जो आहो। सरंगी करित ॥
अहो पुंसा आपणचि पढविजे। मग पढे तरी माना तुकिजे।
कां करवलेनि चोजें न रिझे। माय जेवी ॥
तेवीं प्रभु मी जेंजें बोलें। तें प्रभु तुमचेंचि शिकविलें।
म्हणोनि अवधारिजो आपुलें। आपण देवा ' ॥

' A child utters unintelligible words and walks with faltering steps but takes pleasure in them. With that love you should accept this. We teach a parrot a few words and when it reproduces them we feel glad, or does not the mother become happy when she finds that her son has obeyed her command? In the same manner, oh, wise men, whatever I present before you, is nothing but your own teaching. So listen to your own words. I am only an intermediary.' How very modest!

As his was the first trial in Marathi, nearly in every chapter he assures his readers that this language is capable of expressing philosophic ideas.

'मूळ ग्रंथीचिया संस्कृता। वरि मऱ्हाटी नीट पढतां।
अभिप्राय मानलिया उचिता। कवण भूमि हें न चोजवे ' ॥

' If this Marathi commentary will be read carefully after having gone through the original Sanskrit book (the *Bhagawadgita*), it will be difficult for the reader to form a correct estimate to decide which is the best.

In order to render the subject easy and simple he employs a simile, but if any doubt still exists he gives another and another

his mother tongue. He had to face the severe opposition from his contemporaries. Though he was the first poet in Marathi yet he came out successfully and his eminent work is widely read to this day.

The Marathi poetry then flowed through a different channel. It was not the time to address insignificant things like 'A Mouse' or 'A Leaky Pot.' The poetic field of that day was very narrow. The definition of poetry of his and his predecessor's age ran thus:—

'अलवण हरीवीण कविता' (वामन)

meaning thereby 'poetry not describing and containing the name of God is like a pudding without salt.' He not only adopted Marathi as his medium but also left aside all the meters which were in vogue in Sanskrit poets and used a new meter quite congenial to Marathi atmosphere, a meter which, no doubt, reached its perfection in his own hands. A certain influential poet acknowledges that the palm, in this meter, belonged to none but to him. He says:—

'सुश्लोक वामनाचा अभंगवाणी प्रसिद्ध तुकयाची ।
ओवी ज्ञानेशाची किंवा आर्या मयूरपंताची' ॥

Herein he enumerates different leading Marathi meters and the poets who had honour to bring them to perfection. . . . . . . 'owi' belonging to our hero.

This book is in eighteen chapters containing nine thousand couplets. He has imagined himself as seated in an assembly of the learned, preaching the essence and teachings of the *Bhagawad-gita.* The ninth and the eleventh chapters are extremely beautiful. He was conscious of his poetical genius and of the mastery of language. He writes:—

'माझा मऱ्हाटाचि बोल कौतुकें । परी अमृतातेंही पैजेसी जिंके ।
ऐसीं अक्षरेंचि रसिकें । मेळवीन' ॥

'Though my expressions are in Marathi yet I shall make the learned say that these words are sweeter than nectar.'

At the first glance one is tempted to think that there is sufficient reason to accuse the poet of his boast. But if he would